تحقیق و تنقید کی روشنی میں ملفوظاتِ خواجگانِ چشت کا مطالعہ

آئینۂ ملفوظات

فوائد السالکین، اسرار الاولیاء، راحت القلوب

تصنیف

علامہ اخلاق حسین دہلوی

ناشر

کتب خانہ انجمن ترقی اردو جامع مسجد دہلی ۶

بارِ اوّل

۱۴۰۳ھ ——— مئی ۱۹۸۳ء

کتابت : ——— محمد ذکیر الدین ذکی

طباعت : ——— فوٹو لیتھو ورکس

صفحات : ——— ۲۸۰

قیمت : ———

ملنے کے پتے

۱۔ کتب خانہ انجمن ترقی اردو جامع مسجد اردو بازار دہلی ۱۱۰۰۰۶

۲۔ فضل برادرز، مرکزی کتاب گھر بستی نظام الدین اولیا، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

پندرہویں صدی ہجری کا گرانقدر

تحفہ

خواجگان چشتؒ اہل بہشت کے ملفوظات کو وجود میں آئے صدیاں بیت گئیں، تاہم اتنی تحقیق سے اتنی جامعیت و وسعت معلومات سے اور اتنے شگفتہ اور دلپذیر اسلوب میں آج تک کسی نے داد تحقیق نہیں دی ہے، یہ پندرہویں صدی ہجری کا گرانقدر تحفہ ہے جو پہلی بار ہدیۂ ناظرین کیا جا رہا ہے۔

یہ تاریخی و تحقیقی۔ تنقیدی وادبی اور روحانی قدروں کا آئینہ ہے جو اردو ادب میں گراں قدر اضافہ ہے۔ اردو ادب کا دامن اب تک اس سے خالی تھا۔

کتب خانہ انجمن ترقی اردو دہلی ۔ فخر و مباہات کے ساتھ اس مجموعۂ مضامین کو پیش کر رہا ہے اور مقبولیت کے لیے بارگاہ رب العالمین میں دست بدعا ہے۔

نیاز مند

(الحاج) نیاز الدین مالک کتب خانہ

انجمن ترقی اردو، اردو بازار جامع مسجد

دہلی ۱۱۰۰۰۶

فہرست مضامین

پندرہویں صدی کا گراں قدر تحفہ

تقریب ۸

مکتوب ۲۲

مطالعہ ملفوظات کے مبادیات ۲۸

تمہید ۲۸
۱۔ ملفوظات کیا ہیں؟ ۲۸
۲۔ ملفوظات کی اہمیت ۲۸
۳۔ ملفوظ و ملفوظات ۳۴
۴۔ کتب ملفوظات کی تدوین ۳۵
۵۔ تقریر و تحریر ۳۷
۶۔ فوائد الفواد کا کمال ۴۰
۷۔ جعلی کتابیں ۴۴
۸۔ اختلاف نسخ ۴۴
۹۔ تاریخی خلفشار ۴۷
۱۰۔ نقد و تنقید ۴۸
۱۱۔ عادت الٰہیہ ۴۹

۱۲- اخذ و اقتباس	۵۰
۱۳- بیان واقعہ	۵۱
۱۴- اساطیر الاولین	۵۱
۱۵- اسرائیلیات	۵۲
۱۶- یوسف زلیخا	۵۳
۱۷- علم مجلسی سے آگاہی	۵۸
۱۸- اعزازی کلمات	۶۴
۱۹- خوارق عادات	۶۶
۲۰- عجائب الاسفار	۷۰
۲۱- کتابیات	۷۱
۲۲- تاریخی قدریں	۷۲
۲۳- ملفوظات کی مقبولیت	۷۳
۲۴- والد مرحوم کا معمول	۷۵
۲۵- تصنیف و تالیف	۷۷
۲۶- جامع ملفوظات۔	۷۷
۲۷- نوشتہ کا اطلاق	۷۹
۲۸- خیر المجالس کے بیانات	۸۰
۲۹- جعلی کے واہمہ کو ذہن نشین کرانا۔	۸۷
۳۰- تراجم کی کیفیت	۹۰
۳۱- وقت کا تقاضہ	۹۴

فوائد السالکین کا مطالعہ

۱۔ ادارۂ معارف کا اظہار خیال	۹۶
۲۔ تعارف	۹۶
۳۔ فوائد السالکین کی قدامت	۹۹
۴۔ تاریخی اندراجات	۱۰۱
۵۔ سیر الاولیاء کی الحاقی عبارت	۱۰۳
۶۔ الحاقی عبارت کے خلاف شواہد	۱۰۵
۷۔ حضرت بابا صاحب کی ولادت وفات کے صحیح اور اہم سنین کا نقشہ	۱۰۷
۸۔ فوائد السالکین کا عہد تدوین	۱۰۹
۹۔ مافوق الفطرت عناصر	۱۱۰
۱۰۔ اسلوب بیان	۱۱۲
۱۱۔ نفس مضمون	۱۱۴
۱۲۔ اہم روایتیں ا تا ۷	۱۱۸
۱۳۔ وقت کا تقاضا	۱۳۸
۱۴۔ فوائد السالکین کے قدیم قلمی نسخے	۱۳۹

اسرار الاولیاء کا مطالعہ

۱۔ تعارف	۱۴۱
۲۔ اسرار الاولیاء کی قدامت	۱۴۱
۳۔ جوامع الکلم کا بیان	۱۴۴
۴۔ تاریخی اندراج	۱۴۹
۵۔ داخلی شواہد	۱۵۱

۶ - اسرار الاولیاء کا عہد تدوین ۱۵۳
۷ - امتیازی خصوصیات ۱۵۴
۸ - استفسار و مکالمہ ۱۵۴
۹ - فصول
۱۰ - عربی فارسی ہندی مرکبات ۱۵۵
۱۱ - تبلیغی کارنامہ ۱۵۵
۱۲ - استاد محترم ۱۵۷
۱۳ - اسرار الاولیاء کی ضخامت ۱۵۷
۱۴ - کتابوں کے حوالے ۱۵۹
۱۵ - اسفار و مشاہدات ۱۶۰
۱۶ - تاریخی وقائع ۱۶۲
۱۷ - داخلی کیفیات ۱۶۲
۱۸ - اسلوب بیان ۱۶۴
۱۹ - نفس مضمون ۱۶۵
۲۰ - بعض اہم ترین روایتیں ۱ تا ۱۴ ۱۷۲
۲۱ - احادیث کی تدوین ۲۰۴
۲۲ - فصول کا اختتامیہ ۲۰۶
۲۳ - کتابت کی غلطیاں ۲۰۸
۲۴ - تحریف (واقعہ جنگ غولان بیابانی) ۲۱۱
۲۵ - وقت کا تقاضا ۲۱۲
۲۶ - اسرار الاولیاء کے قدیم قلمی نسخے ۲۱۳

راحت القلوب کا مطالعہ

۱۔ تمہید ۲۱۵
۲۔ استناد و قرامات ۲۱۵
۳۔ جعلی کا وسوسہ ۲۲۲
۴۔ تاریخی اندراجات ۲۲۳
۵۔ تاریخی اندراجات کا نقشہ ۲۲۴
۶۔ تاریخی اندراجات کا جائزہ ۲۲۶
۷۔ بیعت و ارادت سے متعلق صحیح بیانات ۲۳۱
۸۔ حضرت محبوب الٰہیؒ کی سوانح حیات سے متعلق اہم سنین کا نقشہ ۲۳۶
۹۔ راحت القلوب کا عہد تدوین ۲۳۶
۱۰۔ تذکروں میں سنین
۱۱۔ تحقیقی کارنامہ ۲۳۷
۱۲۔ نقل روایت ۲۳۷
۱۳۔ سیاحت ۲۳۸
۱۴۔ خرق عادات و کرامات ۲۴۰
۱۵۔ حوالہ جات ۲۴۱
۱۶۔ ادعیۂ ماثورہ ۲۴۱
۱۷۔ اسلوب بیان ۲۴۲
۱۹۔ اہم ترین روایات (۱ تا ۱۴) ۲۴۷
۱۸۔ نفس مضمون ۲۴۳
۲۰۔ راحت القلوب کے قدیم قلمی نسخے ۲۸۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقریب

اگر گیتی سراپا باد گیرد چراغِ چشتیاں ہرگز نمیرد

برصغیر ہند و پاک کے اولیائے چشت رحمہم اللہ تعالیٰ کے ملفوظات کی مروجہ کتابوں کے خلاف میرے علم میں سب سے پہلے پروفیسر محمد حبیب مرحوم نے لکھا جو زیر عنوان عہد سلطنت میں چشتی صوفیہ کا قلمی ذخیرہ مڈیول آف انڈیا کوارٹرلی علی گڑھ اکتوبر ۱۹۵۰ء (انگریزی) میں شائع ہوا۔ اس میں یہ انکشاف جدید فرمایا کہ کتب ملفوظات میں انیس الارواح، دلیل العارفین فوائد السالکین، اسرار الاولیاء، راحت القلوب، افضل الفوائد اور مفتاح العاشقین جعلی کتابیں ہیں۔ البتہ فوائد الفواد، خیر المجالس کو اور سیر الاولیاء، سیر العارفین اور اخبار الاخیار کو معتبر قرار دیا ہے۔

پروفیسر محمد حبیب مرحوم بلاشبہ فن تاریخ میں مانے ہوئے استاد تھے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ملفوظات کے باب میں بھی کیا ان کا وہی مقام تھا جو تاریخ میں تھا آج رشحاتِ قلم سے تو اثبات میں اس کی تائید نہیں ہوتی۔ [1]

ہند و پاک کے اکابر اولیاء اللہ کے ملفوظات ہماری تہذیب روحانیت کا گراں قدر سرمایہ ہے ان کا فقدان ناقابل تلافی نقصان ہے۔ چنانچہ سید والا تبار

---

[1] اس سے متعلق معدودے چند امثلہ کا ذکر مناسب تھا لہٰذا تقریب کے بعد انھیں جگہ دے دی ہے۔

سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب (رفیق دار المصنفین اعظم گڑھ) نے حمیت قومی اور بصیرتِ باطنی سے قلم اٹھایا اور اس خوبی سے دادِ تحقیق دی کہ حقیقت حال آئینہ ہوگئی[1] اور توہمات کی جڑ کٹ گئی۔ لیکن اس کے باوجود ہند و پاک کے بعض اہل قلم "کُلُّ جَدِیْدٍ لَذِیْذٌ" کی مصداق لطف اندوز ہوتے اور غلط روش کو اپناتے رہے۔ ان میں سب سے زیادہ "اغلاط کثیرہ" کا مرقع وہ مضامین ہیں جو منادی دہلی بابا فرید نمبر ۱۹۷۴ء کے اوراق کی زینت ہیں جو سطحی اور ناقابلِ التفات ہیں۔[2]

سوانح حضرت بابا فرید مسعود گنج شکر قدس اللہ سرہ العزیز کی تسوید کے دوران راقم حروف کو یہ معلومات فراہم کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی کہ ہند و پاک کے اکابر خواجگانِ چشتؒ کے ملفوظات کے قدیم قلمی نسخے کہاں کہاں محفوظ ہیں اور کتنے کتنے پرانے ہیں لہٰذا میں نے اس مقصد سے علمی اداروں کو اور معروف لائبریریوں کو خط لکھے اور معلومات حاصل کی۔ میں ان احباب کا ممنون ہوں جنھوں نے معلومات فراہم کر کے مجھے متشکر فرمایا۔

سید والا تبار سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے خصوصی توجہ فرمائی اور مجھے لکھا کہ میں ان کے اس مضمون کا مطالعہ کروں جو افضل الفوائد کے زیر عنوان مارچ ۱۹۷۹ء کے معارف میں آنے والا ہے میں نے پورے انہماک اور دلچسپی سے اس کا مطالعہ کیا اور اپنے تاثرات لکھ کر موصوف کو بھیج دیے سید والا تبار نے از راہِ ذرہ نوازی میرے مکتوب کو معارف مئی ۱۹۷۹ء میں شائع فرمادیا۔ اور مجھے ہدایت فرمائی کہ میں بھی ملفوظات کے موضوع پر خامہ فرسائی کی جسارت کروں ؎

بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔

---

[1] سید والا تبار کا یہ مضمون اب ان کی کتاب بزم صوفیہ میں بطور ضمیمہ شامل ہے نیز معارف اعظم گڑھ ۱۹۶۹ء [2] مدیر منادی نے خوب کیا کہ اس خرافات کو یکجا شائع کر دیا تعجب نہیں کہ عقیدتمندوں کی عقیدت کا امتحان مقصود ہو جو امتحاں ہے ترے ایثار کا قربانی کا، مگر ان سلوں قتل کہاں

موصوف نے کچھ اس طرح فہمائش فرمائی کہ انہماک اور مشغولیت کے باوجود میں آمادۂ عمل ہو گیا اور جو بن پڑا انجام دیا۔

وہ مضامین جو بعض کتب ملفوظات کے خلاف شائع ہو چکے تھے میرے مطالعے میں تھے اور میں ان کے مطالعہ سے اس نتیجہ پہ پہنچ چکا تھا کہ اس مہم کو چلانے والے مطالعہ ملفوظات خواجگانِ چشت کے مبادیات[1] سے کما حقہٗ آگاہ نہیں ہیں۔ اسی لیے قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ لہٰذا میں نے پہلے اسی موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ جس سے ضمناً بہت سے اشکال رفع ہو سکتے تھے۔ بعد ازاں مستقل طور پر یکے بعد دیگرے فوائد السالکین[2] اسرار الاولیاء[3] اور راحت القلوب[4] پہ لکھا جن کا تعلق حضرت بابا فرید گنج شکر قدس اللہ سرہٗ العزیز کی سوانح حیات سے ہے۔ اس طرح میں اپنے موضوع سے بھی نہیں ہٹا اور یہ خدمت بھی سر انجام ہو گئی۔ میں ان دنوں حضرت بابا صاحبؒ کی سوانح کی تدوین میں مشغول تھا۔ میرے یہ مضامین معارف میں شائع ہوتے رہے اور اہل نظر کے ملاحظہ میں آتے رہے اور وہ میری ہمت افزائی فرماتے رہے۔ ان ہی کے ایما سے اب ان مضامین کو نظر ثانی کے بعد کتابی شکل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

یہ وضاحت بھی بے محل نہ ہو گی کہ میرے عندیے میں کتب ملفوظات کے دید کا دوران کے تاریخی خلفشار کا مسئلہ مقدم و اہم تھا۔ لہٰذا میں نے جس مجموعۂ ملفوظات پر قلم اٹھایا پہلے ہر پہلو سے اسی گتھی کو سلجھایا۔ اسے تائید غیبی کہا جا سکتا ہے کہ تقویم سے اور داخلی شواہد سے مجھے تائید حاصل رہی اور خاطر خواہ یہ خلفشار رفع ہو گیا۔

ذیلی عنوانات کی ترتیب میں اس امر کو ملحوظ رکھا ہے کہ مطالعہ کرنے والے کی طلب کے مطابق جو شے سُلجھے ہوئے انداز میں برمحل اس کے مطالعہ میں آتی رہے اور

---

[1] معارف اعظم گڑھ اگست، ستمبر، اکتوبر، نومبر ۱۹۷۹ء [2] معارف اعظم گڑھ مارچ، اپریل ۱۹۸۰ء [3] معارف اعظم گڑھ نومبر، دسمبر ۱۹۸۰ء جنوری، فروری ۱۹۸۱ء [4] معارف اعظم گڑھ نومبر، دسمبر ۱۹۸۱ء، جنوری ۱۹۸۲ء

اس کی طلب تشنہ نہ رہے۔ بلکہ حسنِ ترتیب سے تاثیر و تفہیم کا نقش ذہن میں مرتسم ہوتا چلا جائے۔ اور توہمات و تردودات بھی رفع ہوتے رہیں تاکہ ذہن کو حقیقی تشفی حاصل ہو جائے اور قلب روحانی کیفیات کو جذب کرنے اور لطف اندوز ہونے لگے۔

وہ روایات جنھیں معاندین نے خوارق عادۃ اور مافوق الفطرت بتا کر مجروح ٹھیرایا ہے اور ان کے سہارے کتب ملفوظات کو ناحق جعلی قرار دیا ہے۔ ان کی تشریح و تحلیل میں آئین فطرت، مذاق تصوف، اصول معاشرہ اور ضوابط ادب و زبان سے کام لیا ہے۔ اور یہ بھی نشان دہی کی ہے کہ یہی روایات اور ان ہی جیسی متعدد روایات بلکہ ان سے بھی زیادہ محیر العقول روایات ان کتب ملفوظات کی زینت ہیں جنھیں معاندین ملفوظات نہایت درجہ مستند و معتبر قرار دیتے ہیں۔
میں نے اکثر و بیشتر اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں ان ہی کتب ملفوظات سے اقتباسات شامل کیے ہیں جو معاندین کے نزدیک معتبر اور نہایت درجہ مستند ہیں۔ اور صفحات کا حوالہ بھی شامل کر دیا ہے۔ اس اعتبار سے گو خاصے کی شے نہ سہی لائق عذر قرار دی جا سکتی ہے ...... اور اگرچہ معاندین کے تحقیر آمیز جملے اشتعال پیدا کر سکتے تھے .... لیکن میں نے دلی کی قدیم تہذیبی روایات کا سررشتہ ہاتھ سے چھوڑا نہیں۔ اور ترکی بہ ترکی جواب نہیں دیا ہے۔ یہی آئین تصوف کا اقتضا بھی ہے۔ بلاشبہ تحقیق کا میدان بہت وسیع ہے۔ تحقیق میں کوئی شے حرف آخر قرار نہیں پاتی۔ لہٰذا یہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ نقشِ اول ہے۔ یہ بھی خدا کی دین ہے ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست تانہ بخشد خدائے بخشندہ

میں سجدۂ شکر ادا کرتا ہوں کہ خواجگانِ چشت ؒ کے صدقے میں رب العٰلمین نے یہ سعادت مجھے کرامت فرمائی۔ الحمد علیٰ ذالک۔

میں ان احباب کا دل سے شکر گزار ہوں جو از راہ ذرہ نوازی ہمت افزائی

فرماتے رہے ہیں۔ بالخصوص سید والاتبار سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب کا بصمیم قلب شکر گزار ہوں۔ جن کی تحریک و توجہ سے مجھے ان مضامین کی تدوین و نگارش کی سعادت نصیب ہوئی۔ اللہ پاک اجر عظیم عنایت فرمائے۔ آمین

میں بارگاہِ رب العزت میں بصد عاجزی و انکساری بدست بدعا ہوں کہ رب العلمین، شفیع المذنبین رحمۃ اللعالمین سیدی و مولائی صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں میری اس حقیر و ناچیز کوشش کو قبولیت کی سعادت نصیب فرمائے۔ اور اسے میرے لیے اور میرے والدین کے لیے توشۂ آخرت گردانے کیونکہ بمصداق اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیْہِ یہ اُن ہی کی تعلیم و تربیت کا ثمرہ ہے

سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

اخلاق حسین دہلوی

جمعہ — لال محل،

۱۱۔ ذی قعدہ ۱۴۰۱ھ — بستی حضرت نظام الدین اولیاء

۱۱۔ اگست ۱۹۸۱ء — نئی دہلی 110013

حاشیہ متعلق ص ۱

تقریب کے زیرِ عنوان راقم نے لکھا ہے کہ پروفیسر محمد حبیب مرحوم کے رشحاتِ قلم سے یہ ثابت نہیں کہ ملفوظات کے باب میں بھی ان کا وہی مقام ہے جو تاریخ میں ہے۔ یہاں ان کی معروف کتاب "حضرت نظام الدین اولیاء۔ حیات و تعلیمات" سے اس کے شواہد میں چند امثلہ پیش کی جاتی ہیں:۔

کتاب حضرت نظام الدین اولیاؒ حیات و تعلیمات	سیر الاولیاؒ (فارسی) چرنجی لال ایڈیشن
(۱) سیر الاولیاء مصنفہ سید مبارک علوی کرمانی المدعو بہ امیر خورد (ص ۱۱)	سیر الاولیاء، سید مبارک علوی کرمانی کی تصنیف نہیں ہے اور نہ وہ امیر خورد کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے۔ سیّد مبارک امیر خورد کا نام نہیں ہے بلکہ اُن کے والد بزرگوار کا نام ہے۔ امیر خورد کا نام محمد ہے اور وہ امیر خورد سیّد محمد کرمانی کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ سیر الاولیاؒ میں جابجا یہ نام موجود ہے (سیر الاولیاء ص ۳۵۷) خصوصیت سے لائقِ مطالعہ ہے۔
(۲) امیر خورد نے شیخ نظام الدین کا سالِ ولادت ۶۳۶ھ مطابق ۱۲۳۸ء دیا ہے (ص ۲۴)	امیر خورد کرمانیؒ نے سیر الاولیاء میں کہیں اور کسی جگہ حضرت نظام الدین اولیاء کا سن ولادت نہیں لکھا اور ۶۳۶ھ تو کہیں نہیں لکھا ہے کسی غلط سن ولادت کو امیر خورد کرمانی سے منسوب بتانا

	حاشیہ
	سراسر غلط ہے (ص ۹۵ ص ۱۵۵) کسی نامور اہلِ قلم کو یہ بات کب زیب دیتی ہے۔
(۳) امیر خورد لکھتے ہیں کہ انتقال کے وقت آپ کی عمر نواسی برس کی تھی۔ (حاشیہ ص ۱۲۷)	امیر خورد کرمانیؒ نے کہیں یہ نہیں لکھا کہ وفات کے وقت آپ کی عمر نواسی برس کی تھی البتہ انھوں نے آخری عمر کے مجاہدات کے ذکر میں یہ لکھا ہے کہ عمر عزیز سلطان المشائخ بہشتاد سال کشید (ص ۱۲۴) یعنی حضرت کی عمر اسّی سال کی ہو گئی تھی۔
(۴) جاگنے کے بعد اخی سراج سے تفتیش کی (ص ۱۲۱)	امیر خورد کرمانیؒ نے لکھا ہے کہ اخی مبارک خادم را طلبیدہ و ازیں جا تفحص کرد (ص ۱۲۹) اخی مبارک کو بلایا اور دریافت کیا۔ اخی سراج نہیں لکھا
(۵) اخی مبارک کتابت کی غلطی ہے، غالباً مراد آپ کے مشہور مرید اور خلیفہ اخی سراج سے ہے۔	اخی مبارک کتابت کی غلطی نہیں ہے بلکہ صحیح ہے، اخی سراج اور اخی مبارک دو مختلف شخص ہیں۔ اخی سراج کا نام سراج الدین عثمان ہے جو آئینۂ ہندوستان کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں اور جو حضرت کے مرید و خلیفہ تھے (ص ۲۸۸) اخی مبارک حضرت بابا صاحبؒ کے نوعمر غلام و خادم تھے جنھیں حضرت بابا صاحبؒ نے

اپنی صاحبزادی بی بی فاطمہؒ زوجہ مولانا بدرالدین اسحاقؒ کو دے دیا تھا جو اُن ہی کے ہمراہ دلی آ گئے تھے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ کی سرپرستی میں رہتے اور مطبخ کی خدمت انجام دیتے تھے۔ اخی مبارک سے یہی شخص مراد ہیں (ص ۱۷۲-۱۷۶)

(۶) ایک دن اخی سراج الدین آپ کی خدمت میں مچھلی کا شوربا لائے (ص ۱۳۶)

امیر خوردؒ نے لکھا ہے اخی مبارک روزے شوربائے ماہی چہ پیش بردند (ص ۱۵۴) کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ موضوع پر عبور کامل کی علامت ہے۔

(۷) امیر خورد کے نانا مولانا شمس الدین افغانی (ص ۱۳۶)

امیر خورد کرمانیؒ نے اپنے نانا بزرگوار کا نام شمس الدین دامغانی Damghani لکھا ہے (ص ۳۵۷) اور کئی جگہ لکھا ہے مگر افغانی کہیں نہیں لکھا۔

(۸) آپ کے سگے بھانجے خواجہ رفیع الدین ہارون اور تقی الدین نوح (ص ۱۱۶)

امیر خورد کرمانیؒ نے انھیں پسر خواہرزادہ حقیقی سلطان المشائخ لکھا ہے (ص ۲۰۲) یعنی سگے بھانجے یا بھانجی کے صاحبزادے (پوتے یا نواسے) یا سگے بھانجے لکھنا صحیح کیسے ہو سکتا ہے؟

(۹) بی بی زلیخا نے آپ کا ہاتھ پکڑا اور

امیر خورد کرمانیؒ نے واقعہ تو یہی لکھا ہے

کہا، خداوندا! میں اس کو تیرے سپرد
کرتی ہوں (سیر الاولیاء، باب اول
نکتہ چہارم) یہ واقعہ امیر خورد نے
اپنی بیوی کی سند پر لکھا ہے (ص ۵۵)

اور حضرت نظام الدین اولیاء کی زبانی
نقل کیا ہے (ص ۱۵۳) مگر یہ ذکر سیر الاولیاء،
باب اول نکتہ چہاردہم میں ہے نکتہ چہارم میں
نہیں ہے اس کے علاوہ یہ بھی نہیں ہے
کہ انھوں نے اپنی بیوی کے حوالے سے لکھا
ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ پروفیسر مرحوم نے
یہ کیسے لکھ دیا کہ امیر خورد نے یہ واقعہ اپنی بیوی کی
سند پر لکھا ہے۔ اسے کیا کہا جاسکتا ہے؟
میں تو پاسِ ادب سے کچھ نہیں کہتا۔ خواجہ
فریدالدین عطارؒ فرما گئے ہیں ع

علم را اعزاز کردن بے حساب

(۱۰) امیر خورد یہ بھی لکھتے ہیں کہ حضور
کے کئی مریدوں نے امیر حسن سجزیؒ کی طرح
حضور کے ملفوظات جمع کیے مگر
فوائد الفواد کے مقابلے میں وہ مقبول نہیں
ہوئے اور ہم تک نہیں پہنچے (ص ۴)
حاشیہ میں سیر الاولیاء ہی کے حوالے سے
یہ نام لکھے ہیں: انوار المجالس، تحفۃ
الابرار، درر نظامی مصنفہ مولانا
علی جاندار

جنھوں نے سیر الاولیاء کا بالاستیعاب
مطالعہ کیا ہے وہ کہہ سکتے ہیں کہ امیر خورد
کرمانیؒ نے کہیں نہیں لکھا کہ فوائد الفواد کے
مقابلے میں دیگر مجموعہ ہائے ملفوظات مقبول نہیں
ہوئے اور ہم تک نہیں پہنچے ع

ناطقہ سربگریباں ہے کہ اسے کیا کہیے

پہنچے ہیں اور ضرور پہنچے ہیں انھوں نے خود
انوار المجالس کے حوالے سے (سیر الاولیاء
ص ۳۷۹ میں) سلطان المشائخؒ کا ایک
ملفوظ نقل کیا ہے بیشک امیر خورد کرمانیؒ نے

درر نظامی کا ذکر کہیں نہیں کیا۔ البتہ
علی بن محمود جاندار شاہ کی ایک کتاب
خلاصۃ اللطائف کا ذکر کیا ہے (ص ۴۴۹)

(۱۱) امیر خورد کرمانیؒ نے حضرت محبوب الٰہیؒ کے والد بزرگوار کی وفات و علالت کے ذکر میں حضرت بی بی زلیخاؒ والدہ حضرت محبوب الٰہیؒ کے ایک خواب کا ذکر کیا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت بی بی صاحبہ نے خواب میں دیکھا کہ کوئی یہ کہتا ہے کہ دونوں میں سے کسی ایک کو لے لو شوہر کو یا بیٹے کو انھوں نے بیٹے کو لے لیا۔ صبح ہوئی تو انھوں نے اس خواب کا کسی سے ذکر نہیں کیا۔ چوں روز شد آں خواب با ہیچ کس نگفت (سیر الاولیاء ص ۹۵) اس خواب کے متعلق پروفیسر مرحوم نے یہ اظہار خیال فرمایا ہے:-

(۱) بی بی زلیخاؒ کے خواب کے بیان کی ذمہ داری کلیتاً مصنف سیر الاولیاء پر ہے ——
(۲) یہ بیان بے لطف، تکلیف دہ اور بے سند ہے۔ کسی عورت سے یہ کہنا کہ اپنے شوہر اور بیٹے کی زندگی میں کسی ایک کو چُنو۔ اس پر ظلم ہے۔
(۳) اگر بی بی زلیخاؒ نے اپنے خواب کے بارے میں کسی سے کچھ نہیں کہا تو ایک صدی بعد امیر خوردؒ کو اس کے بارے میں کس طرح علم ہوا۔ یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر اُن خاتون بزرگ سے یہ سوال کیا گیا ہوتا تو وہ اپنے بیٹے کے فلسفۂ زندگی کے مطابق یہ جواب دیتیں کہ اس معاملہ کا تعلق مشیت ایزدی اور امور غیبی سے ہے میں خدا کے حکم پر راضی ہوں (حاشیہ ص-۳۴)

نہیں کہا جا سکتا کہ مرحوم پروفیسر صاحب نے کس انتشار کی کیفیت میں یہ بیان قلم بند کر دیا ہے کہ مربوط بھی نہیں رہا ہے۔ میں نے نمبر لکھ دیئے ہیں۔ اگر اس طرح ترتیب دے دیا جائے تو مربوط ہو جائے گا تاہم یہ بیان ان کے طریق فکر اور زاویہ نگاہ کا ترجمان ہے یا غماز ہے
یہ صحیح ہے کہ امیر خورد کرمانیؒ نے اپنی عادت کے خلاف اس خواب کو

سند کے ساتھ نقل نہیں کیا۔ سبب کچھ بھی ہو۔ تاہم یہ کلیہ ہے کہ انسانی کارنامہ کیسا بھی ہو اور کسی کا بھی ہو سہو و خطا سے مبرا نہیں ہوتا۔ خوبی یہ ہے کہ وہ اغلاط کثیرہ کا مرقع نہ ہو۔ اس اعتبار سے اختلاف تو کیا جاسکتا لیکن نہ اسے حقارت سے دیکھا جاسکتا ہے نہ عیب جوئی کا ارتکاب کیا جاسکتا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ اظہار خیال سے پہلے علمی دنیا میں وسعت مطالعہ کی شمع ہاتھ میں لے کر ڈھونڈ لینا چاہیے تاکہ اندھیرے کونے کھدرے میں بھی اگر کچھ ہو تو نظر آجائے۔

وسعت مطالعہ کا اقتضا یہ ہے کہ ہدف ملامت بنانے سے پہلے متعلقات پر نظر ڈال لی جائے۔ مبادہ بات کہیں سے کہیں جا پہنچے اور ندامت کا سبب بنے علی جاندار شاہؒ امیر خورد کرمانیؒ کے معاصر ہیں۔ خوردی و بزرگی کا امتیاز ہو سکتا ہے۔ سیر الاولیاء میں ان سے کئی روایتیں منقول ہیں ان کی کتاب خلاصۃ اللطائف کا اقتباس بھی سیر الاولیاء کی زینت ہے۔ ان کی دوسری کتاب درر نظامی کا ذکر مرحوم پروفیسر صاحب نے خود بھی کیا ہے۔ اگر اس پر نظر ہوتی تو وہ بالیقین وہ کچھ نہ لکھتے جو انھوں نے لکھ دیا ہے۔ علی بن محمود جاندار شاہؒ نے بایں الفاظ اس خواب کا ذکر کیا ہے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا ہے:۔

"من شیر خوار بودم۔ والدۂ مرا در خواب نمودند کہ یا شوہر را
یا پسر را از میان دو یکے را اختیار کن والدہ مرا اختیار کرد
.... می فرمود کہ ایں حکایت از ہمشیر مہتر خود شنیدہ ام۔
(درر نظامی[1] قلمی نسخہ سالار جنگ میوزیم حیدرآباد)"

اس بیان سے امیر خورد کرمانی کے بیان کی تصدیق بھی ہو جاتی ہے اور روایت کا تواتر بھی واضح ہوتا ہے اس کی پہلی راوی حضرت کی بڑی بہن ہیں دوسرے راوی

[1] اردو درر نظامی کے نام سے درر نظامی کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے جس کے ص ۱۵ پر یہ مضمون ہے۔

حضرت محبوب الٰہیؒ بذات خود ہیں۔ تیسرے علی بن محمود جاندار شاہ ہیں۔ اصلی راوی حضرت کی والدہ ہیں۔ جن کا حوالہ اس میں مقدر ہے۔ ایک صدی میں تین راوی بہت کافی ہوتے ہیں۔ روایت کی کسوٹی پر یہ روایت صحیح اترتی ہے۔ اور وہ اعتراض رفع ہوجاتا ہے جو کیا گیا ہے۔

امیر خورد کرمانیؒ نے یہ لکھا ہے کہ چوں روز شد آں خواب باہیچ کس نہ گفت۔ صبح کو یہ خواب کسی سے بیان نہیں کیا۔ یہ تو نہیں لکھا کہ تا عین حیات باہیچ کس نہ گفت۔ زندگی بھر کسی سے بیان نہیں کیا۔ کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ مصلحت فی الوقت ان کے اظہار کی اجازت نہیں دیتی لیکن جب مانع رفع ہوجاتا ہے تو اظہار میں مضائقہ نہیں رہتا۔ ایسے مواقع زندگی میں پیش آتے ہی رہتے ہیں۔ ممکن ہے کہ دل شکنی کے اندیشے سے اس دن یا کئی دن یا جب تک خواجہ احمدؒ بقید حیات ہوں کسی سے خواب کا ذکر نہ کیا ہو۔ مگر وفات کے بعد مانع نہیں رہا تو اظہار میں بھی مضائقہ نہیں رہا۔ ماں سے بیٹی نے سنا اور بہن سے بھائی نے سنا اور جب حضرت محبوب الٰہیؒ نے اپنی مجلس میں ذکر فرمایا تو حاضرین مجلس کے اور ان کے علاوہ دیگر حضرات کے علم میں بھی یہ بات آگئی۔ اور ممکن ہے کہ اس ذکر نے عمومیت اختیار کرلی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس عمومیت ہی نے امیر خورد کرمانیؒ کے ذہن کو سند کی طرف منتقل نہ ہونے دیا ہو۔

بہرحال سند کے بیان نہ کرنے سے تو امیر خورد کرمانیؒ کو ہدف بنایا جاسکتا ہے اور نہ خواب کی نوعیت میں کلام کیا جاسکتا ہے۔ فلسفۂ خواب اور تعبیر رؤیا پر کتابیں لکھی تو گئی ہیں مگر بقدر قلیل۔ علامہ ابن سیرینؒ کی کتاب تعبیر الرؤیا شہرۂ آفاق کتاب ہے۔ علامہ ابن سیرینؒ حضرت خواجہ حسن بصریؒ کے معزز معاصر تھے۔ خواب در رؤیا سے متعلق کتابوں کا مطالعہ بتاتا ہے کہ خواب کا مدار کبھی امور غیبیہ پر ہوتا ہے۔ کبھی قوت متخیلہ پر تعبیر میں دونوں ہی کی رعایت مرعی رکھنی ہوتی ہے۔

خواب دیکھنے والا اپنے کو کتنا ہی متحرک بالارادہ دیکھے مگر اس کی حیثیت دراصل معمول کی سی ہوتی ہے۔ اس عالم میں کسی کا فلسفہ زندگی بھی نہیں چلایا جاتا اسی لیے خواب دلیل شرعی قرار نہیں دیا جاتا اور بربنائے خواب احکام شرعی کا نفاذ عمل میں نہیں آتا۔

خواب کا مقصود کسی امر کا دلنشیں کرنا ہوتا ہے۔ اس خواب سے بظاہر یہ تصور دینا مقصود تھا کہ حضرت خواجہ احمدؒ چند روز کے مہمان ہیں۔ حضرت بی بی زلیخاؒ کی رمز شناسی اور نیک سیرتی اس سے ظاہر ہے کہ انھوں نے راز درپردہ کو سمجھ لیا کسی سے تعبیر بھی نہیں لی۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ انھوں نے صبح کو کسی سے خواب بیان نہیں کیا اس میں حضرت بی بی زلیخاؒ کی رمز شناسی کا وصف مضمر ہے۔ یعنی رمز شناسی کی بنا پر کسی سے بیان نہیں کیا۔ حالانکہ خواب کی ہولناکی کا تقاضا یہ تھا کہ صبح سویرے ہی کسی سے بیان کیا جاتا اس امید پر کہ کوئی تسلی بخش تعبیر مل سکے۔ ایسا نہیں کیا جو حیرت انگیز ہے مگر دانشوری کے وصف سے مالا مال ہے۔ امیر خورد کرمانیؒ کے مذکورہ جملے میں بھی یہی راز پنہاں ہے۔

یہ صحیح ہے کہ امیر خورد کرمانیؒ وقوع واقعہ سے ایک صدی بعد کے اہل قلم ہیں لیکن ان کے عہد تک واقعہ ضبط تحریر میں آچکا تھا علی بن محمود جاندار شاہ جیسے بزرگوں سے امیر خورد کرمانیؒ کی ملاقات بھی تھی اس لیے ایک صدی کا مفروضہ بُعد امیر خورد کرمانی کو ہرگز غیر معتبر قرار نہیں دیتا لہٰذا اس باب میں مرحوم پروفیسر صاحب نے جو اظہار خیال فرمایا ہے وہ محل نظر ہے ہرگز قابل قبول نہیں ہے۔

الغرض اس قسم کے متعدد نادرات ہیں جو متذکرہ کتاب میں جابجا نظر افروز ہیں اور جو مرحوم کے اعتماد و رسوخ کو مجروح کرتے ہیں۔ اور زبان حال سے کہہ رہے ہیں کہ ملفوظات کے باب میں ان کا وہ مقام نہیں ہے جو تاریخ میں ہے۔ میں نے دانستہ طور پر اس مضمون سے پہلوتہی کی ہے جو مڈیول انڈیا میں شائع ہوا تھا کہ مرحوم کا پایۂ اعتبار بخوبی واضح ہو جائے۔ میرے نزدیک اظہار حقیقت کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ اللہ پاک ہمیں راہ راست عنایت فرمائے اور اپنے نیک بندوں کی روش پر چلنا نصیب کرے ــــ آمین

خواجگان چشت کے ملفوظات
سے متعلق ایک مکتوب

بنام

سید الاحبار سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب

مزاج مبارک، مارچ ۱۹۷۹ء کا معارف ایک دوست کی وساطت سے مل گیا۔ آپ کی ہدایت کے مطابق میں نے آپ کا مضمون "امیر خسروؒ اور افضل الفوائد" پورے انہماک اور توجہ سے مطالعہ کیا۔ یہ پہلی قسط ہے۔ دیگر اقساط کا منتظر ہوں۔ آپ کی تحقیق و تلاش اور نکتہ رسی کی داد دینا سورج کو چراغ دکھانے کی مصداق ہے۔

ع مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

خوب لکھا ہے اور تفصیل سے لکھا ہے۔

اس دوران میں میرے علم میں یہ بھی آیا کہ دلّی کی کسی پبلک لائبریری میں معارف نہیں آتا۔ میں نے فتحپوری لائبریری کے ارکان کو توجہ دلائی ہے انھوں نے وعدہ بھی کیا ہے۔ ایفا کب ہوتا ہے۔ یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے ع وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو گیا۔

یہ دیکھ کر مجھے دکھ ہوا کہ معارف کی کتابت و طباعت کا وہ معیار نہیں رہا جو تھا، کاتب صاحب احتیاط سے کام لیں، قلم جما کر لکھیں اور اشکال صحیح بنائیں، نوک پلک کا بھی خیال رکھیں، مشین مین صاحب روشنائی میں وارنش کی آمیزش گوارا کریں تو معیار پر آجائے گا بقول مہدی افادی پیکر جمیل بہ لباس حریری دل کو بھاتا اور لبھاتا ہے۔

اس کے بعد موضوع سے متعلق یہ عرض کرنے کی جسارت کرتا ہوں کہ خیر المجالس میں فوائد الفواد کے حوالے سے جو عبارت منقول ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ بعینہٖ

فوائد الفواد میں نہیں ہے مگر ان ناقدین کے لیے اساس ہے جو کتب ملفوظات کو جعلی قرار دینے کے درپے ہیں، یہ پوری عبارت اہمل، بے جوڑ، اسقام سے بھرپور اور اس لائق ہے کہ تجزیہ کرکے بتایا جائے کہ یہ کسی صاحب کمال کے قلم سے نکلی ہے، اور نہ اسے اساس بنایا جاسکتا ہے، یہ تو کسی کم سواد کی کارستانی ہے۔

متکلم کا بیان ہے: "من بر شخصے کتابے دیدہ ام از تصنیف شیخ۔ متکلم نے کسی کے پاس کتاب دیکھی، غالباً اسی مماثلت سے اس کو یہ شبہ ہوا کہ یہ شیخ کی تصنیف ہے، یہ رائے خود دیکھنے والے نے قائم کی ہے، کسی نے اسے بتایا نہیں ہے کہ یہ شیخ کی تصنیف ہے۔ اس کے متعلق اتنا ہی ذہن نشین رکھنا کافی ہے، جملے کا آخری حصہ ہے "از تصنیف شیخ" یہ مبہم ہے۔ لفظ شیخ وضاحت کا متقاضی ہے کہ شیخ سے مراد کون ہے؟ یہ جملہ حضرت محبوب الٰہیؒ کے روبرو بولا گیا ہے، گویا کہ لفظ شیخ سے مراد حضرت محبوب الٰہیؒ ہیں، محل گفتگو اور آداب مجلس کا اقتضا یہ ہے کہ شیخ کے ساتھ تعظیمی الفاظ کا اضافہ بھی ہو، کیونکہ حضرت محبوب الٰہیؒ کی مجلس وہ مجلس تھی جہاں اچھے اچھے باکمال عجز و نیاز سے سر بہ خم رہتے تھے۔ صرف شیخ کہہ دینا اور حضرت محبوب الٰہیؒ کے روبرو کہنا ہرگز قرین قیاس نہیں۔

اس کے بعد اس کا جواب ہے، جو حضرت محبوب الٰہیؒ کی زبانی نقل کیا ہے یہ بھی فوائد الفواد کی مسخ شدہ عبارت ہے جو بے محل اغلاط سے پُر اور کسی ایسے شخص کی مسخ کردہ ہے جو بالکل ہی مبتدی ہے بلکہ مبتدی سے بھی گیا گزرا ہے، اس میں تحریف بھی ہے اور الحاق بھی ہے جو ہرگز مذکورہ بیان کا جواب نہیں ہے، اسے بطور جواب حضرت محبوب الٰہیؒ سے منسوب کرنا بہت بڑی گستاخی اور سر بسر افترا ہے، وہ مبتدی جسے فارسی میں ذرا بھی شُد بُد ہے وہ بھی مذکورہ بیان کا یہ جواب نہیں دے سکتا، جو حضرت محبوب الٰہیؒ سے منسوب کیا گیا ہے جو عالم و عارف

زبان دان و اہل زبان اور برگزیدہ و عمر رسیدہ بزرگ تھے۔ جواب یہ ہے کہ "او تفاوت گفتہ است من ہیچ کتاب تصنیف نہ کردہ ام .... و خواجگانِ ما نیز نہ کردہ اند" متکلم مخاطب موجود ہے پھر ضمیرِ او اور گفتہ کا کیا محل ہے۔ متکلم نے جو کچھ کہا ہے اپنے صوابدید سے کہا ہے کسی نے اس سے کچھ کہا سنا نہیں ہے۔ افعال و ضمائر کی ایسی غلطیاں مبتدیوں سے بھی کم ہوتی ہیں کسی معقول پڑھے لکھے سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی چہ جائے کہ کسی عالم و زباں داں سے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ فرماتے تو کچھ اس طرح فرماتے۔ "تفاوت دیدہ۔ تفاوت می گوئی ..... بلا شبہ یہ تفاوتِ کثیرہ یہ جملے فوائد الفواد سے منقول ہیں۔ ناقل پہلے جملے کے صرف محل سے ناواقف ہے، دوسرے جملے میں کتابے کی یائے وحدانی حذف کردی ہے جو کسی ایک کتاب کی نمائندہ تھی، عمل تحریف سے نبشتہ ام کو تصنیف نہ کردہ ام کردیا ہے تیسرے جملے کا اضافہ فرمایا ہے، جو حشو اور عیب کلام سے ہے بلکہ الحاقی ہے، یہ ہے وہ ساری کائنات جو کتب ملفوظات کو جعلی قرار دینے کی اساس ہے، یہ وہ اونٹ ہے جس کی کوئی کل سیدھی نہیں کیسے دانشور ہیں وہ نقاد جو پانی پر پاٹیا باندھتے اور ہوا پر محل بناتے ہیں۔ کھوکھلی بنیاد کو ذرا چھیڑیے عمارت دھڑام سے منہ کے بل آ پڑے گی۔ آپ نے کمالِ ایجاز سے یہ فرمایا ہے۔ "خواجگانِ چشتؒ کے جن ملفوظات کو جعلی اور فرضی قرار دیا جاتا ہے، اس کا محض قیاس ایک مبہم اور غیر واضح بیان سے کیا جاتا ہے۔" میرے نزدیک خیر المجالس کی مذکورہ عبارت کی قباحت وضاحت کی مقتضی ہے۔

مولانا حمید قلندرؒ سے تو یہ توقع نہیں کہ وہ یہ بے سر و پا عبارت لکھتے۔ یقیناً یہ کسی کم سواد و ستم ظریف کی کارستانی ہے، اور ایسے ہی عقل کے پورے اس کو معتمد مانتے ہیں۔ حیرت ہے ان دانشور نقادوں پر جن کے لیے یہ احساس ہے خیر المجالس کے باب میں یہ بھی دشواری ہے کہ اس کے قدیم نسخے دستیاب نہیں ہوتے۔ ایک نسخہ

سبحان اللہ کلکشن، مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی میں ہے۔

ایک نسخہ اورینٹل ریسرچ انسٹیٹوٹ حیدرآباد میں ہے جسے آصفیہ لائبریری کہتے تھے، یہ ۱۳۱۴ھ کا مکتوبہ ہے، مطبوعہ نسخہ اسی کی آواز بازگشت ہے۔ لطیفہ یہ ہے کہ کتب ملفوظات کو جعلی قرار دینے والے نقاد جن کتب ملفوظات مستند قرار دیتے ہیں، ان ہی کے قدیم نسخے نایاب ہیں، درر نظامی کا ایک نسخہ ہے جو سالار جنگ میوزیم حیدرآباد کی زینت ہے، اور بارہویں صدی ہجری کا مکتوبہ ہے، فوائد الفواد کا قدیم ترین نسخہ ۱۱۶۱ھ کا مکتوبہ ہے۔ یہ بھی سالار جنگ میوزیم ہی میں ہے۔

یہ بھی عرض کرنے کی جسارت کرتا ہوں کہ فاضل نقاد نے مولانا رکن الدین کاشانیؒ کی کتاب کا نام "شمائل الاتقیاء رذائل الاشقیا" لکھا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے مولانا رکن الدین کاشانی کی کتاب کا نام "شمائل الانقیاد و دلائل الاتقیا"[1] ہے یہ کتاب ایشیاٹک سوسائٹی کے ذخیرۂ مخطوطات میں ہے، فارسی مخطوطات کی کیٹلاگ مطبوعہ ۱۹۲۶ء کے صفحہ ۵۷۱ میں ۱۱۹۷ نمبر پر ہے، اور ۱۱۳۰ء کی مکتوبہ ہے ایک نسخہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں ہے جو ۱۰۶۲ھ کا مکتوبہ ہے، مرحوم شمس اللہ قادری نے اردو ئے قدیم (نولکشوری) صفحہ ۱۸ میں یہی نام لکھا ہے، اور مصنف کا مختصر سا حال بھی لکھا ہے، مجھے بھی ایک ایسے نسخے سے استفادہ کی سعادت نصیب ہے، جو ۱۲۹۵ھ کا مکتوبہ ہے، جس کے ابتدائی اوراق ضائع ہو چکے ہیں۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ رذائل الاشقیاء کی پرچھائیں بھی نہیں پڑی ہے[2]۔

---

[1] پروفیسر خلیق احمد نظامی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے خیر المجالس کا نسخہ شائع کیا ہے۔ وہ فاضل مکتوب نگار کی نظر سے ضرور گزرا ہوگا۔ (معارف)

[2] ۱۳۴۷ھ میں شیخ رکن الدین کی یہ کتاب اشرف پریس حیدرآباد سے چھپی ہے۔ اس کا نام شمائل عرف شمائل الاتقیاء ہی لکھا ہوا ہے، اور اسی نام سے مشہور ہوئی۔ (معارف)

یہ بھی عرض کرنا مناسب سمجھوں گا کہ سیر الاولیا (چرنجی لال اڈیشن) صفحہ ۵۸۱ تا ۵۹۲ میں۔ "نکتہ در بیان مردے کہ ایشاں مستغرق باشند و از خواب و خورد الشیاں را یاد نہ باشد" کے تحت تمہیدی اور اختتامی چند سطور اور بعض بعض الفاظ اور جملوں کے سوا جو من مانی کرنے اور ربط قائم کرنے کے لیے شامل کیے گئے ہیں تمام عبارت تاریخ فیروز شاہی برنی کے جستہ جستہ مقامات سے ماخوذ ہے، اس نکتے سے متعلق جملہ عبارت الحاق ہے، جس کے متن کا تعلق سیر الاولیا سے نہیں ہے، یہ نکتہ سیر الاولیا کے معدودے چند ان نسخوں میں ملتا ہے، جو سنہ ۱۱... عہد محمد شاہ کی مرتبہ سیر الاولیا سے منقول ہیں اوروں میں نہیں ہے۔ چرنجی لال اڈیشن بھی اسی کی آواز بازگشت ہے، عنوان کو متن سے ربط نہیں، متن تمام تر احوال شاہان و امرا پر مشتمل ہے، جگنو کی سی جھلکی البتہ کہیں کہیں ملتی ہے جو نشلس کا قبیح ترین نقص ہے، امیر خورد کرمانیؒ کے اسلوب کا پرتو بھی نہیں ہے۔ عنوان کی عبارت میں بھی وہ ندرت و صفائی، شگفتگی و دل آویزی نہیں جو امیر خورد کرمانیؒ کے اسلوب کا خاصہ ہے۔

ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں سنہ ...ھ کا مکتوبہ سیر الاولیا کا نسخہ ہے، جس کا پہلا کیٹلاگ نمبر ۱۲۴۳ اور بعد کا ۱۲۸ ہے، جو معلومہ نسخوں میں قدیم ترین ہے، اس میں سیر الاولیا کے اختتام کے بعد کچھ اوراق خالی ہیں، پھر یہ عبارت مرقوم ہے، گویا کہ کسی کی یادداشت ہے، اس کے آغاز میں نہ عنوانی عبارت ہے نہ نکتہ مرقوم ہے، اور نہ کسی باب سے اس کا تعلق ہے، فہرست مضامین میں بھی یہ نکتہ اور عنوان نہیں ہے۔

یہ بھی ... ہے کہ امیر خورد کرمانیؒ کا سنہ وفات ...ھ ہے۔ اور مذکورہ عبارت میں ...ھ کا احوال ہے۔ مرزا مظہر جان جاناں کے شیخ طریقت

سید نور محمد بدایونی کا سنہ وفات بقول مرزا مظہر جانِ جاناں ۱۱۳۵ھ ہے مگر وہ ۱۱۵۵ھ میں سیر الاولیاء کے ناقل و کاتب ہیں" الحاق کے شغف میں ان دانشوروں کو اتنا بھی ہوش نہیں رہا کہ جو دنیا سے گزر گئے، وہ دنیاوی کتابوں کے مصنف اور کاتب و ناقل نہیں ہوا کرتے۔

سمع خراشی کی معافی چاہتا ہوں، معارف اپریل کا منتظر ہوں، کیا یہ ممکن ہے کہ افضل الفوائد کی مجالس کی تاریخوں کا نقشہ میں آپ کو بھیج دوں، آپ اپنے قلمی نسخے سے مقابلہ کرا کے مجھے بھیج دیں، مجھے توقع ہے کہ اس باب میں آپ میری راہنمائی فرماتے رہیں گے، کیا اچھا ہو جو آپ کسی ایک مجموعہ ملفوظات پر لکھتے رہیں، اور معارف میں شائع کرتے رہیں، بعد ازاں ان سب کو کتابی شکل میں شائع کر دیں، یہ ایک اچھی خدمت ہوگی، دعائے خیر کا طالب ہوں۔

اخلاق حسین دہلوی

(بشکریہ معارف اعظم گڑھ مئی ۱۹۷۹ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مطالعہ ملفوظات خواجگانِ چشت کے مبادیات

عہدِ حاضر میں ہند و پاک میں کتب ملفوظات پر کچھ ایسی تنقیدیں لکھی جا رہی ہیں کہ اہل علم تو نہیں۔ البتہ ناواقف ان کے مطالعہ سے گمراہ ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا کتب ملفوظات پر لکھنے سے پہلے ان امور سے روشناس کرانا مناسب ہوگا۔ جو ان تنقید نگاروں کے خیالات کی اساس اور غلط فہمیوں کے اسباب ہیں، انھیں ذہن نشین رکھنے سے کتبِ ملفوظات کا مطالعہ نفع بخش ہوگا اور ذہن کو غلط راہ روی سے محفوظ رکھے گا (انشاء اللہ تعالیٰ) ان میں سے اہم ترین یہ ہے کہ کتب ملفوظات آج تک نقد و تصحیح کے ساتھ شائع نہیں ہوئی ہیں۔

⁘ ⁘ ⁘

ملفوظات کیا ہیں؟ ملفوظات مجموعہ ہوتے ہیں، ان بیانات کا جو اخلاقِ فاضلہ اور اعمالِ صالحہ کی ترغیب و تحریص کے لیے صوفی بزرگ اپنے مریدوں اور عقیدتمندوں کے مجمع میں بیان کیا کرتے تھے اور کرتے ہیں، ان میں سامعین کی استعداد کا ان کے امراض قلبیہ کے دفعیہ کا اور ان کی روحانی ترقی کا پورا پورا لحاظ ہوتا ہے، اکابر اولیاء اللہ کا ذکر بھی آجاتا ہے، جو اثر و تاثیر کو دو بالا کر دیتا ہے۔ ملفوظات کو اشارات و ارشادات اور اقوال و فوائد بھی کہتے ہیں۔ اور ان کے مجموعوں کو کتب اہل سلوک اور کتب مشائخ سے تعبیر کرتے ہیں۔

۲۔ ملفوظات کی اہمیت ملفوظات کو زمانہ قدیم سے اہمیت اور مقبولیت حاصل ہے۔ انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اور انھیں اصلاح حال کیلیے نفع بخش مانا جاتا ہے، ان کا شمار کتب اہل سلوک اور کتبِ مشائخ میں ہوتا ہے، حضرت باباصاحب کا ارشاد ہے۔

اگر کسے را شیخے کامل نباشد کتاب	اگر کسی کو شیخ کامل نہ ملے تو
اہل سلوک پیش خود دارد و متابعت	وہ اہل سلوک کی کتاب کا مطالعہ
آں نماید۔ (راحت القلوب ص ۱۵)	کرے اور اس کی پیروی کرتا ہے۔

حضرت محبوب الٰہیؒ نے بارہا خواجہ امیر حسن علا سجزیؒ کو نصیحت فرمائی ہے۔

کتاب مشائخ و اشارات ایشاں	مشائخ کی کتاب اور ان کے
کہ در سلوک راندہ اند در نظر	اشارات جو انھوں نے سلوک کے
می باید داشت (فوائد الفوائد ص ۳۰)	بابیں فرمائے ہیں مطالعہ میں رکھنے چاہئیں۔

ان ارشادات سے مشائخ کرام کی کتابوں کا وجود، ان کا منفعت بخش ہونا اور ان کی قدر و منزلت واضح ہے۔ اس اجمال کی تفصیل کے بعد حضرت محبوب الٰہیؒ نے یہ بھی فرمایا ہے۔

چوں بخدمت شیخ الاسلام فریدالدین	جب میں حضرت باباصاحبؒ کی
قدس سرہ العزیز پیوستم ہمیں معنی	خدمت فیض درجت سے وابستہ
در خاطر کردم کہ آنچہ از لفظ مبارک	ہوا تو میں نے یہ ارادہ کیا کہ جو کچھ
ایشاں خواہم شنید قوا ہم نوشت	میں آپ کی زبان مبارک سے سنوں گا
. . . . ہرچہ از شیخ	وہ لکھ لیا کروں گا . . . . . لہذا جو کچھ
شنودہ شد نوشتم چوں بمقام	میں حضرت باباصاحبؒ سے سنتا وہ
خود باز آمدم نسخہ کردم۔	لکھ لیا کرتا۔ جب اپنی قیام گاہ پر

بعد ازاں ہرچہ سماع می افتاد	واپس آتا تو کتاب میں لکھ لیتا
در قلم می آوردم تا ایں معنی	اس کے بعد بھی جو کچھ سنتا اسے
بسمع مبارک شیخ باز نمودم۔ بعد	لکھ لیتا حتیٰ کہ یہ بات میں نے حضرت
ازاں ہر گاہ کہ حکایتے واشارتے	بابا صاحبؒ کو بتادی اس کے بعد
بیان کردے می فرمودے	حضرت بابا صاحبؒ کوئی حکایت یا
حاضر ہستی تا ایں غایت کہ اگر	کوئی اشارہ فرماتے تو مجھ سے فرماتے
من غائب بودمے چوں بخدمت	حاضر ہو، یہاں تک کہ اگر میں موجود
باز پیوستمے فائدہ کہ در غیبت	نہ ہوتا اور دیر سے حاضر خدمت
فرمودے آں را اعادہ	ہوتا۔۔۔ تو جو کچھ بیان فرما چکے ہوتے
کردے۔ (فوائد الفواد ص[۳])	اسے دوبارہ بیان فرماتے

(۱) ایسا لگتا ہے کہ حضرت محبوب الٰہیؒ حضرت بابا صاحبؒ کے بیان فرماتے وقت ہی لکھ لیا کرتے تھے، یا بعض ارشادات کی مدد سے بعد میں تفصیل سے لکھ لیتے تھے، راحت القلوب کی عبارت دیگر ملفوظات سے مختلف ہے مگر دیرینہ روزی کے اثرات کے باوجود سلیس دلکش اور مؤثر ہے۔

(۲) حضرت بابا صاحبؒ کی خانقاہ میں مریدوں کے قیام کے لیے علیحدہ جگہ تھی۔ جہاں حضرت محبوب الٰہیؒ کے لیے پلنگ بچھوایا گیا تھا، اور جہاں دیگر مرید بھی مقیم تھے، جن میں حافظ قرآن بھی تھے۔ (سیر الاولیا۔ ص ۱۰۷ چ[۱])

(۳) حضرت بابا صاحبؒ کی قیام گاہ علیحدہ تھی، جہاں ایک بار حضرت محبوب الٰہیؒ نے آپ کے پلنگ اور بستر کی زیارت کی تھی، اور ایک بار آپ کو عالم وجد میں دیکھا تھا۔ (فوائد الفواد ص ۵۱-۵۲ سیر الاولیا ص ۱۲۳ چ)

[۱] چ سے مراد چرنجی لال ایڈیشن۔ ان مضامین میں چرنجی لال ایڈیشن ہی کے حوالے ہیں۔

(۴) ملفوظ میں لفظ نسخہ کردم یہ بتاتا ہے کہ حضرت محبوب الہیٰؒ حضرت بابا صاحب کے ارشادات کو کمال حزم واحتیاط سے اور اخلاص احترام کے بشکل کتاب مدون فرماتے تھے۔ وہ یادداشت سہی مگر تھی بصورت کتاب جو نصف صدی کے قریب تک آپ کے پاس محفوظ تھی۔

(۵) یہ اہتمام کہ اگر کبھی حضرت باباصاحبؒ کچھ فرمانا شروع کردیتے اور حضرت محبوب الہیٰؒ موجود نہ ہوتے تو آپ کے پہنچتے ہی اعادہ فرماتے اور بیان کو دہراتے تھے، اس سے بھی ملفوظات کی افادیت ظاہر ہے۔

(۶) اس سے بھی ملفوظات کی اہمیت واضح ہوتی ہے کہ اگر حضرت باباصاحبؒ مزید توجہ کی ضرورت سمجھتے تو دورانِ بیان میں متنبہ کرتے اور فرماتے حاضر ہی، توجہ سے سن رہے ہوتا؟

(۷) "بعد ازاں ہرچہ سماع افتاد" اور "در قلم می آوردم" ماضی استمراری کے افعال ہیں جو سننے اور لکھنے کے باہمی تواتر کو ظاہر کرتے اور بتاتے ہیں کہ اس کا تعلق قیام اجودہن سے ہے، حضرت باباصاحبؒ کی مجلس میں جو کچھ سنا قیام گاہ پر آکر اسے مرتب کرلیا، شوق اور لگن کا اقتضا بھی یہی تھا۔

(۸) یہ بھی یقینی ہے کہ تالیف ملفوظات کی روایت بزرگان سلف سے تعلق رکھتی ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو حضرت باباصاحبؒ اس قدر اہتمام نہ فرماتے اور حضرت محبوب الہیٰؒ ہرگز اپنے مریدوں کو ملفوظات کی تدوین کی اجازت نہ دیتے۔ اور آپ کے بزرگ خلفاء جن میں شیخ برہان الدین غریبؒ اور مخدوم نصیرالدین چراغ دہلیؒ کے نام نامی سرفہرست ہیں، ہرگز اس پر عمل پیرا نہ ہوتے۔

(۹) حضرت باباصاحبؒ کے اور حضرت محبوب الہیٰؒ کے معمول سے اس کی بھی

لہ نفائس الانفاس ۔ سلہ خیرالمجالس ۔ ۱۴

تصدیق ہوتی ہے کہ خواجہ بزرگ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ اور حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشیؒ سے جو کتب ملفوظات منسوب ہیں وہ دیرینہ اثرات کے باوجود بالیقین ان ہی کے رشحاتِ قلم کے ثمرہ ہیں، حضرت محبوب الٰہیؒ نے یہ بھی فرمایا ہے۔

کرامتے معائنہ کردم۔ ہمدراں	میں نے ایک کرامت دیکھی،
ایام مردے مرا کاغذ ہائے سفید	ان ہی دنوں میں ایک شخص نے
داد یک جا جلد کردہؔ۔ من آں را	مجھے سفید کاغذ دیئے جو یکجا جلد
بستہ ہم فوائد شیخ ہم دراں	بستہ تھے۔ میں نے لیے اور
ثبت کردم (فوائد الفواد ص ۲)	ان پر حضرت شیخ کے ملفوظات کو لکھا۔

لفظ کرامتے بتاتا ہے کہ سفید کاغذوں کا ملنا ملفوظات کی اہمیت کے پیش نظر جو حضرت باباصاحبؒ کی توجہ ہی کا ثمرہ تھا اسی لیے اسے کرامتے سے تعبیر کیا ہے، اس گفتگو کے دوران حضرت محبوب الٰہیؒ نے یہ بھی فرمایا ہے۔

تا ایں غایت آں مجموعہ برمن	اب تک وہ مجموعہ ملفوظات
است۔ (فوائد الفواد ص ۲)	میرے پاس ہے،

حضرت محبوب الٰہیؒ نے ۲۸ شوال ۷۰۸ھ کی مجلس میں یہ ذکر کیا تھا۔ گویا کہ چالیس برس کا زمانہ گزر چکا تھا، مگر آپ نے اسے کلیجے سے لگائے رکھا تھا اس سے زیادہ ملفوظات کی اہمیت اور کیا ہو گی۔

[1] پروفیسر محمد حبیب مرحوم نے اس جملے کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ ایک شخص نے سفید کاغذ جلد بندھا ہوا مجھے دیا (حضرت نظام الدین اولیاء۔ حیات وتعلیمات ص ۶۸) یہ ترجمہ صحیح نہیں ہے۔ عبارت میں کاغذ ہا ہے جو واحد نہیں جمع ہے، اس امتیاز کو نظر انداز کرنے سے ترجمہ خلاف محاورہ ہو گیا ہے۔ تاہم اس سے یہ واضح ہے کہ مرحوم کو اردو و فارسی اسالیب سے کتنی آگاہی تھی؟

اس مجموعہ کے رواج میں آنے کی اطلاع ہمیں شمائل الاتقیاء و دلائل الاتقیاء[1] سے ملتی ہے، جس کو حضرت محبوب الٰہیؒ کے بزرگ خلیفہ شیخ برہان الدین غریبؒ (المتوفی ۷۳۸ھ/1336ء) کے ایما سے ان کے فاضل ترین مریدہ مولانا رکن الدین کاشانیؒ دبیر نے تصنیف کیا تھا، اس میں متعدد کتب ملفوظات کی فہرست ہے، جس میں یہی مجموعہ ملفوظات راحت القلوب کے نام سے موجود ہے، جو اس کے مستند اور معتبر اور مقبول و مروج ہونے کی بین دلیل ہے، اس مجموعہ ملفوظات راحت القلوب کی متعدد روایتیں کتاب مفاتح الجنان[2] میں بھی ہیں جو مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے مرید و معتبر عالم محمد مجیر وجیہہ ادیبؒ کی تصنیف ہے۔ اور جو ۷۵۶ھ/1355ء کی یادگار ہے۔

ایسے بیانات اور بھی ہیں، جن سے ملفوظات مشائخ کی اہمیت و افادیت واضح ہے، حضرت بابا صاحبؒ کے ایسے ہی ایک بیان کا اعادہ حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا ہے، جو افضل الفوائد (ص ۱۱۱-۱۱۲) کی زینت ہے، الغرض اخلاق و سلوک میں ملفوظات کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ اگر انھیں صحت کے ساتھ مرتب کر کے شائع کیا جائے تو وہ آج بھی ہمارے دکھ کی دوا ہیں، اور آئندہ بھی۔

---

[1] ایک فاضل نقاد نے نام شمائل الاتقیا و دلائل الاشقیا لکھا ہے، (منادی دہلی جلد ۵۲ شمارہ ۶ تا ۸ ۱۹۷۷ء) جو غلط ہے، اس کا ایک نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے ذخیرۂ مخطوطات میں ہے جو فارسی مخطوطات کی کیٹلاگ مطبوعہ ۱۹۲۴ء ص ۱۷۵ میں ۱۱۹۷ نمبر پر ہے جو ۱۱۰۰ھ کا مکتوبہ ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ جو ۱۲۶۷ھ/1851ء کا مکتوبہ مفتی امروہہ حضرت مولانا نسیم احمد صاحب فریدی نے مستعار مجھے دیا تھا جس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔ یہ کتاب ۱۳۴۷ھ/1928ء میں حیدر آباد سے شائع بھی ہو چکی ہے ۔۔ ۱۲

[2] مفاتح الجنان کا ایک قلمی قدیم نسخہ راقم کے پاس ہے، ایک نسخہ مفتاح الجنان نام سے ذخیرۂ مخطوطات ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں ہے جو کیٹلاگ مطبوعہ ۱۹۲۴ء کے ص ۴۸۹ پر ہے۔ اور جو ۱۱۰۰ھ کا مکتوبہ ہے۔

۳۔ملفوظ و ملفوظات | ملفوظ اور اس کی جمع ملفوظات کا معنی معروف میں استعمال زمانۂ قدیم سے ملتا ہے، خیر المجالس تالیف ۷۵۶ھ/1354 میں اور مفاتح الجنان تالیف ۷۵۶ھ/1355 میں بھی متعدد جگہ ذکر ہے، سیر الاولیاء اولین اور قدیم ترین تذکرہ ہے، اس میں بھی ملفوظ و ملفوظات کا استعمال جا بجا ملتا ہے ۔ مثلاً

خیر المجالس

(۱) ملفوظ مولانا برہان الدین بیاری (صفحہ ۱۰)

(۲) در ملفوظ خواجہ عثمان ہرونی مشکلے شدہ است (صفحہ ۵۲)

(۳) ملفوظاتِ شیخ قطب الدین و شیخ عثمان ہرونی (Harwani) (صفحہ ۵۳)

مفاتح الجنان

(۱) از ملفوظ شیخ المشائخ و الاولیا فرید الدین قدس سرہ العزیز (ورق ۳۴)

(۲) از ملفوظ شیخ الاسلام فرید الدین قدس سرہ العزیز (ورق ۱۱۶)

(۳) از ملفوظ شیخ الاسلام شیخ فرید الدین قدس اللہ سرہ العزیز (ورق ۲۳۰ ب)

سیر الاولیاء

(۱) بعضے ملفوظاتِ شیخ شیوخ العالم فرید الحق ..... قدس سرہ العزیز سلطان المشائخ قدس سرہ العزیز بخطِ مبارکِ خود در قلم آوردہ (ص ۷۴)

(۲) بزرگے از ملفوظاتِ شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین قدس سرہ العزیز پانصد کلمہ جمع کردہ است ۔ (ص ۷۶)

(۳) خواجہ شمس الدین دھاری ..... از ملفوظاتِ سلطان المشائخ کتابے نوشت ۔ (ص ۱۱۸)

(۴) از ملفوظات جہاں بخشِ سلطان المشائخ کتابے نبشتہ است و انوار المجالس نام کردہ است ۔ (ص ۲۰۰)

(۵) در آخر عمر فوائد الفواد کہ ملفوظاتِ سلطان المشائخ است بخط مبارک خود نوشت۔ (ص ۲۷۸)

(۶) از ملفوظاتِ روح افزائے سلطان المشائخ فوائد چند نبشت ....
.... امروز فوائد الفواد مقبول اہل دلانِ عالم شدہ است[1] - (ص ۳۰۸)

(۷) امیر خسرو کرات گفتے ..... کاشکے تمامی کتب کہ عمر دراں صرف کردہ ام برادرم امیر حسن را بودے و ملفوظات سلطان المشائخ کہ جمع کردہ او ست مرا بودے (ص ۳۰۸)

(۸) در ملفوظات شیخ المشائخ معین الدین سنجری (س ن ج ری) نبشتہ دیدہ ام (ص ۴۶۶)

(۹) در ملفوظات شیخ الاسلام معین الدین سنجری نبشتہ دیدہ ام (ص ۴۹۱)

لفظ ملفوظ و ملفوظات معنی معروف میں زمانۂ قدیم سے مروج ہیں، ان کے علاوہ دیگر کتب قدیمہ میں بھی ملتے ہیں، انھیں اختراع جدید تصور کرنا صحیح نہیں ہے، بہرحال ان اقوال و شواہد سے ان الفاظ کا رواج اور ان کی قدامت بخوبی واضح ہے ـــ

کتب ملفوظات کی تدوین | سعادت مند مرید اور معتقدین جن میں نوشت و خواند کا ذوق ہوتا تھا، وہ ان بیانات کو قلم بند کر لیا کرتے تھے۔ جو اپنے شیخ

---

[1] پروفیسر محمد حبیب مرحوم نے کتاب حضرت نظام الدین اولیاء حیات و تعلیمات ص ۸ میں لکھا ہے کہ امیر خورد یہ کہتے ہیں کہ حضور کے کئی مریدوں نے امیر حسن سجزی کی طرح حضور کے ملفوظ جمع کیے مگر فوائد الفواد کی طرح وہ مقبول نہیں ہوئے اور ہم تک نہیں پہنچے۔ آخری جملہ خصوصیت سے خلاف واقعہ ہے۔ امیر خورد نے کہیں یہ نہیں لکھا کہ وہ ہم تک نہیں پہنچے۔ سیر الاولیاء میں انوار المجالس سے ایک روایت منقول ہے (سیر الاولیاء ص ۲۷۹) اس طرح بعض دیگر ملفوظات سے بھی منقول روایات ملتی ہیں۔

بزرگ سے سنتے تھے، تاکہ انھیں پیش نظر رکھیں، ان کے مطالعہ سے مستفید ہوتے رہیں، اور فیوض و برکات حاصل کرتے رہیں، بعض دورانِ بیان ہی میں لکھتے جاتے تھے، اور بعض یاد داشت کی مدد سے مرتب کر لیا کرتے تھے، حضرت محبوب الٰہیؒ کے بیان سے مترشح ہے کہ آپ دوران بیان ہی میں قلمبند کر لیا کرتے تھے۔ اور فوراً بعد ہی نہایت شوق و اہتمام سے کتاب میں لکھ لیا کرتے تھے جو ملفوظات کے لیے مخصوص تھی۔ حضرت محبوب الٰہیؒ کو حضرت بابا صاحبؒ سے جو والہانہ شغف اور قلبی لگاؤ تھا، جس کے معترف حضرت بابا صاحبؒ بھی تھے (فوائد ۲، ۱۷) اس کا اقتضا یہی تھا کہ ہاتھوں ہاتھ اس کو انجام دیں۔ وہ کب یہ بات گوارا کر سکتے تھے کہ التوا میں ڈالے رہیں، اور جب دلّی جائیں تو مرتب فرمائیں۔ یہ بعید از قیاس ہے۔ الغرض کتب ملفوظات کو مرتب کرنے کا دستور قدیم سے ہے، اس کا تعلق ذوق و ارادت سے ہے، نشر و اشاعت سے نہیں۔ صوفیائے کرام مستثنیٰ حالات کے سوا ایسے امور میں محتاط رہتے تھے، جو نام و نمود کا سبب ہوں، غالباً یہی سبب تھا کہ حضرت بابا صاحبؒ کے ملفوظات جو حضرت محبوبِ الٰہیؒ نے مرتب فرمائے تھے، مدت مدید تک آپ کے پاس محفوظ رہے، مگر ان کے رسمی نشر و اشاعت کی طرف آپ متوجہ نہیں ہوئے۔ آج کس سے یہ بات بن پڑتی ہے، اس زمانے میں ایسا صبر و ضبط عنقا ہے۔

حضرت محبوب الٰہیؒ نے اپنے شیخ محترم کے ملفوظات کو کچھ اس طرح مرتب فرمایا ہے، کہ دیرینہ اثرات کے باوجود اس میں حضرت بابا صاحبؒ کی معجز بیانی کی آب و تاب جا بجا جلوہ ریز ہے۔ جو مطالعہ کرنے والے کے دامن دل کو پکڑ لیتی ہے۔ اسلوب بیان دیگر کتب ملفوظات سے مختلف سادہ اور سلیس اور جاذبِ توجہ ہے، یہ اسی اخلاص کا ثمرہ تو ہے جو حضرت محبوب الٰہیؒ کو

حضرت بابا صاحبؒ کی جناب میں تھا شیخ محترم کا ایسا متوالا کوئی دوسرا انہیں ملتا
غرض کہ کسی پہلو سے جائزہ لے لیجیے ملفوظات اور ان کی تدوین کی اہمیت
روزِ روشن کی طرح جگمگاتی نظر آئے گی۔

تدوینِ ملفوظات کے باب میں یہ نکتہ بھی ذہن نشین رکھنے کے لائق ہے کہ کتب
ملفوظات کو مرتب کرنے والے کتنے ہی عالم و فاضل کیوں نہ ہوں، مگر وہ راہِ سلوک
میں مبتدی ہی ہوتے تھے، وہ خیالات کو ہو بہو گرفت میں لانے کی سعی کرتے ہوں گے
مگر کیا ضروری ہے کہ وہ اپنی کوشش میں کامیاب بھی ہوتے ہوں، مشاہدہ شاہد ہے
کہ مقرر جتنا سحر بیان ہوتا ہے تقریر جس قدر جامع اور دلپذیر ہوتی ہے، اتنا ہی
اس کا ہو بہو اور لفظاً بلفظ گرفت میں آنا دشوار ہوتا ہے، ذہن و فہم اور علمی استعداد
کے علاوہ مشق و مہارت، اور کمالِ انشا پردازی کو بھی اس میں بڑا دخل ہے، تاوقتیکہ
قلم و زبان پر قدرت نہ ہو اس فرض سے عہدہ برآ ہونا کارے وارد ہے۔
کتنے ہیں وہ مجموعۂ ملفوظات جنھیں قدامت کی سند حاصل ہے، بہت سے ناپید
ہوگئے ہیں، کچھ ہیں جو ایسے است کہ مسمّیٰ ندارد کی مصداق ہیں۔ البتہ جن میں خلوص
اور کمالِ فن کا پرتو ہے، وہ ہیں مگر عقیدتمندوں کی بے اعتنائی سے ہدفِ تنقید بنے
ہوئے ہیں ؏ قیاس کن زخزانِ من بہارِ مرا

۵ تقریر و تحریر | تقریر و تحریر کے اسلوب میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔
اہلِ علم اس نکتے سے آگاہ ہیں کہ حشو و زائد اور اعادہ و تکرار تقریر میں نبھ جاتے ہیں،
بلکہ بعض اوقات ان سے تقریر میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ ادنیٰ سے تصرف سے
تقریر دلوں کو موہ لیتی ہے، مقرر کا اسلوب اختصاصی شے ہے، جو مجمع کے مزاج کے
مطابق ہوتا ہے، دورانِ تقریر میں مقرر کی وجدانی کیفیت غیر شعوری طور پر اثر انداز
ہوتی اور مجمع کو مسخر کر لیتی ہے۔ جو احاطۂ تحریر میں سما نہیں سکتی۔ مجمع جب

جوش وخروش اور جذبے سے معمور ہوتا ہے تو خطیب ومقرر کے حرکات وسکنات اور چشم وابرو بھی کچھ کہنے لگتے ہیں، اور ایسے جذبات وکیفیات کی عکاسی کرتے ہیں جو انھیں کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہے، وہ پیکر ایثار وعمل بن جاتے ہیں لیکن قلم عاجز رہتا ہے، ان کیفیات کو گرفت میں لانے سے وہ تعدیۂ اثر کا ثمرہ ہوتی ہیں، الفاظ کے پیکر بے جان ہیں ان کی تلاش سعیِ لاحاصل ہے۔ نظامی گنجویؒ کے کلام سے اس کی تائید ہوتی ہے، وہ فرماتے ہیں۔

زگفت ومن شنودم ہر آنچہ گفتنی داشت ۔۔۔ کہ در بیان نگہش کرد بر زبان تقدیم

لبش چوں نوبت خویش زنگاہ باز گرفت ۔۔۔ فتاد سامعہ در موج کوثر وتسنیم

اس نے نہیں کہا مگر جو کچھ اسے کہنا تھا، وہ میں نے سن لیا سمجھ لیا۔ دورانِ تقریر میں اس کی نگاہ نے زبان کھلنے سے پہلے ہی مجھ سے کہہ دیا تھا، جب ہونٹوں نے نگاہ سے اپنی باری لی اور زبان سے بات نکلی تو ایسا لگتا تھا کہ قوت سامعہ بلکہ دل ودماغ کوثر وتسنیم کی لہروں میں بہے جاتے ہیں۔

مرزا غالب فرماتے ہیں ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا ۔۔۔ میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ماہرینِ نفسیات اس پر متفق ہیں کہ تقریر اپنے مناسب ماحول میں جس قدر مؤثر اور دلپذیر ہوتی ہے، اس کے عشر میں نہیں ہوتی، خصوصاً وہ تقریر جس میں سامعین کی کامل توجہ اور مقرر کے اسلوب کی کارفرمائی اور تعدیہ اثر کو دخل ہوتا ہے۔ بے پناہ اور ہر گرفت سے بالاتر ہوتی ہے، جس کا راز اس کے اشارات واجمال میں مضمر ہوتا ہے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ کا ارشاد ہے:۔

كَلَامُنَا اِشَارَةٌ فَاذَا صَاد ۔۔۔ ہمارا کلام اشاروں میں ہے

عِبَارَۃٌ مَادَجَفْنًا ۔ جب وہ عبارت کے روپ میں
(احسن الاقوال ص ۱۲) آتا ہے تو خشک ہو جاتا ہے ۔

گویا وہ لطافت جو تقریر میں ہوتی ہے، تحریر میں برقرار نہیں رہتی یہ بہت بلیغ اشارہ ہے ۔ اور یہ وہی شخص کہہ سکتا ہے جو تقریر کی نفسیات سے کما حقہٗ آگاہ ہے، لہٰذا کسی مجموعۂ ملفوظات میں تقریر کے مبینہ موثرات کی تلاش بے سود ہے، ملفوظات کا وصف یہ ہے کہ صدہا سال گزر جانے کے باوجود اور عقیدتمندوں کی بے اعتنائی کے باوجود طبائع ان سے متاثر اور کیف اندوز ہوتی ہیں ۔ مرزا غالب کا یہ کہنا بھی بجا اور درست ہے ؎

حسن فروغ شمع سخن دور ہے اسدؔ پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

وہ دل و دماغ جو مبتلائے مادیت ہیں ۔ وہ روحانی فضا سے کوسوں دور ہیں ان میں باہم بعد المشرقین ہے ۔ ان سے چشم امید رکھنا بے سود ہے، یہ بھی اس باب میں ایک اہم نکتہ ہے کہ بعض تقریروں کے بعض جملے ایسے سحر آگیں ہوتے ہیں جو سالہا سال بلکہ صدیوں تک محفوظ رہتے ہیں، اور سننے والوں پر جادو کا سا اثر کرتے ہیں ۔ انھیں مستثنیات میں سمجھنا چاہیے ۔ تقاریر جو شائع ہوتی ہیں، جو راز درون پردہ سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں وہ بعینہٖ ہی اسٹیج کی آواز نہیں ہوتیں، بلکہ انھیں حک و اصلاح سے تحریر کے سانچے میں ڈھالا جاتا ہے، البتہ انداز تخاطب کی رعایت ملحوظ رہتی ہے، فوائد الفواد میں بعد ازاں فرمود، گفتے اور آن گاہ فرمود کی پیوند کاری بھی اسی کی تائید ہے، الغرض، تقریر اور مجامع کی کیفیات سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے روح الاجتماع کا مطالعہ سودمند ہے، جو فرانسیسی ماہر نفسیات موسیو لیبان کی مشہور تصنیف کراوڈ کا ترجمہ ہے، اور دار المصنفین اعظم گڑھ سے شائع ہوتا رہا ہے ۔

۶۔ فوائد الفواد کا کمال | فوائد الفواد حضرت محبوب الٰہیؒ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جو خواجہ امیر حسن علا سنجریؒ (س ن ج ری) نے مرتب فرمایا تھا اس میں بقول امیر خورد کرمانیؒ حضرت محبوب الٰہیؒ کے اسلوب کو برقرار رکھنے کی امکانی کوشش کی گئی ہے۔ "عین تقریر سلطان المشائخ بقدر امکان رعایت کرد" (ص ۳۰۸) اس میں "بقدر امکان" قابلِ لحاظ ہے، کیونکہ مولف نے جابجا بعد ازاں فرمود، آں گاہ فرمود اور گفتے کا سہارا لے کر عبارت کو مربوط کیا ہے جو غماز ہے کہ بقدر امکان ہی بعینہٖ تقریر کی رعایت ہے۔ خواجہ امیر حسن علا سنجریؒ بھی اس کے معترف ہیں اور لکھتے ہیں:۔

آنچہ ازاں شمع جمع ملکوت بسمع	جو کچھ حضرت محبوب الٰہیؒ سے
میرسید چہ عین لفظ مبارک او چہ	سنا میں نے آپ کے عین مبارک الفاظ
معانی آں بقدر فہم مختصر خود	میں یا اس کے مفہوم کو اپنی ناچیز
نوشتہ می شود (فوائد الفواد	سمجھ کے مطابق لکھا ہے۔

ص ۲ دیباچہ)

الغرض بقدر فہم مختصر خود۔ وہی ہے جس کا ذکر سطور بالا میں آچکا ہے۔ بہرحال بقول مولانا ضیاء الدین برنی یہ مجموعۂ ملفوظات اسی عہد سے مقبول و مروج ہے، جو امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں ہم تک محفوظ نہیں پہنچ سکا ہے کہیں تاریخ، دن اور مہینہ ہے، بیان ندارد (ص ۱۶۶) کہیں دن اور تاریخ میں مطابقت نہیں ہے، کہیں دن ندارد تو کہیں تاریخ ندارد۔ متن میں بھی خاصا کچھ خلفشار ہے، کہیں کسی کا نام کچھ ہے تو کہیں کچھ، کہیں محمد ہے تو کہیں احمد، کہیں مسعود ہے تو کہیں محمود یہ حال ہے اس مجموعۂ ملفوظات کا جو متداول چلا آتا ہے۔ اوروں کا تو ذکر ہی کیا۔

خواجہ امیر حسن علا سنجریؒ نامور شاعر و ادیب کہنہ مشق انشاء پرداز اور

باکمال اہل قلم تھے، انھوں نے ۲۸ شوال ۷۰۸ھ کی مجلس میں حضرت محبوب الٰہیؒ سے عرض کیا تھا :- از سالے زیادہ باشد کہ در بندگی پیوستہ ام۔ (ف ۳۰)

اس بیان سے یہ واضح ہے کہ خواجہ امیر حسن علا سجزیؒ ۷۰۷ھ/1307ء میں بیعت ہوئے تھے مولانا حامد جمالی کا بیان ہے کہ بیعت ہونے کے وقت خواجہ امیر حسن علا سجزیؒ کی عمر تہتر سال کی تھی[1] (سیر العارفین ص ۸۷) گویا کہ خواجہ امیر حسن علا سجزیؒ پختہ کار اہل قلم تھے۔ انھوں نے فوائد الفواد کو بڑی خوبی سے مرتب کیا۔ ان کے اخلاص اور خون جگر کی چاشنی لفظ لفظ سے مترشح ہے۔ انھوں نے دیدہ ریزی اور باریک بینی سے کام لیا۔ خون پسینا ایک کیا۔ نوک پلک کو سنوارا اور بیان کو اس خوبی سے مرتب کیا کہ تقریر کا اسلوب بھی برقرار رہا، اور حشو و زائد اور اعادہ و تکرار کی پرچھائیں بھی پڑنے نہ پائی، جو تقریر کے لوازم میں سے ہے۔

خواجہ امیر حسن علا سجزیؒ نے غالباً اس کام کے لیے اپنے کو فارغ بلکہ وقف کر لیا تھا، ان کا یہ شاہکار منھ سے بول رہا ہے کہ آخری ایام حیات کا ان کے لیے یہی دلچسپ مشغلہ تھا جس میں وہ ہمہ تن مشغول رہتے تھے۔ اس لیے فوائد الفواد کو مقبولیت بھی نصیب ہوئی اور حیات جاوید بھی، غالباً ان ہی تاثرات سے متاثر ہو کر (بقول شخصے کہ) خواجہ سید محمد حسینی گیسو درازؒ کو یہ کہنا پڑا تھا۔

ملفوظ شیخ نظام الدین کہ امیر حسن	حضرت محبوب الٰہیؒ کے ملفوظات جو امیر
شاعر جمع کردہ است آں معتبر است	حسن شاعر نے جمع کیے ہیں، وہ معتبر
و ملفوظہائے دیگر از اں شیخ نبشتہ	ہیں اور جو دوسرے ملفوظات آپ کے لکھے ہیں
اند ہمہ باد ہوا ست (جوامع الکلم	وہ سب باد ہوا ہیں (سطحی طلب کا ثمرہ
ص ۱۳۲ ملفوظ ۳ رمضان ۸۰۲ھ	ہیں خواہش بیجا کے تموج کا ثمرہ ہے)

[1] خواجہ حسن در آنچہ توبہ کرد ہفتاد و سہ سال عمر داشت ۔۔۔ کتاب فوائد الفواد بعد از اں در قلم آورد (سیر العارفین ص ۸۷) مگر یہ مدت عمر تحقیق طلب ہے۔

اس عبارت کے آغاز میں یہ بھی ہے کہ ملفوظات میں اکثر درست نہیں لکھا جاتا۔ ہر شخص اپنے فہم کے مطابق لکھ لیتا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہے کہ یاد ہوا سے مراد جعلی مجموعہ ملفوظات نہیں اور اس ارشاد کا مدعا بظاہر تو یہی ہے کہ خواجہ امیر حسن علا سجزیؒ نے جتنے ذوق و شوق اور جانسوزی سے فوائد الفواد کو مرتب فرمایا ہے ان کے معاصر اہلِ قلم اس باب میں ان کے ہم مرتبہ و ہم ردیف نہیں ہیں بلکہ انھیں ان سب پر فوقیت حاصل ہے مگر خواجہ گیسو درازؒ کا یہ اسلوب بیان نظرِ عقیدت میں کھٹکتا ہے اور چشم نمائی کرتا ہے۔ خواجہ گیسو دراز اپنے مرشد کے دوستوں اور حضرت محبوب الٰہیؒ کے نیاز مندوں کے لیے ایسے الفاظ کس طرح استعمال کر سکتے تھے، معلوم ہوتا ہے کہ نقل در نقل میں کچھ کا کچھ ہو گیا ہے سچ یہ ہے کہ یہ بیان خود رائی اور بے اعتنائی کا آئینہ لگتا ہے، اس میں نہ تحقیق ہے نہ کیف، نہ صوفیہ کے کلام کی سی لذت نہ انکسار، حضرت گیسو درازؒ تو بڑی چیز ہیں کسی معمولی اہلِ دل سے بھی ایسے کلام کی توقع نہیں کی جا سکتی، اس میں ایسا کچھ ہے، جو ذوق کو گراں گزرتا ہے مثلاً

(۱) حضرت محبوب الٰہیؒ کو شیخ نظام الدین سے یاد کیا ہے اس کے برعکس ان کے پیر و مرشد مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے جب کبھی یاد فرمایا ہے۔ نہایت احترام سے یاد فرمایا ہے۔ حتیٰ کہ مطالعہ کرنے والے تک متاثر ہوئے اور سر تسلیم خم کیے بغیر نہیں رہ سکتے، مگر خواجہ گیسو درازؒ کا بیان اس وصف سے معرا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ کسی معمولی شخص کا ذکر کر رہے ہیں،

(۲) خواجہ امیر حسن علا سجزیؒ کوئی ایسے ویسے شاعر نہیں تھے، یکتائے روزگار اور بے مثل شاعر گزرے ہیں، حضرت امیر خسرو جیسے باکمال انھیں برادرم امیر حسن کہہ کر یاد کرتے تھے[1]، راج دربار میں انھیں وقار حاصل تھا، درویشی میں بھی آپ اپنی مثال تھے[2]، حضرت محبوب الٰہیؒ کے نیاز مند مخلص اور یارانِ اعلیٰ میں سے تھے، اور وہ ایسی کتاب کے

---

[1] سیر الاولیاء ص ۳۰۸ [2] خیر المجالس ص ۱۸۶

مولف و جامع ہیں جو یادگارِ زمانہ ہے، اور آج تک مشعلِ راہ ہے، خواجہ امیر حسن علا سنجریؒ ہر اعتبار سے لائقِ احترام ہیں، ایسے شخص کو صرف امیر حسن شاعر کہہ دینا کہاں تک روا ہو سکتا ہے۔ اور اسلام و تصوف اس کی کہاں تک اجازت دیتا ہے۔

(۳) علت و سبب بتائے بغیر یہ حکم لگانا کہ یہ بادِ ہوا ست کہاں تک معقولیت پر مبنی ہے۔ مذاقِ تصوف اسے کہاں تک برداشت کرتا ہے، حضرت امیر خسروؒ ایک نہیں دو مجموعۂ ملفوظاتؒ[1] کے مولف ہیں، حضرت محبوبِ الٰہیؒ کے نو عمری کے ساتھی (ص ۱۰۸) حضرت محبوب الٰہیؒ کو جان سے زیادہ عزیز (۳۰۲) اور حضرت محبوب الٰہیؒ کے مخلص و جان نثار، وہ بادشاہوں سے وابستہ تھے، مگر شہنشاہِ دین پر قربان تھے، وہ سر دے سکتے تھے، اپنے حضرت سے راز مخفی نہیں رکھ سکتے تھے[2]۔ درویشی میں ان کا مقام اللہ اکبر کون بتا سکتا ہے کہ کیا ہے؟

در کفے جامِ شریعت در کفے سندانِ عشق ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

حضرت امیر خسروؒ پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ زندگی کا کوئی بھی گوشہ چھپا نہیں رہا ہے۔ آپ کی پوری زندگی نظروں کے سامنے ہے، کوئی کہہ سکتا ہے کہ بادِ ہوا کا کوئی جھونکا انھیں چھو کر نکلا ہے۔ اگر ایسے ایسے بادِ ہوا کی لپیٹ میں آگئے تو وائے برحالِ ما و شما۔

گر نظر صدق را نام گنہ می نہی حاصلِ ما ہیچ نیست جز گنہ اندوختن

ملفوظات کا شمار عبادتِ متعدی میں ہے، لازمی نہیں۔ اس کے لیے اخلاص بھی درکار نہیں، پھر بادِ ہوا اور خواہشاتِ دلی کا تموج کیا بگاڑ سکتا ہے، اور بادِ ہوا کا اطلاق ان پر کیسے ہو سکتا ہے۔

یہ محل نہ تنقید کا مقتضی ہے نہ تفصیل کا بسبیل تذکرہ کچھ باتیں زبانِ قلم پر آگئی ہیں، بلاشبہ آئندہ کا نقاد جب خواجہ گیسو درازؒ کے اسلوب و بیان کا تجزیہ کر کے توازن کریگا۔

---

[1] حضرت امیر خسروؒ نے جو دو مجموعۂ ملفوظات مرتب فرمائے ہیں ان میں سے ایک کا نام افضل الفوائد ہے اور دوسرے کا نام راحت المحبین ہے۔ ان کے قلمی نسخے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔

[2] سیر الاولیا ص ۱۲۵

تو اسے تکلف ہوگا، تسلیم کرنے میں کہ یہ جملے خواجہ موصوف ہی کے فرمودہ ہیں، اور صحت کے ساتھ منقول ہوتے رہے ہیں۔ یہاں تو صرف اتنا کہنا ہے کہ فوائد الفواد میں حضرت محبوب الٰہیؒ کے اسلوب کو سنبھالے رکھنے میں خواجہ امیر حسن علاء سجزیؒ کے کمال فن کو بڑا دخل ہے، ورنہ تقریر کے ضبط تحریر میں آنے کے بعد اثرات و کیفیات کا برقرار رہنا کارے دارد ہے، اور ایسی توقع بے حاصل ہے۔ یہ بھی حادثہ ہے کہ کتاب فوائد الفواد بھی ہم تک محفوظ نہیں پہنچی ہے۔

۷ قلمی کتابیں | قلمی کتابوں کو ان کی قدامت کے اعتبار سے بلکہ گوناگوں اوصاف کی بنا پر قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اور وہ فی الواقع ہوتی بھی ہیں لائق قدر لیکن صحت کے اعتبار سے ان میں وہ خوبی نہیں ہوتی، جو مطبوعات کا وصف ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ صحت کا جو اہتمام مطبوعہ کتب کے لیے ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے، وہ قلمی کتب کے لیے ناممکن نہیں تو دشوار تر ضرور ہے۔ یہی سبب ہے کہ قلمی کتابیں جو متعدد نسخوں سے مقابلہ کرنے کے بعد شائع کی جاتی ہیں، ان میں حواشی ہوتے ہیں جو اختلاف نسخ کی نشاندہی کرتے ہیں، بعض جملے جو لکھنے سے کسی نسخے میں رہ جاتے ہیں، اور عبارت بے ربط ہو جاتی ہے، ان کا پتہ چل جاتا ہے، اور خامی رفع ہو جاتی ہے، اسی طرح الحاقی عبارتوں کی نشان دہی بھی ہوتی ہے یہ افسوس کی بات ہے کہ ابھی تک کتب ملفوظات میں سے خیر المجالس کے سوا کوئی کتاب صحت و مقابلہ سے مرتب ہو کر شائع نہیں ہوئی ہے۔ اور یہ بات عقیدت مندوں کے لیے سخت لائق ندامت ہے۔ فوائد الفواد بھی صحت و مقابلہ کی محتاج ہے جسے بہت اہم مانا جاتا ہے۔

۸ اختلاف نسخ | قلمی کتابوں کے مختلف نسخوں میں جو اختلاف پائے جاتے ہیں ان کے اسباب مختلف ہوتے ہیں مثلاً:۔

(۱) کوئی لفظ یا جملہ کاتب سے نقل کرنے میں رہ گیا۔ جب کسی نے پڑھا تو منقول عنہ وجود نہ ہونے کی صورت میں خود ہی کوئی مناسب لفظ یا جملہ لکھ دیا۔ یا یوں ہی رہنے دیا۔ بہر حال جو بھی تھا نقل در نقل ہوتا رہا مگر اصل سے مختلف ہو گیا۔

(۲) استاد زمانہ کے ہاتھوں کچھ عبارت مٹ گئی اور قابلِ خواندگی نہ رہی۔ ایسی صورت میں یا تو کسی نے اپنے صواب دید سے اس خلا کو پُر کر دیا۔ یا وہ یوں ہی نقل در نقل ہوتا رہا۔ جس سے مفہوم اصلی تک رسائی مشکل ہو گئی۔ نایابی کی صورت میں اسی کو غنیمت سمجھ لیا مگر بات کچھ سے کچھ ہو گئی ایسے تغیر و تبدل سے اختلافِ نسخ لاحق ہوتا ہے، جو صحت و مقابلے سے بہت کچھ رفع ہو سکتا ہے۔

(۳) یہ بھی ہوتا ہے کہ بعض اوراق اس قدر از کار رفتہ اور کرم خوردہ ہو جاتے ہیں کہ انھیں شامل رکھنا مزید ضرر کا باعث ہوتا ہے۔ لامحالہ انھیں نکالنا اور نظر انداز کرنا پڑتا ہے، اگر کتاب نایاب یا کمیاب ہے تو اسی ناقص الحال پر اکتفا کرنا پڑتا ہے جو کچھ محفوظ ہو سکتا ہے، محفوظ کر لیا جاتا ہے، میرے پاس بھی قلمی کتابوں کے کچھ اوراق ہیں، جو میں نے محفوظ کر لیے ہیں۔

یہ اور اس قسم کے متعدد اسباب ہوتے ہیں جن سے ناقص نسخے رواج پانے لگتے ہیں، جو تبرکاً نقل در نقل ہوتے رہتے ہیں اور اصل سے مختلف ہو جاتے ہیں۔ مگر ان پر بھی جعلی ہونے کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ نے امام ابو عبدالرحمٰن محمد سلمی نیشاپوریؒ کی مشہور کتاب طبقات الصوفیہ کے متعلق لکھا ہے۔

تصحیف و تحریف نویسندگان بجائے	لکھنے والوں کی تصحیف و تحریف
رسیدہ کہ در بسیاری از مواضع فہم	اتنی بڑھ گئی کہ بہت سے مقامات کا
مقصود بسہولت دست نمی دارد۔	یا عبارتوں کا مقصد بسہولت گرفت
(نفحات الانس ص ۳)	میں نہیں آتا۔

یہی حال مروجہ ملفوظات کا ہے مولانا جامیؒ نے اس دشواری سے چھٹکارا پانے کیلئے نفحات الانس[1]

[1] اذکار ابرار ترجمہ گلزار ابرار تالیف غوثی شطاریؒ کے مقدمہ نگار محمد ارشد قریشی صاحب نگران ادارہ اسلامک بک فاؤنڈیشن لاہور (پاکستان) نے یہ انکشاف جدید فرمایا ہے کہ نفحات الانس کے سینکڑوں صفحات لطائف اشرفی سے بغیر حوالہ نقل ہیں یا جو لائق التفات ہے۔ ۱۲

لکھی تھی جو اضافہ معلومات کے ساتھ طبقات الصوفیہ پر مبنی ہے۔ امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں قلمی نسخوں کی حالت کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے، پھر بھی انھیں غنیمت سمجھا جاتا ہے مشائخِ چشت کے ملفوظات کی بھی یہی کیفیت ہے۔ افضل الفوائد تالیف حضرت امیر خسروؒ کے ناشر کا بیان ہے :—

چونکہ کتاب منقول عنہ قلمی بسیار غلط بود۔ واز آخر یک ورق چناں کرم خوردہ بود کہ در خواندن نمی آید۔ لہٰذا کتاب موصوف درین جا تمام کردہ شد[1]۔ نیز در صحت ہم کوششِ تمام کردہ اید (افضل الفوائد ص ۹۶ حاشیہ مطبع رضوی دہلی ۱۳۰۵ھ)

ایسا لگتا ہے کہ فوائد الفواد کو بھی ایسے حالات سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ جلد چہارم کی ۲۵ ویں مجلس کا آغاز چہار شنبہ ۲۶ ماہ مذکورہ سے ہوا ہے، مگر یہی آغاز اور یہی انجام ہے، اور کچھ بھی نہیں ہے (ص ۲۶۶) بیان غالباً ضائع ہو گیا ہے، مگر ناشر نے کچھ نہیں بتایا۔

(۲) افضل الفوائد کے ناشر سید امیر حسن دہلوی مرحوم نے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ نسخہ جس سے مطبوعہ نسخہ منقول ہے، اغلاط سے بھرا ہوا تھا، ناشر نے ان اغلاط کو رفع کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اپنی کوشش میں کہاں تک کامیاب ہیں۔ اور ان کی اصلاح کہاں تک اصل کے مطابق ہے۔

(۳) ناشر کی اصلاحی کوشش کے باوجود یہ نسخہ بھی اغلاط سے پاک نہیں۔ املا کے علاوہ کہیں کہیں عبارت بے ربط ہے۔ تاہم ناشر لائقِ شکریہ ہیں، کہ انھوں نے کمیاب نسخہ فراہم کیا۔ اور ان کی اس سعی جمیل کے بدولت ہمیں بھی استفادہ کی سعادت نصیب ہوئی۔ اللہ پاک اجرِ عظیم عنایت فرماتے ہیں۔

---

[1] جناب مولا بخش صاحب ساکن بھٹنڈہ نے ۱۳۱۲ھ میں افضل الفوائد کا ترجمہ کیا تھا جو طبع ہوا اور دستیاب ہوتا ہے۔ اس میں اس آخری ورق کا ترجمہ بھی ہے، جسے ناشر نے کرم خوردہ بتایا ہے۔

تاریخی خلفشار | ملفوظات کے نسخوں میں عموماً سنین اور تاریخیں، مہینے اور دن ایسے ملتے ہیں جو تقویم کے مطابق نہیں ہیں، یہ نقص کسی ایک میں نہیں سب ہی میں پایا جاتا ہے حتیٰ کہ مشہور کتب تاریخ میں بھی یہ نقص ہے۔ مولانا ضیاءالدین برنیؒ کی تاریخ فیروز شاہی کے سنین کی سرسید مرحوم نے تصحیح فرمائی تھی۔ جو مطبوعہ کلکتہ کے حواشی میں موجود ہے۔ تاریخ فرشتہ نہایت متداول ہے، وہ بھی اس نقص سے مبرّا نہیں، حضرت بابا صاحبؒ کا سنِ وفات فرشتہ مطبوعہ نول کشور میں ۶۷۰ کی بجائے ۶۷۰ھ لکھا ہے قلمی نسخوں میں اس سے مختلف بھی ہے۔ یہ عام وبا ہے، اس کی بنا پر کس کس کتاب کو جعلی بتایا جا سکتا ہے، یہ صحیح ہے کہ تاریخی غلط اندراجات سے ملفوظات کے اعتماد کو نقصان پہنچتا ہے، مخالف نقطۂ نظر رکھنے والوں کو تقویت ہوتی ہے، ان ملفوظات میں تاریخ اور سن کے کچھ اندراج ملاحظہ ہوں۔

(۱) دن ہے مہینہ ہے، سنہ ہے۔ تاریخ ندارد (فوائد ص ۱۵۲-۲۲۵)

(۲) دن، تاریخ، مہینہ ہے، سنہ ندارد دبیان مجلس ندارد (فوائد ص ۱۶۶)

(۳) ایک ہی تاریخ دو مجلسوں میں ہے، مگر دن مختلف ہیں (فوائد ۱۰۶-۱۰۸)

(۴) ۲۳ر رمضان کی مجلس پہلے ہے ۱ر رمضان کی بعد میں ہے۔ دن مہینہ اور سنہ ایک ہی ہے (فوائد ص ۲۷-۲۹)

(۵) ۲۸ شوال پہلے ہے اور ۸ شوال بعد میں ہے۔ دن مختلف ہیں (فوائد ص ۲۴۳)

(۶) دن ہے سنہ ہے، نہ مہینہ نہ تاریخ،

(۷) دن مہینہ اور سنہ ہے تاریخ ندارد

(۸) دن تاریخ مہینہ ہے سنہ ندارد

(۹) دن ہی دن ہے نہ تاریخ نہ مہینہ نہ سنہ

(۱۰) دن تاریخ مہینہ سنہ سب کچھ ہے مگر سب غلط

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کا سبب کیا ہے؟ بظاہر تو سبب وہی ہے

جس کا ذکر آچکا ہے کہ کتابت کی غلطیاں اور دیرینہ روزی کے اثرات۔ ایک سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ سیر الاولیاء (ص ۹۱سطر ۲تا ۹) کی الحاقی عبارت کو کسی نے معتبر مان کر ترمیم کر لی ہے، بہرحال تاوقتیکہ صحت و مقابلہ سے ملفوظات مرتب ہوکر شائع نہ ہوں کسی کو اصل سبب قرار دینا قبل از وقت ہوگا۔

یہ واقعہ ہے کہ جب مسلمانوں پر کوئی نازک وقت پڑا ہے تو تصوف ہی نے دستگیری کی ہے، اور گرتوں کو سنبھالا ہے، جو مخالفین اسلام اس امر سے آگاہ ہیں، وہ طرح طرح سے صوفیانہ خیالات کی بیخ کنی کے درپے رہے ہیں، بظاہر کوئی تنظیم نہیں ہے بلکہ یہ از درون پردہ ہے، آج کل منادۂ پاک میں ملفوظات کے خلاف جو یورش بپا ہے ممکن ہے اس کے پس پشت بھی یہی جذبہ کارفرما ہو۔ آئندہ کا مورخ بتائے گا کہ راز درون پردہ کیا ہے۔

میرے نزدیک اس گراں قدر تہذیبی اور روحانی سرمایہ کے تحفظ کی کارگر تدبیر یہی ہے کہ کتب ملفوظات کو کمال صحت سے مرتب کرکے شائع کیا جائے، اور ان کے تراجم بھی مختلف السنہ میں شائع کیے جائیں، وہ عقیدتمند جو اولیاء اللہ سے عقیدت رکھتے ہیں اور زرکثیر صرف کرتے رہتے ہیں، اور اہل علم و بصیرت اگر متوجہ ہو جائیں تو یہ مشکل آسان ہو جائے۔ کہنے کا مدعا یہ ہے کہ ملفوظات کے خلاف جو ہنگامہ بپا ہے وہ اگرچہ پاور ہوا سہی لیکن تدارک ضروری ہے۔

ع کہہ دیا اقلاق نے کہنا جو تھا المختصر

۱۔ نقد و تنقید نقد و تنقید کا حق ادا نہیں ہوسکتا تاوقتیکہ کتب ملفوظات صحت و مقابلہ سے مدون ہوکر سامنے نہ آئیں۔ تنقید نگار کو اپنے موضوع سے ہمدردی اور دلچسپی ہونی چاہیے۔ محض تخریبی نقطۂ نظر سے لکھنا تنقید نہیں تنقیص ہے، جانب داری سے حق تنقید ادا نہیں ہوتا، کتب ملفوظات سے متعلق جو تنقیدیں بروئے کار آئی ہیں، ان میں اصول نقد و تنقید کو پوری طرح ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ تنقید نگاروں سے لغزشیں بھی ہوئی ہیں،

تاہم اس سے استفادہ کرنا چاہیے کہ اُن ہی کی بدولت اصلاح حالی کا رجحان بروئے کار آیا ہے۔ ؎

حاصل ہوئی آگاہی عشرت کدہ باطل سے ہم شمع اٹھا لائے سوئی ہوئی محفل سے

خدا کرے کہ اس رجحان کو عملی صورت میں آنا نصیب ہو۔

۱۱۔ عادت الٰہیہ ملفوظات کے مطالعے کے دوران یہ نکتہ بھی ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ عادت الٰہیہ یہ ہے کہ جس قوم و ملک کی حالت اس کی مقتضی ہوتی کہ ان میں کسی نبی کی بعثت ہو، تو نبی محترم کو ان اوصاف سے بالاتر اوصاف سے متصف فرما کر مبعوث فرمایا ہے۔ جن سے اس عہد کے ممتاز ترین اشخاص متصف تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ وعلیٰ نبیّنا الصلوٰۃ والسلام کو ساحری اور جادوگری کے عہد میں مبعوث فرمایا تو یدِ بیضا اور عصائے موسیٰ کا ایسا معجزہ عنایت فرمایا کہ جس کے مقابلے میں ساحری ہیچ ہو کر رہ گئی۔ اور ساحروں کی ہوا اکھڑ گئی۔

حضرت عیسیٰ علیہ وعلیٰ نبیّنا الصلوٰۃ والسّلام کو طب و حکمت کے عہد عروج میں مبعوث ہوئے، انھیں اس معجزے سے نوازا کہ وہ بحکم الٰہی اندھوں کو بینائی عطا فرماتے، کوڑھیوں کو شفا عنایت فرماتے اور مُردوں کو قُمْ بِاِذْنِ اللّٰہ کہہ کر زندہ کر دیتے تھے، ان کے سامنے اس عہد کے حاذق اطبا اور خواص الادویہ کے ماہر سپر انداز ہو گئے تھے۔

ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کلام پاک کا معجزہ عطا ہوا تھا، جس کے آگے فصحائے عرب عاجز و حیران تھے۔ جو اپنی شیوا بیانی کے مقابلے میں تمام عالم کو گونگا جانتے تھے، ان کو اعتراف کرنا پڑا۔ لَیْسَ ہٰذَا کَلَامَ الْبَشَرْ یہ کلام تو اس پایہ کا ہے کہ انسانی کلام اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچتا۔

اولیاء اللہ جو علوم ظاہری و باطنی سے مالا مال اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب و جانشین ہوتے ہیں اور انبیائے بنی اسرائیل کے مثل ہوتے ہیں[1]، جب انھیں کسی قوم

[1] عُلَمَاءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَاءِ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ (الحدیث)

کی خدمت تفویض ہوتی ہے، تو انھیں بھی ان اوصاف سے نوازا جاتا ہے جو اس قوم کے ممتاز ترین اشخاص کے اوصاف سے بالاتر ہوتے ہیں۔

خواجۂ بزرگ خواجہ معین الدین چشتیؒ کو ہندوستانی قوم کی خدمت تفویض ہوئی اور آپ ہندوستان تشریف لائے۔ تو اس عہد میں ہندوستانی اذہان، جوگیوں اور سنیاسیوں کے دامِ فریب میں جکڑے ہوئے تھے، جو فنِ ساحری میں کمال رکھتے تھے۔ جیپال جوگی اور شادی دیو سنیاسی سر فہرست تھے، انھوں نے خواجۂ بزرگ کو ناکام کرنے کے لیے جیسے جیسے جتن کیے وہ شہرۂ آفاق ہیں۔ آخر کار ناکام ہوئے، اور خواجۂ بزرگ کی غلامی میں پناہ لی۔

بزرگانِ چشتؒ جنھوں نے اس عہد میں اور اس کے بعد تقریباً ایک صدی تک ہندوستان میں رشد و ہدایت کی شمع روشن رکھی اور مخلوق کی خدمات انجام دیں۔ انھیں ایسے ہی حالات سے دوچار ہونا پڑا تھا، ان کے ملفوظات میں خرقِ عادت کا ہونا تعجب خیز نہیں بلکہ نہ ہونا حیرت انگیز ہے۔ انھیں نظر انداز کر کے کوئی مورخ و محقق اور نقاد نہ تو صحیح نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے۔ نہ صحیح طور پر استفادہ کر سکتا ہے۔

۱۲۔ **اخذ و اقتباس** | قلمی کتب سے اور ان کے ایسے نسخوں سے جو صحت و مقابلہ کے ساتھ شائع نہیں ہوتے ہیں۔ اخذ و اقتباس میں کامل شعور اور پوری احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ مصنف کے اسلوب اور اس کے رجحان سے کامل آگاہی درکار ہوتی ہے، تاکہ ہر وہ عبارت جو مصنف کے رجحان اور اس کے اسلوب کے مطابق نہ ہو۔ ذوقِ سلیم کی گرفت میں آجائے۔ اور الحاق و تحریف نظر سے اوجھل نہ رہے۔ یہ وصف پیدا ہوتا ہے ذوقِ سلیم، مطالعہ کثیر اور مصنف کے اسلوب کی آگاہی سے۔ ذہنِ رسا اور نظر دوربین بھی درکار ہوتی ہے، اگر اخذ و اقتباس میں پوری احتیاط سے کام نہیں لیا جائے گا تو الحاق بھی مقتبس ہو جائیں گے۔ مذہبیات سے متعلق وہ کتابیں جن سے

مختلف العقیدہ طبقات کو اختلاف رہا ہے، ان میں بھی الحاق و تحریف کا عمل ہو سکتا ہے ایسے بھی ہوئے ہیں جنھوں نے موضوع حدیثیں بنائی تھیں[1]۔ محفوظ ترین کتاب صرف اللہ ہی کی کتاب[2] ہے، جس کا وہ خود محافظ ہے، لہٰذا اخذ و اقتباس میں پوری احتیاط برتنی چاہیے۔

۱۳۔ بیانِ واقعہ | یہ نکتہ بھی ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ بیان واقعہ سے مراد واقعہ ہی نہیں ہوتا بلکہ اکثر و بیشتر وہ نتائج اور تاثرات مراد ہوتے ہیں جو اس سے متعلق ہوتے ہیں۔ ماہر زبان داں اس نکتے سے خوب واقف ہیں۔ مثنوی مولانا رومؒ، منطق الطیر، اور گلستان و بوستان اس وصف سے مالا مال ہیں، اس نکتے سے ناواقفیت واقعات کی تفہیم میں سخت مخل ہوتی ہے۔ ملفوظات میں بھی اسلوب کی یہ خوبی کارفرما ملتی ہے۔ اور دیگر علوم و فنون میں بھی۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے تفہیم القرآن کے باب میں فرمایا ہے۔

"ان تمام قصوں سے یہ مقصود نہیں کہ ان واقعات سے آگاہی ہو جائے بلکہ مقصود یہ ہے کہ ان سے سننے والوں کے ذہن شرک اور معاصی کی برائی کی جانب منتقل ہو جائیں۔" (الفوز الکبیر ص ۷۶)

مطالعۂ ملفوظات کے دوران اس نکتے کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ ورنہ ذہن واقعہ کی تہہ تک پہنچ نہ سکے گا۔ اور مقصود اصلی حاصل نہ ہو گا۔

۱۴۔ اساطیر الاولین | قرآنِ پاک میں جو قصے انبیاءؑ سابقین کے منقول ہیں، انھیں اس عہد کے یہود و نصاریٰ اساطیر الاولین سے تعبیر کیا کرتے تھے، قرآن پاک میں ہے۔

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا قَالُوا	جب ان کے سامنے ہماری آیتیں
قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَاءُ لَقُلْنَا	پڑھی جاتی ہیں، تو وہ کہتے ہیں کہ

[1] الموضوعات ابن حجر مکیؒ، الموضوعات الکبیر ملا علی قاریؒ سے موضوع احادیث کے متعلق معلومات حاصل ہو سکتی ہے۔ [2] إِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ط

مِثْلَ هٰذَا اِنْ هٰذَا اِلَّا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ (انفال-۳۴)
ہم نے سن لیا، ہم چاہیں تو ہم بھی ایسے قصے بیان کر دیں، یہ پہلوں کی کہانیاں ہیں

جن واقعات کو قرآن پاک میں دہرایا گیا ہے وہ مصدقہ ہیں، ان کے بیان کرنے میں تو کلام ہی نہیں، مگر ان کے علاوہ جو کچھ ہیں، وہ اساطیر الاولین ہی ہیں، جو یہود و نصاریٰ کا علمی سرمایہ ہیں، اگر ان میں شرک و کفر کی آمیزش نہیں ہے تو ان کے بیان میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے اور ان کے ذکر و اذکار کی ممانعت بھی نہیں ہے، ایسے ہی قصص و حکایات سے بہت سی ضرب الامثال اور کہاوتیں وجود میں آئی ہیں، مثلاً ہر فرعونے را موسیٰ، طوفان نوحؑ، لحن داؤدیؑ، صبر ایوبؑ، گریۂ یعقوبؑ، خر عیسیٰؑ ..... ان سے تلمیح اور استعارہ و کنایہ کا کام لیا جاتا ہے اور مختصر سے بیان میں بہت کچھ کہہ دیا جاتا ہے، مسلمانوں نے علمی مسائل میں کبھی تعصب و تنگ نظری سے کام نہیں لیا، وہ علم و حکمت کو اپنا ہی گم گشتہ سرمایہ تصور کرتے تھے[1]، اس باب میں ان کی سیر چشمی ہر کہیں جلوہ گر ہے، لہٰذا حسب ضرورت اساطیر الاولین سے بھی خاطر خواہ کام لیا جا سکتا ہے، اس میں کچھ مضائقہ نہیں، بشرطیکہ اسلامی تعلیمات کے خلاف نہ ہوں۔

۵۔ اسرائیلیات | انبیاء بنی اسرائیل علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بعض حالات و واقعات اور قصص قرآن پاک میں مذکور ہیں، ان کے علاوہ کچھ حالات اور قصص علمائے بنی اسرائیل کے علم میں تھے، ان میں بعض تو ایسے عالم تھے، جو باتوں کو چھپاتے تھے، بلکہ مقدس کتاب توریت میں تحریف کر دیا کرتے تھے، ان کی باتوں پر اگرچہ بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا، لیکن انکار کے لیے بھی کوئی دلیل نہ تھی، ان کے متعلق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یہ ہے:-

لَا تُصَدِّقُوْهُمْ وَلَا تُكَذِّبُوْهُمْ (الحدیث)
نہ تو ان کی تصدیق کرو اور نہ تکذیب کرو

[1] الحکمۃ ضالۃ المومن فحیث وجدھا فھو احق بھا (الحدیث)

بعض توریت مقدس کی پیشین گوئیوں پر غور کرتے اور حق کی تائید کرتے تھے، ورقہ بن نوفل اور عبداللہ بن سلام ایسے ہی حق پرستوں میں سے تھے، ایسے علماء بنی اسرائیل کے متعلق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے۔

حدثوا عن بنی اسرائیل	بنی اسرائیل سے بیانات نقل
ولا حرج، (الحدیث)	کرو اس میں حرج نہیں ہے،

لہٰذا بعض واقعات اور حالات اور قصص جو مفسرین نے علماء بنی اسرائیل سے نقل کیے ہیں اور جنھیں اسرائیلیات کہتے ہیں، ان سے استفادہ میں کچھ مضائقہ نہیں، بشرطیکہ ان کے اندر کوئی ایسی بات نہ ہو، جو انبیاء علیہم السلام کی شان اور اسلامی تعلیمات کے خلاف ہو، ان ہی کے متعلق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لا حرج فرمایا ہے لیکن جو روایات بنی اسرائیل سے متعلق نہیں، انھیں اسرائیلیات سے تعبیر کرنا صحیح نہیں، خرقہ وکلیم، کلاہ و طاقیہ کو اسرائیلیات میں شمار کرنا یا خرافات بتانا درست نہیں ہے، وہ دراصل علامات ہیں اصول سلوک کی پابندی کی، جیساکہ عہد حاضر میں بیج کی نوعیت ہے، جو درویش خلاف ورزی کرتا، تو اس سے یہ علامات ضبط کر لی جاتی تھیں۔

۱۶۔ یوسف زلیخا حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے کی تصدیق قرآن پاک سے ہوتی ہے، قرآن پاک میں اس قصے کو احسن القصص کے لقب سے ذکر کیا گیا ہے، جتنا کچھ قرآن پاک میں ہے، وہ جامع اور مستند ہے۔ مگر اس قصے کی بعض روایات سے اہل کتاب کے علماء واقف تھے، اگرچہ ان کا مقام وہ نہیں جو قرآن پاک کے بیان کا ہے، تاہم اس میں شرک و کفر کی آمیزش بھی نہیں ہے، اس لیے حَدِّثُوا عَن بَنِیْ اِسْرَائِیلَ وَلَا حَرَجَ کے حکم میں داخل ہیں، بعض علماء اسلام خصوصاً مفسرین نے ان روایات کو جس طرح

لہ حجۃ الاسلام امام محمد غزالیؒ تفسیر یوسف میں لکھتے ہیں:- (بقیہ اگلے صفحہ پر)

سا نقل کردیا ہے، صوفیائے کرام نے بھی ان روایات سے استفادہ کیا ہے۔

سیّد علی ہجویریؒ حضرت داتا گنج بخش لاہوریؒ (المتوفی ۴۶۵ھ / ۱۰۷۲ء) لکھتے ہیں:-

چوں یوسف بالعقوب رسید، خداوند وی را وصال یوسف کرامت کرد، زلیخا را جوان کرد، باسلام راہ نمود و بزنی یوسف داد، یوسف قصد وے کرد، زلیخا از وے گریخت، ... ... (کشف المحجوب ص ۲۴۲)

جب حضرت یوسف حضرت یعقوب کے پاس پہنچے، اور اللہ پاک نے انھیں یوسف سے ملایا، زلیخا کو جوان کیا اور اسلام قبول کرنے کی توفیق دی اور حضرت یوسف کی زوجہ بنایا یوسفؑ نے ان کا ارادہ کیا تو زلیخا نے آپ سے گریز کی ... ۱؎

(بقیہ گذشتہ صفحہ ۵۳ کا) فعقد بینهما یعقوب علیه السلام ... فلما انتصف اللیل جاء یوسف ودق علیها الباب فقالت ارجع فقد تغیرت الحالة و انا وجدت من هو خیر منك فكسر الباب ودخل علیها وتعلق بها فهربت ومزقت قمیصها فنزل ملك من السماء و قال یا یوسف فیه خذف محبة بمحبة وطلب بطلب وعشق بعشق وهرب بهرب وتمزیق بتمزیق الخ (احسن القصص ص ۲۴۹--۲۵۰ مطبوعہ مطبع خادم الاسلام دہلی)

حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان دونوں کا نکاح پڑھایا... آدھی رات ہوئی تو حضرت یوسفؑ نے آکر دروازہ کھٹکھٹایا حضرت زلیخا نے کہا کہ آپ واپس چلے جائیے کیونکہ اب میری حالت بدل چکی ہے میں نے اسے پالیا ہے جو آپ سے بہتر ہے یعنی خدائے پاک کو پالیا ہے۔ حضرت یوسفؑ دروازہ توڑ کر اندر گئے اور حضرت زلیخا سے لپٹ گئے وہ ان سے بھاگیں حضرت یوسفؑ نے حضرت زلیخا کا کرتا پھاڑ دیا فوراً ہی آسمان سے فرشتہ اترا اور کہا کہ اے یوسفؑ یہ ادلا بدلا ہے محبت کے بدلے محبت، طلب کے بدلے طلب عشق کے بدلے عشق، بھاگنے کے بدلے بھاگنا اور کرتہ پھاڑنے کے بدلے کرتہ پھاڑنا۔

حجۃ الاسلام کی یہ کتاب نایاب تھی عم محترم الحاج الحافظ حکیم سرفراز الرحمٰن مرحوم کو دستیاب ہوئی تو انھوں نے خود نوشتہ ترجمے کے ساتھ اب سے کوئی پچاس ساٹھ برس پہلے طبع کرلیا تھا یہ اب بھی کم یاب ہے۔ اس کا جو نسخہ والد مرحوم کے پاس تھا وہ اب میرے حقیقی بھانجے آغا سید منصور احمد [illegible] صاحب کے پاس ہے۔ اسی سے میں نے یہ اقتباس لیا ہے جس کے لیے میں شکر گزار ہوں۔

مولانا جامیؒ نے مثنوی یوسف زلیخا کو اسی آب و رنگ سے رشکِ بہار بنایا ہے۔ فرماتے ہیں،

(۱)

چوں فرماں یافت یوسفؑ از خداوند | کہ بندد با زلیخا عقد پیوند
بقانونِ خلیلؑ و دینِ یعقوبؑ | بر آئینِ جمیل و صورتِ خوب
زلیخا را بعقدِ خود در آورد | بعقدِ خویش یکتا گوہر آورد
چو صدقش بود بیرون از نہایت | بآخر کرد در یوسفؑ سرایت

(۲)

شبے از چنگ یوسفؑ شد گریزاں | خلاصی جست از قفائے زلیخا خیزاں
چو زد دست از قفا در دامن او | ز دستش چاک شد پیراہن او
زلیخا گفت اگر من بر تنِ تو | دریدم پیش ازیں پیراہنِ تو
تو ہم پیراہنم اکنوں دریدی | بپاداشِ گناہِ من رسیدی

حضرت یوسفؑ اور حضرت زلیخا کے نکاح کا ذکرِ خیر ہمارے ادب و تصوف اور اسلامی روایات کی زینت ہے، حضرت باباصاحبؒ کی زبانِ مبارک پر بھی آیا ہے، آپ نے غلبات شوق میں ارشاد فرمایا ہے،

"چوں مہتر یوسف علیہ السلام پیغامبر صلوٰۃ اللہ علیہ زلیخا را بخواست و زلیخا در دینِ مہتر یعقوبؑ پیغامبر در آمد، بعد ازاں زلیخا بخدائے تعالیٰ مشغول شد، چنانچہ می آرند آں روز کہ مہتر یوسف پیغامبر علیہ السلام دنبالہ زلیخا کردے، وا داز پیش بگریختے و دست در زدے، آں گاہ مہتر یوسفؑ از زلیخا پرسید و گفت، روزے آں بود کہ دنبال ما می کردی، و من از پیش تو می گریختم، و یک روز ایں ست کہ دنبال تو می کنم و تو از من می گریزی، دریں امر حکمت چیست؟ بگو۔ زلیخا گفت، اے یوسفؑ آں روز با خدائے تعالیٰ

آشنائی نداشتم، واز پرستش او دور بودم، جز تو آشنائے دیگر نمی دانستم
ضرورتاً با تو آویزش داشتم، اما دریں زماں کہ حق تعالیٰ را بشناختم و در
پرستش او مشغول شدم واز مجاہدہ بمشاہدہ او تافتم و دوستی او در دلِ من
جائے گرفت، پس اے یوسف تو وصد ہزار بہتر از تو در نظر من نہ باشد
چوں مرا با حق تعالیٰ الفت شد، اگر بعد ازیں با غیر او الفت گیرم، مدعی
در دروغ زن بودم، نہ صادق در محبت' (اسرار الاولیاء ص ۷)

اس مختصر سے بیان میں کئی جملے ایسے ہیں، جو بے ساختہ زبان سے نکل گئے ہیں،
جو بیان کی جان اور روح رواں ہیں، اور ایسے ہی بزرگ کی زبان سے نکل سکتے ہیں
جو توحید و حق شناسی کی نعمت سے مالا مال ہو، اور وہ یہ ہیں:-

"ازیں زماں کہ حق تعالیٰ را بشناختم - در پرستش او مشغول شدم - از
مجاہدہ بمشاہدہ او تافتم - چوں مرا با حق تعالیٰ الفت شد - اگر بعد ازیں
با غیر از الفت گیرم، مدعی و در دروغ زن بودم۔"

ہر کس و ناکس کی زبان سے یہ جملے نہیں نکل سکتے، ان میں ایسا کیف ہے کہ ہر
صاحبِ ذوقِ سلیم کو آج بھی متوالا بنا دیتے ہیں، اُن کی کیفیت انکی صداقت کی روشن دلیل
ہے، اور لائقِ تسلیم ہے، مگر ان روایات کے متعلق اور اس جیسی دوسری روایات کے
متعلق عہدِ حاضر کے ایک تنقید نگار کا بیان ہے:-

"بد احتیاطی اور کم علمی کی وجہ سے جا بجا ایسی باتیں بکثرت آگئی ہیں جو اصول
تصوف کے خلاف ہیں، بلکہ اکثر تعلیماتِ اسلامی کے منافی ہیں جن کا انتساب
کسی بھی درویش سے درست نہیں ہو سکتا، چہ جائیکہ انھیں حضرت بابا فرید
گنج شکر علیہ الرحمہ کی ذاتِ گرامی سے منسوب کیا جائے۔"

(منادی دہلی بابا فرید نمبر ص ۱۴۶ جلد ۴۹ شمارہ ۵-۴-۵-۶)

بعد ازاں اسرار الاولیا سے حضرت باباصاحبؒ کا مذکورہ بالا بیان نقل کرکے یہ لکھا ہے :۔

"حضرت یوسفؑ کے زلیخا سے نکاح کرنے کی روایت نہ یہودی ماخذ میں ہے، نہ علمائے اسلام اس کے قائل ہیں، جامع ملفوظات نے خدا جانے یہ خرافات کہاں سے نقل کی ہیں۔" (مناوی دہلی، بابا فرید نمبر ص ۱۶۸، جلد ۴۹ شمارہ ۴-۵-۶)

یہودیوں کے علمی ذخائر میں اگر اب حضرت یوسفؑ کے حضرت زلیخا سے نکاح کرنے کی روایت نہیں ہے، تو قطع نظر اس سے کہ یہ کہنا کہ جو کہا گیا ہے بلا دلیل ہے کیونکہ یہ تو ان کی دیرینہ عادت ہے، قرآن و حدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ اسی عادت کی بدولت وہ توریت مقدس کو بھی محفوظ نہ رکھ سکے ہیں، لیکن جب قدیم و مستند علمائے حق نے ان کے نکاح کے متعلق معتبر و مسلمان یہودی علماء سے اس روایت کو نقل کیا ہے، تو یہ کہہ کر اسے مسترد کیسے کیا جاسکتا ہے کہ یہ روایت یہودی ماخذ میں نہیں ہے؟ اور اسے خرافات سے تعبیر کیسے کیا جاسکتا ہے؟

مولانا جامی وہ بزرگ عالم ہیں جن کی شرح جامی آج تک دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں داخل ہے، حضرت داتا گنج بخشؒ کی، مولانا جامیؒ کی، حضرت امام غزالیؒ کی منقولہ روایات کو خرافات سے تعبیر کرنا اور یہ لکھنا۔۔۔

"بداحتیاطی اور کم عقلی۔۔۔۔۔ اصول تصوف کے خلاف۔۔۔۔۔۔

اکثر تعلیمات اسلامی کے منافی ہیں۔"

بذات خود کھلی خرافات نہیں تو اور کیا ہے؟ بقول جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب اُسے فساد فی العلم، فساد فی التاریخ، فساد فی الروایات، فساد فی الرسوخ، فساد فی العقیدہ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، اور چونکہ اس زہر افشانی سے عوام اور کم علم گمراہ ہوتے ہیں،

اور عقیدتمندوں میں اشتغال کی پیدا ہوتی ہے، جو فتنہ و فساد کا سبب بھی ہو سکتی ہے۔ اس لیے فساد فی الارض سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے، لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ط ۔ علم مجلسی سے آگاہی: ہر شائستہ قوم کے مہذب افراد علم مجلسی سے آگاہی رکھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ جو واقعہ جن الفاظ میں کسی ایک مجلس میں بیان کیا جاتا ہے، بعینہٖ ان الفاظ میں کسی دوسری مجلس میں بیان نہیں کیا جا سکتا، اقتضائے حال کے مطابق واقعات کی تفصیل میں بھی کمی بیشی ہو سکتی ہے، اور ہوتی ہے، مقرر و متکلم کو یہ حق ہے کہ وہ واقعہ کے جس پہلو کو چاہے بیان کرے اور جس کو نہ چاہے، بیان نہ کرے، پورا واقعہ بھی بیان کر سکتا ہے اور متعلقات پر بھی روشنی ڈال سکتا ہے اور اختصار سے بھی کام لے سکتا ہے۔

تحریر میں کسی واقعہ کو عموماً جامعیت کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے، اور اختصار سے بھی، بہرحال ایجاز و اطناب سے کام لینے کا اسے پورا پورا حق ہوتا ہے، مکرر بیان کرنے اور لکھنے کی صورت میں الفاظ میں رد و بدل ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے، یہ بھی ہوتا ہے کہ جو واقعہ کسی نے قلم بند کر لیا ہے، اور برسوں بعد اُسے بیان کیا ہے، تو بیان میں تحریر سے زیادہ توانائی آ سکتی ہے، جس کے مختلف اسباب ہوتے ہیں، یہاں تین ایسے واقعات نقل کیے جاتے ہیں جن کو بیان کرنے والے بھی ایک ہی بزرگ ہیں، اور لکھنے والے بھی ایک ہی اہل قلم ہیں دونوں بیانوں کے درمیان فصل بھی کچھ زیادہ نہیں ہے،

(۱)

یک روز سہ یاران ترحمت مرا — در آنچہ شیخ الاسلام فریدالدین
و چند یاران را گفت کہ بروید — قدس اللہ سرہ العزیز رحمت داشت
در فلاں حظیرہ بہ شب بیدار باشید — مرا با چند یار بزیارت شہید کاں
برائے صحت من دعا کنید، ہم چناں — کہ آنجا اند فرستادہ بود، چوں
کردیم من و چند یار دیگر دراں — ما بعد از زیارت بخدمت پیوستم،
حظیرہ رفتیم، آں حظیرہ بام می داشت — فرمود کہ دعائے شما ہیچ اثر نہ

براں بام رفتیم، و طعام خود برابر
بردیم، شب آنجا بودیم دعا کردیم،
چوں روز شد بخدمت شیخ آمدیم
و باستادیم، و عرض داشت کردیم
کہ شب را بحکم فرمان بیدار بودیم
و دعا کردیم، شیخ ساعتے تامل
فرمود بعد ازاں گفت از دعائے
شما ہیچ اثر صحت پیدا نہ شد خواجہ
ذکرہ اللہ بالخیر فرمود کہ من در
جواب متامل شدم یارے
بود کہ او را علی بہاری گفتندے
او از من پستر ایستادہ بود، او
ازاں جا گفت کہ ما ناقصانیم
و ذات مبارک شیخ کامل، دعائے
ناقصاں در حق کاملاں کجا
مستجاب شود، ہمانا کہ ایں
سخن بسمع شیخ نہ رسید، من ایں
سخن بسمع شیخ رسانیدم بعد ازاں
روئے سوئے من کرد و گفت کہ
من از خدا خواستہ ام کہ ہرچہ
تو از خدا خواہی بیابی بعد ازاں

کرد، مرا ہیچ جوابے فراہم نیامد
یارے بود کہ او را علی بہاری
گفتندے، او دور تر ایستادہ
بود، گفت کہ ما ناقصانیم
و ذات مبارک شیخ کامل، دعائے
ناقصاں در حق کاملاں چہ گونہ
اثر کند، خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر فرمود
کہ ایں سخن بسمع شیخ نہ رسید من علین
آں بسمع مبارک رسانیدم مرا
فرمود من از خدا خواستہ ام کہ
ہرچہ تو از خدائے تعالیٰ بخواہی
بیابی، بعد ازاں آں روز عصا
بمن داد و مرا گفت کہ تو و بدر الدین
اسحاق علیہ الرحمۃ بروید، و ہر دو
حظیرہ مشغول شوید، من و او
ہر دو رفتیم و شب مشغول بودیم
چوں بخدمت پیوستیم فرمود کہ
نیکو بود۔

(فوائد الفواد ص ۵۹ مجلس ۱۵
پنجم رجب سنہ [illegible]ھ)

عصائے خود بمن داد۔ (فوائد الفواد
ص ۵۲ مجلس ۸، بست و ہفتم
(۲۷) ماہ ربیع الاول سنہ ۷۰۸ھ)

دونوں بیانات کے درمیان صرف تین ماہ سات یوم کا فصل ہے، درمیان میں چھ مجالس ہیں جن کے بیانات تقریباً دس صفحات پر مشتمل ہیں، مگر بیان میں جو فرق ہے، وہ مقابلہ سے واضح ہے، پہلے بیان میں حظیرہ۔ بام حظیرہ ہے، کھانا ساتھ لے جانے کا ذکر ہے، دوسرے میں صرف زیارت شہدا ہے، پھر پہلے بیان میں بعد ازاں عصائے خود بمن داد سے ایسا لگتا ہے کہ عصائے خود اسی وقت عطا فرمایا تھا، دوسرے بیان سے کہ آں روز عصا بمن داد" یہ معلوم ہوتا ہے کہ دن میں کسی وقت عطا فرمایا تھا عصائے خود میں جو تخصص ہے وہ بھی اس میں نہیں ہے اگر اسی اختلاف سے یہ بیان افضل الفوائد میں ہوتا تو اس پر سرقہ کا بھی الزام عائد ہوتا، اور اسلوب بیان کی خامی کا بھی۔

(۲)

حکایت خواجہ شاہی موئے تاب
کہ برادر مہتر او شیخ محمود موئے تاب
بود، فرمود، چوں خلق بادو
روئے آورد و ہر جا کہ می رفت،
آنجا جمیعتے می شد۔ وایں خواجہ شاہی
موئے تاب مردے سیاہ فام بود،
ہمدراں عہد درویشے بود در بداؤں
اورا مسعود نجاشی گفتندے،
چوں خواجہ شاہی را بہ آں نحو عا

حکایت خواجہ شاہی در افتاد
کہ اورا در بداؤں رونقے پیدا
شد و ہمہ خلق رو بر و آورد۔ و ہر جا کہ
می رفت، آنجا جمیعتے می شد داں
خواجہ شاہی مردے سیاہ فام
بود، ہمدراں عہد درویش بود
اورا محمود نجاشی گفتندے۔ وقتے
خواجہ شاہی را گفت، اے سیاہ!
گرمابہ نیک گرم کردہ، سوختہ

می دید، می گفت اے سیدا
گرما بہ گرم کردہ سوختہ خواہی شد
خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر فرمود کہ
ہم چناں شد کہ او گفتہ بود ہم در
جوانی رحلت نمود (فوائد الفواد
ص ۱۷۲ مجلس ۲۷ دہم ماہ
ذی قعدہ ۷۱۶ھ)

خواہی شد۔ ہم چناں شد کہ او گفت
خواجہ ہم دراں جوانی برفت (فوائد
الفواد ص ۱۷۶ مجلس ۲۸ یازدہم
ماہ ذی الحجہ ۷۱۶ھ)

دونوں بیانات کے درمیان صرف ایک ماہ کا فصل ہے، درمیان میں کوئی مجلس بھی نہیں ہے، اور درمیان میں صرف ایک صفحے کا بیان ہے، موئے تاب صرف پہلے بیان میں ہے، دوسرے میں نہیں ہے، دردیشے اور درویش میں امتیاز واضح ہے، پہلے بیان میں مسعود نجاشی ہے، اور دوسرے میں محمود نجاشی ہے، گرم کردہ اور نیک گرم کردہ میں بھی امتیاز ہے، پہلے بیان میں، بہ آں غوغای دید، می گفت ہے، اور دوسرے میں صرف گفت ہے، تواتر مفقود ہے، تنقید نگار بتائیں کہ وہاں اختلافات کی کیا توجیہہ اور کیا تاویل فرماتے ہیں، کس کو جعلی اور کس کو اصلی بتاتے ہیں۔

(۳)

حکایت فرمود کنیزکے داشت
نو بردہ و زال و مواسی است
نزدیک بدایوں کہ آں را کانجھر
گویند مگر ازاں مواسی بودہ
است، روزے ایں کنیزک
می گریست، مولانا علاء الدین

خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر فرمود
آرے ہم چنیں بود کہ او کنیزک
زالے داشت نو بردہ در بدایوں
سحر گاہے مولانا بیدار شد آں کنیز
آرد آس می کرد و می گریست
مولانا پرسید چرا می گری، کنیزک

پرسید کہ چرا می گرئی، گفت پسرے دارم، از او جدا شدم، مولانا گفت اگر ترا بر سر حوض برم کہ یک کروہے از شہر است و بر سر آں حوض راہ کانجہر ست ...... از آں جا تو راہ خانۂ خود بدانی، گفت بدانم، مولانا وقت سحرے او را از خانہ بروں آورد، بر سر آں حوض برد، و بگذاشت خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر چوں بریں حرف رسید چشم پر آب کرد، فرمود کہ علمائے ظاہر ایں معنی را منکر باشند، اما تواں دانست کہ او چہ کرد،

(فوائد الفواد ص ۱۶۵ مجلس ۳۴ پانزدہم ماہ رمضان ۷۱۶ھ)

گفت پسرے در مواس کانجہر گزاشتہ ام، از جدائی او می گریم، مولانا گفت اگر من ترا نزدیک نمازگاہ برم از آں جا راہ خانہ خود بدانی، او گفت آرے از آں جا راہ خانہ خود بدانم، مولانا علاء الدین نانے چند داد و او را بر سر راہ کانجہر برد و گزاشت۔

(فوائد الفواد ص ۲۰۲ مجلس ۵۲ یازدہم ماہ رمضان ۷۱۸ھ)

ان دونوں روایتوں کے درمیان فصل زیادہ ہے، درمیان میں بارہ فصلیں ہیں، جو ۳۵ صفحات پر مشتمل ہیں، بیان میں بھی ممیز فرق ہے، اگر یہی فرق کسی دوسرے مجموعہ ملفوظات میں ہوتا، تو تنقید نگاروں کو سخت اعتراض ہوتا، پہلی روایت میں رونے کا تو ذکر ہے، مگر چکی پیستے ہوئے رونے کا ذکر نہیں ہے، پہلی روایت میں حوض کا ذکر ہے جس کا فاصلہ شہر سے ایک کوس بتایا ہے، دوسری روایت میں نمازگاہ (عیدگاہ) کا ذکر ہے، مگر فاصلے کا ذکر نہیں ہے۔ دوسری روایت میں

نانے چند بدود داد ہے پہلی میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے، پہلی روایات میں نتیجتاً جو کچھ فرمایا ہے، دوسری میں وہ نہیں ہے، ان اختلافات سے روایات میں بہم سخت اختلاف پیدا ہو گیا ہے، اگر ایسے ہی اختلاف کسی کتاب کے جعلی ہونے کے دلائل ہیں، تو تنقید نگار بتائیں فوائد الفواد سب سے زیادہ جعلی کتاب کیوں نہیں ہے ؟ جس میں ایک ہی واقعہ کو مختلف اسلوب میں بیان کیا گیا ہے[1]، تنقید نگار کا بیان ہے :—

"حضرت امیر حسن دہلوی کے مرتب کردہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے ملفوظات فوائد الفواد ([illegible]) امیر خورد کرمانی کی تالیف سیر الاولیاء اور حمید قلندر کے جمع کیے ہوئے حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ[2] کے ملفوظات خیر المجالس نہایت درجہ مستند ہیں[3]۔"

(منادی دہلی ۱۹۷۶ء بابا فرید نمبر جلد ۴۹ شمارہ ۴-۵-۶ ص ۱۴)

اگر اس قدر اختلاف کے باوجود فوائد الفواد نہایت درجہ مستند ہے تو ایسے ہی اختلافات کی بنا پر دیگر ملفوظات جعلی کیسے ہو سکتے ہیں، وہ بھی نہایت درجہ مستند ہی ہونے چاہئیں، حالانکہ ان کے متن میں اختلاف نہیں ہے اس میں سے کسی دوسری کتاب کے بیان سے اختلاف ہونا زیادہ قرین قیاس ہے، اس کے باوجود کہا جاتا ہے کہ ۔۔۔۔

"یہ کس طرح ممکن ہے کہ خود حضرت نظام الدینؒ اپنی مجلس میں ایک

---

[1] ایسی امثلہ نہ صرف فوائد الفواد ہی میں ہیں بلکہ خیر المجالس میں بھی ہیں (خیر المجالس ص ۱۳۱ تا ۱۳۷ لائق مطالعہ ہیں)

[2] مخدوم نصیر الدین اودھیؒ کا لقب بقول جہانیاں جہاں گشت چراغ دہلی ہے (سفرنامہ مخدوم فارسی)، چراغ دہلوی لکھنا صحیح نہیں۔

[3] پروفیسر محمد حبیب مرحوم نے اس تعداد میں اضافہ فرمایا ہے ان کے نزدیک فوائد الفواد، خیر المجالس اور سیر الاولیاؒ کے علاوہ سیر العارفین اور اخبار الاخیار بھی معتبر و مستند ہیں۔
(مڈیول انڈیا۔ کوارٹرلی علی گڑھ اکتوبر ۱۹۵۹ء)

واقعہ بیان کریں اور اسی واقعہ کو اپنے قلم سے کتاب میں لکھیں، اور دونوں میں اتنا اختلاف ہو۔"

(منادی دہلی، بابا فرید نمبر ص ۱۲، جلد ۴۹ شمارہ ۴-۵-۶، ۱۹۷۴ء)

یہ اختلاف اسی طرح ممکن ہے جس طرح فوائد الفواد میں ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ امکان رکھتا ہے، جس طرح مختلف مجالس میں ایک ہی واقعہ کے بیان میں اختلاف ہے، اہل علم اس نکتے سے واقف ہیں کہ ایسے اختلافات ہوتے ہی ہیں کہ تقریر و تحریر میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے، کوئی مقرر لفظ بہ لفظ وہ بیان ہی نہیں کر سکتا، جو تحریر میں ہوتا ہے، اس کو پیش نظر رکھا جائے تو واضح ہو جائیگا کہ ملفوظات میں جو اختلاف ہے وہ ملفوظ نگار کی بد احتیاطی، کم عقلی، اصول تصوف اور اسلامی شریعت سے عدم واقفیت کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ بدیہی امر ہے جس سے کسی کو مفر نہیں۔ لطیفہ یہ ہے کہ تنقید نگار نے جن دو بیانوں کے درمیان فرق ہونا ناممکن تصور کیا ہے، ان کے درمیان چالیس سال سے زیادہ کا فصل ہے، لکھنے والے بھی مختلف ہیں، اور بیان کرنے والے بھی مختلف ہیں، مگر فوائد الفواد میں یہ صورت نہیں ہے، نہ بیانات کی مدت میں اتنا فصل ہے نہ بیان کرنے والے مختلف ہیں اور نہ لکھنے والے مختلف ہیں پھر کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ ایک کتاب اسی دلیل سے جعلی قرار پائے، اور دوسری مستند مانی جائے۔

۱۸۔ اعزازی کلمات کلمات والفاظ کے بعض مجگ ایسے ہیں، جو اعزازی طور پر بزرگوں اور قابل احترام اشخاص کے ناموں کے ساتھ بولے اور لکھے جاتے ہیں، مثلاً رحمۃ اللہ علیہ، علیہ الرحمۃ، رضی اللہ عنہ، انار اللہ برہانہ، ذکرہ اللہ بالخیر، قدس اللہ سرہ العزیز وغیرہ یہ عربی مرکبات ہیں، یہ ان بزرگوں کے ناموں کے ساتھ بھی استعمال کیے جا سکتے ہیں، جو بقید حیات ہیں، اور ان کے لیے بھی جو وفات پا چکے ہیں۔ انھیں

"اصطلاح اموات" جیسے غیر معروف مرکب سے نامزد کرنا اور یہ سمجھنا اور لکھنا کہ یہ صرف ان ہی اشخاص کے لیے مخصوص ہیں جو فوت ہو چکے ہیں اور عالم فانی سے رحلت فرما چکے ہیں، صحیح نہیں ہے اور نہ اصطلاحات کی کسی کتاب سے یہ ثبوت فراہم کیا جا سکتا ہے، کہ ان کلمات و مرکبات پر اصطلاح اموات کا اطلاق ہوتا ہے۔

اصطلاح سے مراد یہ ہے کہ علمائے فن کے کسی گروہ نے کسی لفظ کو اس کے اصلی و لغوی معنی کے علاوہ کسی اور معنی کے لیے مخصوص کر لیا ہے، جیسے منطق، فلسفہ، صرف و نحو، حدیث و فقہ کی اصطلاحات ہیں، اسی طرح پیشہ وروں کی اصطلاحیں ہیں جو مذکورہ فنون کی کتابوں میں مدوّن ہیں، اصطلاحات پر مخصوص کتابیں بھی لکھی گئی ہیں، جو بھی ان جگلوں کو اصطلاح اموات سے تعبیر کرتے ہیں، اس کا ثبوت فراہم کرنا ان کی ذمہ داری ہے، جو بزرگ رحلت پا چکے ہیں، ان کے ناموں کے ساتھ ان جگلوں کا استعمال عام ہے، اس کے برعکس ان اشخاص کے لیے بھی ان جگلوں استعمال ملتا ہے، جو بقید حیات ہوتے ہیں، آج نہ سہی مگر کل تک یہی تھا۔

(۱) سید علی ہجویری حضرت داتا گنج بخش لاہوریؒ (المتوفی ۴۶۵ھ 1072ء) نے جا بجا اپنے لیے ان جگلوں کو لکھا ہے:۔

"من کہ علی بن عثمان جلابی ام رضی اللہ عنہ (کشف المحجوب ۲۰۲،۲۳،۴۲،۲۳)

(۲) اجودھن (پاکپٹن) کے قاضی ابوالفضل عبداللہ حضرت بابا صاحبؒ کے بڑے مخالف تھے، وہ سماع کے خلاف فتویٰ حاصل کرنے کے لیے ملتان گئے جہاں مشہور مشہور علماء تھے، انھوں نے علمائے ملتان سے کہا کہ یہ کہاں جائز ہے کہ کوئی مسجد میں سماع سنے اور رقص کرے، انھوں نے دریافت کیا، ایسا کون شخص ہے تو انھوں نے کہا:

"شیخ فرید الدین قدس سرہ العزیز است" (فوائد الفواد ص ۹۶)

یہ واقعہ حضرت بابا صاحبؒ کی حیات کا ہے کہ آپ کے مبارک نام کے ساتھ قدس سرہ العزیز بولا گیا ہے،

(۳) حضرت محبوب الٰہیؒ کا ارشاد ہے کہ ایک بار حضرت بابا صاحبؒ نے مجھے اور کئی دوستوں کو شہدا کے مزارات پر دعا کے لیے بھیجا تھا جب ہم واپس آئے اور حاضر خدمت ہوئے تو آپ نے فرمایا "دعائے شما ہیچ اثر نہ کرد" القصہ پھر مجھے اور مولانا بدرالدین اسحاقؒ کو بھیجا، حضرت محبوب الٰہیؒ کے مبارک لفظ یہ ہیں:-

"مرا گفت کہ تو و بدرالدین اسحاق علیہ الرحمۃ بروید، و ہم دراں حظیرہ مشغول شوید" (فوائد الفواد ص ۵۹)

یہ بیان ہر اعتبار سے معتبر ہے، کہ یہ حضرت بابا صاحبؒ کا بیان ہے، پھر اس کا اعادہ فرمایا ہے، حضرتِ محبوب الٰہیؒ نے تنقید نگاروں کے لیے سب سے زیادہ اہم اس لیے ہے کہ فوائد الفواد میں ہے جو ان کے کہنے کے مطابق نہایت درجہ مستند ہے جس کے بعد مزید کسی شہادت کی ضرورت نہیں رہتی،

۱۹- خوارق عادات انسان اگر غور و فکر سے کام لے تو یہ حقیقت پوشیدہ نہیں رہتی کہ دنیا کی ہر شے عجائبات کا مرقع ہے، بلکہ وہ خود عجائبات کا مجموعہ ہے، بہرحال ایسے واقعات جو عام حالات سے مختلف، حیرت انگیز، اور عقل و فہم سے بالاتر ہوتے اور گاہ بگاہ ظہور میں آتے ہیں، انھیں خوارق عادات سے تعبیر کیا جاتا ہے، انجن کی ایجاد پر جارج اسٹیفن کے خلاف مذہبی پیشواؤں نے جو فتوے دیے تھے، تاریخ آج بھی انھیں دہرا رہی ہے، بجلی، ٹیلیفون، وائرلیس، ریڈیو، ٹیلی ویژن سب ہی حیرت انگیز ہیں، لیکن رواج عام نے ان کی حیرت و استعجاب کو زائل کر دیا ہے، اور وہ تمدن کا لازمہ بن گئے، اور روزمرہ کی چیزوں میں شمار ہونے لگے ہیں، ورنہ غیر شائستہ اذہان نے کیا کیا کچھ نہیں کیا ہے۔

اسلامی اذہان نے خوارق عادت کی تین نوعیتیں قرار دی ہیں (۱) جو محیر العقول واقعات انبیاء علیہم السلام سے صادر ہوتے ہیں، انھیں معجزہ کہتے ہیں (۲) جو مافوق الفطرت امور ارادۃً یا بلا ارادہ اولیاء اللہ سے ظہور میں آتے ہیں، انھیں کرامت سے تعبیر کرتے ہیں (۳) اور جو ان اشخاص سے ظہور میں آتے ہیں جو کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہی نہیں یا برائے نام رکھتے ہیں یا جن پر بے دین ہونے کا اطلاق ہو سکتا ہے، انھیں استدراج کہتے ہیں، حضرت محبوب الٰہیؒ کا ارشاد ہے۔

"آنچہ در وعقل را گنجایش نباشد — جس میں عقل کو دخل نہیں
آں کرامت است (فوائد الفواد ص) — وہ کرامت ہے،

یہ اسی روایت سے متعلق ہے، جو لفظی اختلافات کے ساتھ فوائد السالکین (ص) میں بھی ہے، لفظی اختلاف کی امثلہ "علم مجلسی سے آگاہی" کے زیر عنوان گزر چکی ہیں، اس روایت سے متعلق منادی میں عہد حاضر کے ایک تنقید نگار نے لکھا ہے:

"ایسے واقعات کی بھرمار ہے، جو چشتی صوفیہ کے عقائد اور تعلیمات کے سراسر خلاف ہیں، فوق العادہ عنصر کی بھی کمی نہیں، اور خوارق کے بیان میں مبالغہ ہے" (منادی دہلی ص ۸۶، بابا فرید نمبر جلد ۴۹ شمارہ ۴-۵-۶ ۱۹۷۲ء)

کیا تنقید نگار کو چشتی صوفیہ کے عقائد اور تعلیمات سے آگاہی کے باب میں حضرت محبوب الٰہیؒ پر فوقیت ہے، جو کمال علم و عمل کے باوجود بھی اس سے آگاہ نہ تھے کہ یہ روایت چشتی صوفیہ کے عقائد اور تعلیمات کے سراسر خلاف ہے، حضرت محبوب الٰہیؒ نے یہ بھی فرمایا ہے:

"سلوک را صد مرتبہ نہادند و ہفتدہم مرتبہ — سلوک کے لیے سو درجات رکھے ہیں
کشف و کرامت است، اگر سالک ہمدریں — سترھواں درجہ کرامت کا ہے اگر
مرتبہ بماند مشتاد و سہ دیگر کے — سالک اسی درجہ میں رہ گیا تو وہ
برسد (فوائد الفواد ص ۱۱۷) — دیگر تراسی درجات کو کیسے پہنچے گا،

لہ یہ نقطۂ نظر طبقۂ جنید یہ کا ہے (فوائد السالکین ص ۳۰)

بیان کا اسلوب موثر سے پڑا لول رہا ہے کہ جب تک مدارج سلوک کی تکمیل نہ ہوجائے، اظہارِ کشف وکرامت میں احتیاط رہنا چاہیے، البتہ تکمیل کے بعد ضرورۃً و ارادۃً کشف وکرامت سے کام لیا جاسکتا ہے، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشیؒ کا ارشاد ہے۔

چوں صد مرتبہ ہم طے کند، آں گاہ	جب سو واں مرتبہ بھی طے کرلے
ہرچہ خواہد کشف کند.......	پھر جو چاہے ظاہر کرے....
مرد کامل آں نیست کہ خود را تا آں	.....مرد کامل وہی ہے جو اُس وقت
زماں کشف نہ کند، تا تمام	تک اپنے کو ظاہر نہ کرے
حاصل نہ کند، (فوائد السالکین ص)	جب تک تکمیل نہ کرلے۔

فوائد الفواد ہو یا دیگر مجموعۂ ملفوظات ان سب میں ان ہی بزرگوں کی کرامات کا ذکر ہے، جو درجہ کمال کو پہنچ چکے تھے، اور اگرچہ فوائد الفواد میں بھی خوارق عادات اور کرامات کا ذکر ہے، اور بکثرت ہے، لیکن اسرار الاولیا اور راحت القلوب کے جامعین کو منصب سجادگی تفویض ہونا تھا اس لیے ان کی تربیت میں منصب کی رعایت کو بھی دخل ہے۔ اس اعتبار سے ان تینوں کتابوں میں وہ امتیاز ہے جو ہوسکتا ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ عہد وسطیٰ میں ہندوستانی اذہان جوگیوں اور سنیاسیوں کے دامِ فریب میں پھنسے ہوئے تھے، اور حضرت محبوب الٰہیؒ کے عہدِ شیخوخیت میں وہ کیفیت نہیں رہی تھی، اس لیے جو کچھ ان دونوں حضرات کی تربیت کے لیے درکار تھا، وہ ہرگز کسی اعتبار سے بھی خواجہ امیر حسن علا سجزیؒ کی تربیت کے لیے نہ تو درکار تھا نہ ہوسکتا تھا، فوائد الفواد میں وہ کچھ تلاش کرنا جو اسرار الاولیا اور راحت القلوب میں ہے، تلاش بے محل اور سعی لاحاصل ہے، بہرحال جن نفوسِ زکیہ کو اصلاحِ قوم کی خدمت تفویض کرنی ہوتی ہے، ان کی تربیت عام تربیت سے ممیز ہوتی اور ہوسکتی ہے، حضرت امیر خسروؒ اور قاضی محی الدین کاشانیؒ کی تربیت کا امتیاز اس کی روشن دلیل ہے،

لہٰذا ان نفوس زکیہ کو ماحولی کیفیت سے اور منزل کے نشیب و فراز سے آگاہی بخشنا تربیت کا لازمہ ہے، اور اگرچہ ان ملفوظات میں آپ بیتی کے ابھرتے ہوئے نقوش شاذ و نادر ہی ملتے ہیں، تاہم آپ بیتی کے موثر انداز میں واقعات کو دلنشین کرنا بھی مناسب ہوتا ہے، جس سے استعداد عمل کو مہمیز ہوتی ہے، اور دل و دماغ آمادۂ عمل ہو جاتے ہیں۔ ماحول کی کیفیات کو نظرانداز کر کے جو بھی جائزہ لیا جائے گا، غلط ہوگا، خواجہ حالی نے لکھا ہے،

"سوپر نیچرل یعنی مافوق العادۃ باتیں اور عجیب و غریب قصے.....
جن سے قدیم اور متوسط زمانے کا مغربی اور مشرقی لٹریچر بھرا ہوا ہے۔"
(حیات سعدی ص ۱۲۵)

پھر ملفوظات جو عہد وسطیٰ کا تہذیبی و روحانی سرمایہ ہے، اس میں مافوق العادۃ عنصر کا نہ ہونا اُن کی خامی تو ہو سکتی ہے، خوبی نہیں ہو سکتی، خصوصاً اس لیے کہ ان بزرگوں کو ان سے دوچار رہنا بھی پڑتا تھا، اور اگرچہ کتب ملفوظات ہم تک کامل صحت کے ساتھ نہیں پہنچ سکی ہیں، اور اکثر چند منتشر اوراق کا مجموعہ رہ گئی ہیں، تاہم ان میں جو کچھ ہے، وہ بہت کچھ اپنے موضوع سے متعلق ہے، علمی مسائل کا بیان اور احکام کا درس متعلق ہوتا ہے، تعلیمی نظام سے تربیت گاہوں کا نظام اپنا مقام آپ رکھتا ہے،

ع ہر سخن محلے و ہر نکتہ مقامے دارد

صوفیائے کرام طبیب روحانی ہوتے ہیں، قلوب کی نبض پر ان کی انگلیاں اور دل کی تہہ میں ان کی نظریں ہوتی ہیں، وہ جو کچھ مناسب سمجھتے ہیں، تجویز کرتے ہیں، کلاماً اِشارۃً سمجھنے کے لیے اہلیت درکار ہے جو آج عنقا ہے، پھر یہ کہا گیا ہے:۔

"اکثر بزرگوں کے مافوق الفطرۃ تصرفات اور خوارق عادات کا مبالغہ آمیز بیان ہے، سب سے زیادہ شبہ پیدا کرنے والا حصہ وہ ہے، جس

میں صاحبِ ملفوظ خود اپنی کرامت بیان کرتا ہے"۔

(منادی دہلی ص ۱۶۳ جلد ۴۹ شمارہ ۲۰-۵-۶ ۱۹۷۶ء)

اولیاء اللہ جن کی زندگیاں اوصاف حمیدہ سے متجلی اور رذائل سے مبرا ہوتی ہیں، اگر ضرورتاً شاذ و نادر آپ بیتی ان کی زبان پر آگئی ہے، تو وہ خودستائی اور خودنمائی نہیں، یہ حالات کا اقتضاء ہے، خواجہ حالی نے سوپر نیچرل کی پتنگ بڑھائی تھی، انھوں نے اپنے عہد کے خیالات کی وادیوں میں بھٹکنے والے شاعروں کو متنبہ کیا تھا، اور عملی زندگی کی ترجمانی کی ترغیب دی تھی جس کی ضرورت تھی، ان کی تحریک سے اردو شاعری نے کروٹ بدلی اور قومی و ملّی باکمال شاعر منصۂ شہود پر آئے، مگر سات آٹھ سو برس قدیم صوفیانہ ادب کو ہدف ملامت بنانے کا کیا محل ہے، اور اس سے کونسی منفعت مقصود ہے،

بلاشبہ ہندوستان کے اکابر چشتیہ کے ملفوظات میں محیر العقول اور مافوق العادۃ عناصر کی آمیزش ہے، جو اس عہد کا تمغائے امتیاز ہے، صوفیانہ ادب نہ اس سے خالی ہے، نہ ہونا چاہیے، جو کچھ اس میں ہے وہ ہدایت و رشد کے روشن مینارے ہیں، جن کی تابانی آج بھی جلوہ ریز ہے، انھیں ہدف تنقید بنانا درست نہیں۔

۲۰۔ عجائب الاسفار | عہد ماضی میں جن سیاحوں نے بری و بحری سفر کیے ہیں، ان کے سفرنامے شاہد ہیں کہ انھیں عجائبات روزگار سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ مشہور مغربی سیاح ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے کا نام ہی عجائب الاسفار رکھا ہے۔ اس کی ملاقات متعدد ایسے اشخاص سے ہوئی تھی، جو حیرت انگیز اوصاف کے مالک تھے، اور خوارق العادۃ ان سے ظہور میں آتے تھے، ابن بطوطہ اس عہد میں ہندوستان آیا تھا، جب خوارق کا زور ٹوٹ چکا تھا، اور برائے نام ان کا وجود رہ گیا تھا، تاہم ابن بطوطہ کے سفرنامے کے اس حصہ میں جو سفر ہندوستان سے متعلق ہے، متعدد محیر العقول واقعات ملتے ہیں، مگر اس بنا پر آج تک نہ کسی نے اس کو غیر اہم قرار دیا ہے اور نہ جعلی بتایا ہے۔

صوفیائے کرام جو بذاتِ خود محیر العقول اوصاف کے مالک ہوتے ہیں، اور اصلاحِ حال کے پیشِ نظر ہر رکاوٹ کو ٹھکرا دینے کا منصب رکھتے ہیں اور انسان کو انسانیت کے وصف سے متصف کرنے میں لگے رہتے ہیں، اگر ماحول کی ضرورت سے خرقِ عادت سے کام لیتے ہیں تو اس میں کیا مضائقہ ہے، یہ اس عہد کا لازمہ ہے، جس کو عہدِ ماضی کے تمدن کا مورخ نظر انداز نہیں کر سکتا، عہدِ حاضر میں تنقیدی جائزے جو ملفوظات سے متعلق شائع ہوئے ہیں اور میرے مطالعہ میں آئے ہیں، وہ صحیح نہیں ہیں، اس اجمال کی تفصیل ان مضامین میں ملے گی جو کتبِ ملفوظات کے موضوع پر لکھے گئے ہیں، اور لکھے جائیں گے۔

۲۱- کتابیات کتبِ ملفوظات میں اس عہد کی متعدد کتابوں کے نام آئے ہیں جن میں سے بہت سی اب ناپید ہیں، شمائل الاتقیا و دلائل الاتقیا میں ماخذ کی طویل فہرست درج ہے، اس میں ایسی کتابوں اور رسالوں کے نام بھی ہیں، جو اس عہد کے اہلِ قلم نے شاید ہی دیکھے یا سنے ہوں، یہ فہرست ڈیڑھ پونے دو سو کتب و رسائل کے اسماء پر مشتمل ہے، کتبِ ملفوظات جو ہدفِ تنقید بنائی گئی ہیں، ان میں سے جس کتاب میں سب سے زیادہ تعداد ہے، وہ چونتیس ۳۴ ہے، تعجب ہے کہ تنقید نگار اس مختصر تعداد کے بارے میں بھی یہ رائے رکھتے ہیں کہ:-

> "اتنی کتابوں سے جامع نے شاید ہی استفادہ کیا ہو، ان میں سے اکثر فرضی ہیں۔ (منادی دہلی ص ۱۲۶ بابا فرید نمبر جلد ۴۹ شمارہ ۴-۵-۶ ۱۹۷۴ء)

یہ دو ہی جملے ہیں جو باہم متضاد ہیں، جامعِ ملفوظات کا کام صرف ملفوظات کا جمع کرنا ہے، اس کے لیے ان کتابوں سے استفادہ ضروری نہیں جن کا ذکر ملفوظات میں آیا ہے خواہ اس کا مطالعہ کیسا ہی وسیع کیوں نہ ہو،

جن کتابوں کے نام کتبِ ملفوظات کی زینت ہیں، وہ فرضی نہیں واقعی ہیں، جن کا مطالعہ وسیع ہے وہ جانتے ہیں کہ ان میں سے اکثر کے نام کتبِ قدیمہ میں ملتے ہیں، ان کو فرضی تصور کرنا اپنی لاعلمی کا

ثبوت دیتا ہے۔

۲۲-تاریخی قدریں | کسی واقعے کا تاریخ سے وابستہ ہونا اور تاریخی اندراج کا صحیح ہونا بلاشبہ واقعہ کو تقویت بخشتا ہے' اہل علم انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں' قطع نظر اس سے کہ تاریخ میں متعدد واقعات مختلف فیہ ہوتے ہیں' اور تاریخی اندراجات بھی مختلف ہوتے ہیں' لیکن تاریخی اختلاف کی بنا پر کسی واقعہ سے انکار نہیں کیا جاتا' بلکہ صحت کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔

کتب ملفوظات میں سے اگر کسی نسخے میں واقعہ کے ساتھ سن اور تاریخ وغیرہ صحیح نہیں تو تصحیح کی طرف متوجہ ہونا چاہیے' واقعہ کا انکار کیسے کیا جا سکتا ہے یہ علمی و تحقیقی نقطۂ نظر ہے جو علمی دنیا میں مروج ہے' غلط تاریخی اندراج کی بنا پر کسی کتاب کو جعلی قرار نہیں دیا جا سکتا' اگر صحت کا نقطۂ نظر یہی قرار پائے تو ملفوظات ہی کیا بہت بڑا علمی ذخیرہ جعلی قرار پائے گا' اس لیے اہل علم و اہل نظر اس روش کو از کار رفتہ جانتے ہیں۔

ملفوظات سے دلچسپی رکھنے والے خاص ہوں یا عام معدودے چند کے سوا تاریخی قدروں سے دلچسپی نہیں رکھتے' ان کے دل و دماغ نفس واقعہ سے متاثر اور کیف اندوز اور ہدایت کی نعمت سے سرفراز ہوتے ہیں' انھیں اس سے غرض نہیں ہوتی کہ کوئی واقعہ کب ہوا' کس دن ہوا' کس تاریخ کو ہوا' کس مہینے میں ہوا اور کس سن میں پیش آیا' یہ سوال اٹھتا ہی نہیں ہے بلکہ ان کے دل و دماغ روحِ واقعہ سے متعلق رہتے ہیں۔

بلاشبہ تاریخی صحت نہایت کارآمد اور مفید ہے' خصوصاً ان کے لیے جو تاریخ سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ اصلاح کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں' اور صحت مند معلومات فراہم کی جا سکتی ہیں' لیکن جن کتابوں کا وجود صدہا سال سے پایا جاتا ہے۔ ان میں اگر

کسی تاریخی واقعہ میں سقم پایا جائے تو ان کو جعلی قرار دینا صحیح نہیں، یہ بھی اصول نہیں کہ اگر کسی کتاب کا کوئی قدیم ترین نسخہ دستیاب نہ ہو سکے، یا معاصر کتابوں میں اس کا ذکر نہ ملے تو اس کے وجود ہی سے انکار کر دیا جائے۔ اگر یہی اصول ہے تو دررِ نظامی کے وجود سے سب سے پہلے انکار کیا جائے کا جس کا قدیم ترین نسخہ جو دستیاب ہوا ہے وہ قیاساً بارہویں صدی ہجری کا مکتوبہ ہے، اور کہیں کہیں ملفوظات بھی مشتبہ ہیں، جس سے یہ بھی یقین ہوتا ہے کہ دررِ نظامی بھی الحاق و تحریف سے محفوظ نہیں، حالانکہ تنقید نگاروں کے نزدیک دررِ نظامی کا شمار نہایت درجہ مستند کتابوں میں ہے۔

بہرحال کتبِ ملفوظات جو ہم تک پہنچی ہیں، وہ داخلی دلچسپی کی بدولت پہنچی ہیں، جس میں بلا امتیاز عقیدت مندوں کی دلچسپی کو دخل ہے۔ علماء کی دلچسپی کے نقوش خال خال ہی ملتے ہیں، غالباً اس لیے کہ ان میں درسِ عمل ہے، اور عالمانہ قیل و قال نام کو بھی نہیں ہے۔ بہرحال ہم ان عقیدت مندوں کی دلچسپی کے مرہون منت ہیں، جن کی بدولت ہم اپنے قدیم روحانی اور تہذیبی سرمایہ سے فیض یاب ہیں۔

ان حالات میں تاریخی قدروں کا برقرار رہنا کچھ یقینی نہیں لہذا ان کے درپے ہونا معقولیت سے بعید ہے، البتہ صحت کی جانب توجہ کی جا سکتی ہے، اور یہ ایک اچھی کوشش ہوگی۔

۲۳۔ ملفوظات کی مقبولیت ملفوظات میں کچھ ایسی جاذبیت اور کشش ہے کہ گوناگوں خامیوں کے باوجود پڑھنے والے ان سے محظوظ اور لطف اندوز ہوتے ہیں، بسا اوقات وہ عالمِ کیف و سرور میں کھو سے جاتے ہیں، ان کا دل وہ جگہ ڈھونڈتا ہے جہاں نور و سرور ہی ہو، اور کچھ نہ ہو، ان سے ان کی روح کو ایسی طمانیت نصیب ہوتی ہے، جو کسی نعمت سے کم نہیں، وہ اللہ کے سوا سب کچھ بھول جاتے ہیں، انھیں اپنے حال پر ندامت ہوتی ہے، اصلاحِ حال کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، انھیں ہدایت نصیب ہوتی ہے، اور نور و سرور بھی

مجھے دراصل ملفوظات ہی نے مسلمان بنایا، اور بنائے رکھا ہے، اس مادی دور میں ملفوظات کی یہ تاثیر حیرت انگیز ہے، مگر

ایں سعادت بزورِ بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

حضرت محبوب الٰہیؒ کی مجلس میں بسبیلِ تذکرہ ایک صاحب نے بیان کیا کہ ایک صاحب تھے جو صلاحیت بھی رکھتے تھے، اور درویشوں کی خدمت بھی خوب کیا کرتے تھے، ایک دن میں نے اُن سے کہا کہ آپ ہمارے حضرت سے بیعت کیوں نہیں ہو جاتے، انھوں نے کہا کہ ایک دن بیعت ہونے کے ارادے سے گیا تو تھا، مگر کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں خوان پوش ہی خوان پوش جمع ہیں، اور مشعلیں روشن ہیں، یہ منظر دیکھ کر مجھے عقیدت نہیں رہی، اور میں چلا آیا، حضرت محبوب الٰہیؒ نے حاضرین مجلس کی طرف رُخ کیا، اور فرمایا کہ یہاں خوان، اور مشعلیں کب تھیں، پھر مسکرائے اور فرمایا، یہ نعمت مقدر میں نہ تھی، تو یہ کچھ دکھا دیا گیا۔ (فوائد ص ۲۵)

ایک زمانہ تھا کہ عام وخاص کو ملفوظات کے پڑھنے اور سننے میں بڑا ہی شغف تھا، خواندہ اشخاص کو اپنی مشغولیت سے جب وقت ملتا تو مطالعہ کرتے ہی تھے، خواص کے ہاں رات کو جو نشست ہوتی تھی، اس میں بھی اولیاء اللہ کا ذکر رہتا تھا، ان میں شریک ہونے والوں کے دلوں میں اللہ کی یاد تازہ ہوتی تھی۔

میرے بچپن میں دلی کے کارخانہ داروں کا دستور یہ تھا کہ وہ جاڑوں کی راتوں میں مل بیٹھتے، کارخانہ ہی میں جمع ہو جاتے، نوجوان ہوتے تو قصے کہانیاں ہوتیں، قصہ چہار درویش پڑھا اور سُنا جاتا، بوڑھے بزرگ، اور سن رسیدہ ہوتے تو کسی سے ملفوظات پڑھواتے، سنتے اور سنواتے، گاہ بگاہ میں بھی پکڑ میں آجاتا تھا، اگر پڑھنے والا نہ ملتا تو کوئی بزرگ خود بیان کرتے، سنتے سنتے انھیں بھی واقعات ازبر ہوتے تھے، مزے لے لے کر خوب سناتے تھے، کوئی شوخ کہہ بھی بیٹھتا استاد تو اچھے خاصے مولوی ہیں وعظ بھی کہیں تو جچ جائیگے

بہر حال افکار دنیا سے دم بھر کے لیے چھٹکارا مل جاتا، اور انھیں ایسا لگتا کہ وہ نور کی دنیا میں آبسے ہیں، بے ساختہ کہہ اٹھتے ؎

نور کی دنیا میں اب رہتے ہیں ہم دل کے ہاتھوں منزلت پائی بہت

یہ ذوق اتنا بڑھا ہوا تھا کہ ان پڑھ اچھے اچھے خوشنویسوں سے ملفوظات نقل کراتے سنہری روپہلی جلدیں اور خوشنما چرمی جلدیں بنواتے، ان پر بھی رنگ برنگی گلکاری کرلیتے، جزدانوں میں رکھتے، اور بڑے احترام سے رکھتے اور نکالتے تھے، لوبان کی دھونی دیتے، کوئی نامی گرامی عالم یا ایسا ہی کوئی پڑھا لکھا آنکلتا تو اُسے اپنے گھر یا اپنے کارخانے میں لے جاتے، عزت سے بٹھاتے، آؤ بھگت کرتے، اور بڑے فخر سے وہ مجموعۂ ملفوظات اسے دکھلاتے، جب وہ حروف کی نوک پلک، کشش اور دوائر کی تعریف کرتے تو مجھے حیرت ہوتی، یہ تو ان پڑھ ہیں، میں ہی نہیں جانتا، انھیں آگاہی کیسے ہوئی، میں دیکھتا، اور غور سے دیکھتا اور سنتا، کہ کس کس کی کیا تعریف کر رہے ہیں، حیران رہ جاتا، بول کیا سکتا تھا، اُن آنکھوں سے ایسے ایسے خوش عقیدہ دیکھے ہیں، جن کی یاد سے آج بھی روح میں اہتزاز پیدا ہوتا اور جی بھر آتا ہے۔ اللہ پاک ان کی مغفرت فرمائے، اور اُن کے صدقے میں ہماری بھی۔

۴۔ والد مرحوم کا معمول | والد مرحوم (سیّد محمد ابراہیم حسنی حسینی) نہ تو سجادہ نشین تھے نہ کسی درگاہ کے خادم و مجاور، اُن کا تعلق محنت کش طبقہ سے تھا، البتہ صاحب ذوق اور صاحب نسبت تھے۔ مجاز بھی تھے، مگر پیری مریدی پیشہ نہ تھا، علما، صوفیا اور شرفا، غرض کہ عوام و خواص سب ہی سے میل جول تھا۔

ع دل بیار دوست بکار

پر عمل تھا، ان کا معمول یہ تھا کہ وہ رمضان المبارک میں روزہ مردانہ میں افطار کیا کرتے تھے، عصر کے بعد سے معمولاً ملفوظات کا مطالعہ فرماتے، رفتہ رفتہ احباب آ جمع ہوتے تو آواز سے پڑھنے لگتے، ورنہ خاموش مطالعہ فرماتے رہتے۔

عجب سماں ہوتا تھا، رمضان المبارک کا بابرکت مہینہ، عصر و مغرب کا درمیانی وقت روزے کا کیف، روح میں تازگی اور بالیدگی، ایسا لگتا تھا کہ یہ فرشتے ہیں، یا نور کے پتلے، چہرے پر معصومیت اور نورانیت، ایسے بیٹھے سنتے جیسے بُت ہی تو ہیں، مجلس سُنسان، ہُو کا میدان ہے۔ گاہ بہ گاہ کسی کسی پر گریہ طاری ہو جاتا، یا آنسو ڈبڈبا آتے، دل کا کیا عالم ہوگا یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے، یا کچھ وہی جانتے ہوں گے، اللہ سے لو لگی ہوتی اور زبان پر اللہ اللہ ہوتا، کبھی کبھی درد بھری آہ بھی سننے میں آجاتی، میں بیٹھا منہ تکا رہتا، اور زبانِ حال سے کہتا سنائی دیتا ہے ؎

بکن پند غفلت از گوش ہوش
کہ از مُردگاں پندت آید بگوش

میری آنکھوں نے سالہا سال یہ سماں دیکھا ہے، ملفوظات سے مجھے جو انسیت ہے، وہ مجھے ورثہ میں ملی ہے، ماں پیچھے گھٹی میں پڑی ہے۔

عہدِ حاضر میں ہند و پاک کے تنقید نگار ملفوظات پر جو کچھ لکھ رہے ہیں، وہ تنقیدیں نہیں بلکہ کھلی تنقیصیں ہیں، بارگاہِ الٰہی میں میری التجا ہے کہ یہ تخریب سے درگزریں اور تعمیر میں لگ جائیں۔

ملفوظات ہماری تہذیب کا گراں قدر سرمایہ ہے جو اب بھی ہمارے لیے سُرمۂ چشم اور بصیرت افروز ہے، اس سرمایہ کا ضائع ہونا قوم و ملت کا ناقابلِ تلافی نقصان ہے، ان کی قدامت اور عام و خاص میں اُن کی مقبولیت راز سربستہ ہے، جو ہمیں دعوتِ عمل دیتا ہے، یہ صحیح ہے کہ ملفوظات کے جو نسخے دستیاب ہوتے ہیں، وہ خامیوں سے مبرا نہیں، مگر وہ خامیاں ایسی بھی نہیں جو رفع نہ ہو سکیں، یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ قدیم نسخوں کا کھوج لگائیں، اور نقد و مقابلہ کی صیقل سے اصل کا آئینہ بنا دکھائیں، یہ دھیں صدی کی یہ جیتی جاگتی کرامت ہے کہ جن کتب ملفوظات کے وجود سے انکار کیا جا رہا ہے، اور جنھیں جعلی قرار دیا جا رہا ہے، اور جنھیں ما بعد کے کسی شخص کے ذہن کی خلاقی کا نتیجہ بتایا جا رہا ہے (ص ۱۴۰) ان کے قدیم ترین ۷۳۸ھ

تک کے نسخوں کا سراغ ملنے لگا ہے' اور جنھیں معتبر و مستند بتایا جا رہا ہے' بارہویں صدی تک پہنچ کر ان کے نشانِ قدم کا کھوج نہیں ملتا' بارہویں صدی تک بھی جو کھوج ملتا ہے وہ بھی ظنی اور قیاسی ہے' تحقیقی نہیں ہے۔ یہ انداز دفعی بھی ہے' اور پیران باصفا کی کرامت بھی ہے اور عقیدت مندوں کے لیے دعوت ایثار و عمل بھی ہے' دیکھیے پردۂ غیب سے کیا نمودار ہوتا ہے' اور کون یہ سعادت حاصل کرتا ہے؟ بخلق ما یشاء و یختار۔

۲۵۔ تصنیف و تالیف | کسی موضوع یا کسی عنوان سے متعلق معلومات فراہم کر کے اپنے خیالات اور اپنی معلومات کو سلیقے سے سپردِ قلم کرنا تصنیف ہے' تصنیف کسی اہل قلم کی ذاتی جد و جہد اور اس کے اپنے خیالات و رجحانات کا مرقع ہوتی ہے' مصنف ہی اس کا ذمہ دار ہوتا ہے' تالیف عرفِ عام میں مختلف مضامین (نثر و نظم) کو ایک جا جمع کرنے کو تالیف کہتے ہیں اور تالیف کرنے والے کو مؤلف کہتے ہیں' مؤلف کسی ایک شخص کے مضامین کو بھی جمع کر سکتا ہے اور مختلف اشخاص کے مضامین کو بھی' کتب ملفوظات کو بھی تالیف سے تعبیر کرتے ہیں' اگرچہ باہم ہلکا سا امتیاز بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ مؤلف مرتب شدہ مضامین کو جمع کرتا ہے جو کسی ایک سے مخصوص ہوتے ہیں' یا زیادہ سے' مگر کتب ملفوظات میں سے ہر ایک کسی ایک ہی کی آواز بازگشت ہوتی ہے' جس کو سن کر مرتب کیا جاتا ہے' اس لیے بغرضِ امتیاز ملفوظات کے مرتب کرنے والے کو جامع کہتے ہیں۔

۲۶۔ جامع ملفوظات | جامع ملفوظات کو استحقاق ہوتا ہے کہ اگر دوران گفتگو میں کوئی واقعہ پیش آ جائے' تو اس کی روداد بھی ضبط تحریر میں لے آئے۔ مثلاً فلاں آیا' مفوظ اس کی طرف متوجہ ہوا' اور اس سے یہ گفتگو ہوئی' یا فلاں نے یہ سوال کیا اور اس کا یہ جواب دیا' اس اعتبار سے ملفوظات کی نہ تو وہ نوعیت رہتی ہے' جو ان مضامین کی ہوتی ہے' جنھیں مؤلف تالیف کرتا ہے' اور نہ تقریر مسلسل ہی کی نوعیت برقرار رہتی ہے اس لیے ملفوظات نہ بعینہٖ تقریر ہوتے ہیں' اور نہ بعینہٖ تالیف' جامع ملفوظات بھی

اس اعتبار سے قاری مؤلف سے ممیز ہوتا ہے، لیکن عرفِ عام میں ملفوظات کو تالیف سے اور جامع کو مؤلف سے بھی تعبیر کرتے ہیں، تاہم یہ امتیازات ذہن میں محفوظ رہنے چاہئیں۔

ملفوظات کو ان یادداشتوں کے مثل جاننا بھی صحیح نہیں جو اساتذہ درس کے دوران کسی عنوان سے متعلق طلبا کو لکھواتے ہیں، اس لیے کہ وہ تقریریں نہیں، بلکہ مضمون مسلسل ہوتے ہیں، جو اکثر مرتب کیے ہوئے ہوتے ہیں، خواہ وہ زبانی بیان کیوں نہ کیے جائیں، ان کی نوعیت ہرگز تقریر کی سی نہیں ہوتی، پھر وہ عموماً وقتی اور ہنگامی ہوتے ہیں، مگر ملفوظات جب تک وہ محفوظ رہ سکتے ہیں، شمعِ ہدایت ہوتے ہیں، اس مختصر معلومات سے مجموعۂ ملفوظات کی نوعیت واضح ہو جاتی ہے کہ وہ تصنیف نہیں ہوتے اور ان پر تالیف کا بھی پورا اطلاق نہیں ہوتا اور یہ غلط فہمی رفع ہوتی ہے۔

"یہ بخوبی ممکن ہے اس کا سبب یہی رہا ہو کہ ہمارے شیوخ نے کتابیں نہیں لکھی ہیں تو ہم کیوں تصنیف و تالیف کی طرف التفات کریں، متابعت کاملۂ شیخ اور اتحادِ مطلب کا ان بزرگوں کے ہاں اتنا ہی اہتمام ہوتا تھا، .... یہ ذاتی یادداشت تھی، اسے کتابی صورت میں مرتب کر کے شائع کرنے کا کبھی ارادہ نہیں تھا"

(منادی دہلی ص ۱۳۷ بابا فرید نمبر جلد ۴۹ شمارہ ۱، ۵-۶ ستمبر ۱۹۷۴ء)

مجموعۂ ملفوظات کو تصنیف و تالیف سے تعبیر کرنا صحیح نہیں، متابعتِ شیخ اور اتحادِ مطلب کا بھی وہ مدعا نہیں جو تنقید نگار سمجھے ہیں، اگر یہی مطلب ہوتا تو حضرت محبوبِ الٰہیؒ یہ کیوں فرماتے؟

"سہ چیز کہ شیخ کبیر .... را میسر شد من نمی توانم کرد، اول آں کہ ہر روز غسل کردے، دوم آں کہ جوارے[1] خریدے سوئم آں کہ سحر نہ خوردے۔"

(سیر الاولیاص ۲۸۷)

---

[1] جوارے یعنی لونڈی یا کنیز

حضرت محبوب الٰہیؒ کا ارشاد ہے "نسخہ کردم" اس کا مدعا یہی ہے کہ آپ نے حضرت باباصاحبؒ کے ملفوظات کو کتابی شکل میں مرتب فرمایا تھا، کون کہہ سکتا ہے کہ شائع کرنے کا ارادہ نہ تھا، حضرت محبوب الٰہیؒ کے دل کی بات آج کون جان سکتا ہے۔

۷۔ نوشتہ کا اطلاق | نوشتہ کا اطلاق ہر تحریر پر ہوتا ہے، تصنیف، تالیف، نقل کتاب، یادداشت، قطعہ، طغرا، مراسلہ، رقعہ، دستاویز، کتبہ ..... نظم و نثر سب ہی تحریریں نوشتہ میں شمار ہوتی ہیں، البتہ قرینے سے اطلاق کا امتیاز ہوتا ہے، ۱۵ محرم ۷۱۳ھ کی مجلس میں خواجہ امیر حسن علا سجزیؒ نے ذکر فرمایا ہے :-

عزیزے حاضر بود، عرض داشت	ایک دوست تھے، افضل نے عرض
کرد کہ مرا در اودھ مردے کتابے	کیا کہ ایک شخص نے اودھ میں مجھے ایک
نمود و گفت کہ ایں نبشتہ خدمت	کتاب دکھائی، اور کہا کہ یہ حضرت والا
مخدوم است، خواجہ ذکرہ اللہ	کی لکھی ہوئی ہے، آپ نے فرمایا اس نے
بالخیر گفت کہ تفاوت گفتہ است	یہ بات تفاوت (از فرق) سے کہی ہے
من ہیچ کتابے نہ نوشتہ ام	میں نے کوئی کتاب نہیں لکھی ہے۔

(فوائد الفواد ص ۲۴۵)

یہ بیان واضح نہیں مبہم ہے، نوشتہ کا مفہوم وضاحت طلب ہے، تفاوت گفتہ سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ نوشتہ کا مفہوم مبہم ہی ہے، مطلب یہ ہے کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ تو لکھا ہی ہے، مگر وہ کتاب نہیں لکھی جو اس کے تصرف میں ہے یا ہو سکتی ہے، کیونکہ مجموعی طور پر نوشتہ سے انکار کیا ہی نہیں جا سکتا تھا، ایسا لگتا ہے کہ ابھی مماثلت سے کسی کو شبہ ہوا تھا، تاہم جس خیال سے یہ بات کہی گئی تھی حضرت محبوب الٰہیؒ نے کمال بلاغت سے اسی کے لفظ کو منفی صورت میں دہرایا، تاکہ نوشتہ کا جو مفہوم اس کے ذہن میں تھا، کلیتہً اس کی تردید ہو جائے، کتاب سے بھی اس کے معہود ذہنی کی نوعیت واضح نہیں ہوتی کہ وہ کس موضوع سے متعلق تھی، تصنیف

تھی یا تالیف "من ہیچ کتابے نہ نوشتم" سے اسی خیال کی تائید ہوتی ہے، ورنہ لکھنے کو تو آپ نے کیا کچھ نہ لکھا تھا۔ حضرت بابا صاحبؒ کے ملفوظات بھی لکھے تھے، جنھیں بصورت کتاب ہی تدوین فرمایا تھا، آپ کا ارشاد ہے،

"ہرچہ از شیخ شنودہ شد، نوشتم، چوں بمقام خود باز آمدم برجائے نسخہ کردم .... تا ایں غایت آں مجموعہ برمن است ......"

(فوائد الفواد ص ۳)

یہ نسخہ کردم کیا ہے؟ کتاب نہیں لکھی تھی تو کیا لکھا تھا، مگر ہیچ کتابے نہ نوشتم" کا مدعا یہ ہے کہ معہود ذہنی جیسی میں نے کوئی کتاب نہیں لکھی ہے، گویا کہ یہ جملہ معہود ذہنی سے متعلق ہے، وہ سب تحریریں مستثنیٰ ہیں جو آپ کے قلم سے نکلی تھیں، یہ جملہ تمام تحریروں سے متعلق نہیں ہے اور نہ ہوسکتا ہے، امیر خورد کرمانیؒ نے لکھا ہے کہ جو سوال صوفی حمید الدین ناگوریؒ سے کیے گئے تھے، اور جو انھوں نے جواب دیے تھے، وہ آپ نے ایک کتاب کے حاشیہ پر لکھے تھے، (سیر الاولیاء ص ۱۶۰) جو حال ہی میں پاکستان میں رسالہ سوال و جواب کے نام سے شائع ہو چکے ہیں، شمائل الاتقیا، جو آپ کے بزرگ خلیفہ شیخ برہان الدین غریبؒ کے ایما سے مرتب ہوئی تھی، اس میں رسالہ قوام العقائد آپ کی تصنیف سے فہرست ماخذات میں موجود ہے، اس نکتے کو سمجھ لینے کے بعد کوئی الجھن باقی نہیں رہتی اور من ہیچ کتابے نہ نوشتم کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

۲۸ خیر المجالس کے بیانات | خیر المجالس کے جامع مولانا حمید الدین قلندرؒ ہیں، جو شیخ برہان الدین غریبؒ کے ملفوظات[1] کے بھی جامع ہیں، خیر المجالس کی زبان شستہ اور رفتہ ہے۔ البتہ اقل قلیل کہیں کہیں بیان میں گنجلک اور بے ربطی ہے، ایسا لگتا ہے کہ مخطوطات میں ...

[1] مولانا برہان الدین غریبؒ کے ملفوظات کا نام بھی اخبار الاخیار ہے جو غالباً ہونایاب ہے ممکن ہے کہ کہیں ہو ــــ واللہ اعلم

کا پیوند لگا ہے، اگر وہ بیان ان ہی کا ہے تو محل استعجاب ہے ورنہ مجموعی طور پر کتاب دلچسپ ہے،

(۱) گیارہویں مجلس میں ہے کہ کسی شخص نے مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ سے حضرت خواجہ عثمان ہرونیؒ کے ایک ملفوظ سے متعلق دریافت کیا، (جس کا ذکر آیندہ آئے گا) تو آپ نے فرمایا۔

ایں ملفوظ ایشاں نیست ایں	یہ ملفوظ ان کا نہیں ہے ۔ یہ
نسخہ ہا برمن ہم رسیدہ است	نسخے مجھے بھی پہنچے ہیں ۔ اور اُن
و دراں بسیار الفاظ است کہ	میں بہت سے لفظ ہیں کہ جو اُن
مناسبِ اقوال ایشاں نیست	کے اقوال کے مطابق نہیں ہیں ۔

(خیر المجالس ص ۵۲)

اس بیان میں مجموعۂ ملفوظات کے وجود سے انکار نہیں ہے، البتہ تحریف و الحاق کی نشان دہی ہے، جو امکانی ہے، اس بیان میں حرف عطف بھی بلا ضرورت ہے، غالباً اسی بیان کی روشنی میں مولانا حامد جمالی (المتوفی ۹۴۲ھ / 1535ء) نے لکھا ہے:۔

نقل است از حمید قلندر کاتب	کتاب خیر المجالس کے کاتب حمید قلندر
ملفوظ خیر المجالس ...... فرمودند	سے نقل ہے ... انھوں نے فرمایا
کہ ایں نسخہ ہا برمن رسیدہ اند،	کہ یہ نسخے مجھے پہنچے ہیں، جو ہرگز اُن
حاشا کہ از ایشاں باشد ۔ دراں	کے نہیں ہیں، (کیونکہ) ان میں بہت
جا بسیار کلمات مجاوراں و معتقداں	سے کلمات مجاوروں اور معتقدوں نے
نا وقوف نوشتہ اند کہ ہرگز موافقِ	جان بوجھ کر لکھ دیے ہیں، جو ہرگز
احوال و اعمالِ ایشاں نیست،	ان کے اقوال کے مطابق نہیں
(سیر العارفین ص ۹۵)	ہیں ۔

خیر المجالس میں کسی ایک ملفوظ سے بلکہ صرف بعض الفاظ سے انکار ہے، مولانا حامد جمالی کو تسامح ہوا اور وہ کچھ اس طرح لکھ گئے کہ گویا مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے جملہ نسخہ ہائے ملفوظات کے متعلق یہ فرمایا ہے کہ حاشا از ایشاں باشد یہ بات ہرگز ان کے شایانِ شان نہ تھی۔ پھر اس ارتکاب کا مرتکب بزعم خود معتقداں و مجاوراں کو قرار دے لیا ہے جن کا ذکر خیر المجالس میں نہیں ہے۔ دراصل ان کا یہ بیان قدرے ژولیدہ ہے۔ پہلے بیان سے انکار مفہوم ہوتا ہے پھر بسیار کلمات سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ ان کے بیان میں بھی مجموعۂ ملفوظات کے وجود سے انکار نہیں ہے، مولانا حامد جمالی کے بیان کی بھی یہ خصوصیت ہے کہ وہ بے جان اشیا کی جمع کے لیے کہیں فعل جمع لاتے ہیں اور کہیں فعل واحد جو خلافِ فصاحت ہے اور خود مولانا حمید قلندرؒ کی روش سے ممیز ہے۔

سوال کا جواب تو ختم ہو چکا ہے، تشنۂ تکمیل نہیں رہا ہے، لیکن بعد ازاں کے بعد ہی خیر المجالس میں یہ لکھا ملتا ہے:۔

فرمودند کہ خدمت شیخ نظام الدین	انھوں نے فرمایا کہ حضرت محبوب الٰہیؒ
می فرمود کہ من ہیچ کتابے نہ نوشتہ	نے فرمایا ہے کہ میں نے کوئی کتاب
ام۔ زیرا کہ خدمت شیخ الاسلام	نہیں لکھی ہے، اس لیے کہ شیخ الاسلام
فرید الدین و شیخ الاسلام قطب الدین	فرید الدین نے اور شیخ الاسلام
و خواجگانِ چشت قدس اللہ ارواحہم	قطب الدینؒ اور خواجگانِ چشت
و از مشائخ شجرۂ ما ہیچ شیخے تصنیف	قدس اللہ ارواحہم نے، اور ہمارے
نہ کردہ اند۔	شجرے کے مشائخ میں سے کسی
(خیر المجالس ص ۵۲)	شیخ نے تصنیف نہیں کی ہے،

اس بیان کا آخری جملہ از مشائخ شجرۂ ما الخ میرے ذوق پر گراں گزرتا تھا، جو حشو قبیح ہے، حاشیہ کتاب مذکور دیکھنے سے پتہ چلا کہ معلومہ ایک قدیم نسخے میں یہ جملہ

نہیں ہے، اس سے خیال کو تقویت اور ذوق کو طمانیت ہوئی، اور یہ بات کھل گئی کہ یہ جملہ بیان کی تقویت کے لیے بعد میں الحاق کیا گیا ہے، جس نے بیان کو گنجلک اور مشتبہ کر دیا ہے، اور جو حشو قبیح ہے۔

وہ جملہ جو حضرت محبوب الٰہیؒ سے منقول اور بیان کے آغاز میں مرقوم ہے، فوائد الفواد ص ۵۴ میں بھی ہے، جس کے تعلق نہ نوشتہ ام کی وضاحت کی جا چکی ہے کہ اُس سے مراد مخصوص کتاب سے انکار ہے، جملہ تحریرات سے انکار نہیں ہے، اُسے کسی اور تحریر کے لیے بنیاد بنانا، اور نوشتہ کے مفہوم کو تصنیف کے لیے مخصوص گردانا کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟ کسی بیان سے وہ معنی مراد لینے جو قائل کا مدعا نہیں، تفنن طبع کے بطور تو بیشک روا ہے، ورنہ اس کی گنجائش کہاں ہے، پھر اُسے عبارتِ مابعد کے لیے دلیل بنانا اور عبارت مابعد کو جملہ مذکورہ سے مربوط ظاہر کرنا جو فوائد الفواد میں بھی نہیں ہے، ہرگز صحیح نہیں ہے، یہ عبارت جو گوناگوں معائب سے ہم آغوش ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ مولانا حمید قلندر جیسے شائستہ نگار اہلِ علم کے قلم سے نکلی ہے یا نکل سکتی ہے یا مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ کی فرمودہ ہو سکتی ہے، جو متضاد ہے، اور ادبی اسقام سے بھرپور ہے۔

یہ دونوں بیان باہم متضاد ہیں، پہلے بیان میں ہے:-

"دراں بسیار الفاظ است کہ مناسب اقوالِ ایشاں نیست۔"

دراں بسیار الخ سے کوئی نسخہ جعلی قرار نہیں پا سکتا، نہ کسی کے وجود سے انکار مانا جا سکتا ہے، مگر دوسرے میں صریحاً انکار ہے، لطیفہ یہ ہے کہ مضمون ملفوظات سے متعلق ہے، مگر انکار ہے تصنیف سے، یہ نثر نگار کیا اتنا بھی نہیں جانتا کہ مجموعۂ ملفوظات میں اور تصنیف میں زمین آسمان کا فرق ہے، اگر یہ مان لیا جائے کہ اس بیان کا تعلق محض تصنیف سے ہے، تو بھی تسلیم کرنے کی بہ تکلف ہی گنجائش نکلے گی، کیونکہ معتبر ماخذات میں خواجہ حسن بصری کی تفسیر کا اور رسالہ ابراہیم ادہمؒ کا اور رسالہ شیخ علو دینوری کا

ذکر ملتا ہے، اگر سید دش ناپسندیدہ ہوتی، تو شیخ جمال الدین ہانسوی کی تصنیفات کا ذکر کیوں ملتا؟ [۱]

اگر کتبِ ملفوظات کے وجود سے انکار ہی مقصود تھا تو ایک کے بعد دوسرے بیان کی "اور دراں بسیار الفاظ الحق" کے کھڑاک میں پھنسنے کی ضرورت ہی کیا تھی، ایک ہی جملے میں کام تمام تھا، کہہ دیا ہوتا کہ "کتبِ ملفوظات کہ از مشائخ ما منسوب کردہ اند، از ایشاں نیست"، نہ تو حضرت محبوب الٰہیؒ کے بیان کو دلیل بنانے کی ضرورت تھی، اور نہ مشائخ شجرۂ ما کا بدنما پیوند لگانے کی ضرورت تھی، نہ بے امتیازی سے مجموعۂ ملفوظات کو تصنیف کہنے کی ضرورت تھی، جو بجز معلومات کا بدنما داغ ہے، یہ کھڑاک غماز ہے کسی اور ہی کارستانی کا،

ع شب کی خبر دیتی ہے آنکھ شرمائی ہوئی

اس بیان کو میرے نزدیک مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ سے منسوب سمجھنا یا منسوب بتانا غلط فہمی کی علامت ہے، مولانا حمید قلندرؒ کو بھی متہم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان کی کتاب میں عموماً یہ گنجلک اور ناہمواری نہیں ہے، حضرت مخدومؒ کو صاف دلی سے جو بات کہنی تھی، کہہ دی تھی کہ "دراں بسیار الفاظ است" ان کے بیان سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ کتبِ ملفوظات کے قائل نہ تھے۔

مشائخ چشت رحمہم اللہ کی کتب ملفوظات سے انکار متقدمین سے ہرگز ثابت نہیں، بلکہ اس کے برعکس اقرار ثابت ہے۔

مشائخ چشت کی کتب ملفوظات سے انکار ہرگز قرین قیاس نہیں اور جعلی بتانا کھلی نادانی ہے، اگر یہ کوئی حقیقت ہوتی تو شمائل الاتقیاء جو شیخ رکن الدین عمادؒ کی

---

[۱] شیخ جمال الدین ہانسویؒ کی تصنیف میں ان کے دو دیوان دیوان قطب ہانسوی اور کتاب ملہمات ہے دونوں دیوان ۱۸۸۹ء میں طبع ہو چکے ہیں اور ان کا مطبوعہ نسخہ میرے پاس ہے کتاب ملہمات بھی شائع ہو چکی ہے البتہ کمیاب ہے۔

ایما سے تصنیف ہوئی، اس کی فہرست مآخذات میں ان میں سے اکثر کا ذکر کیوں ہوتا شیخ برہان الدین غریبؒ حضرت محبوب الٰہیؒ کے بزرگ خلفا میں سے تھے، جن کی عمر کا طویل زمانہ حضرت محبوب الٰہیؒ کی خدمت وصحبت میں گزرا تھا، مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ بھی انھیں عزیز ومحترم جانتے تھے، ان کی وفات کے بعد تا دم آخر ان کا عرس کرتے رہے لہ، وہ اپنے شیخ کے نظریات سے سرمو تجاوز نہیں کر سکتے تھے، اگر کتب ملفوظات جعلی ہوتیں تو ہرگز ان سے منسوب کرنا گوارا نہ کرتے۔

امیر خورد کرمانیؒ نے اسی خوش گوار روحانی ماحول میں پرورش پائی تھی، اگر اس عہد میں کتب ملفوظات کو جعلی یا مشتبہ خیال کیا جاتا تو بعض ملفوظات کا ذکر ان کے زبان قلم پر کیوں آتا؟ ٢ اسی عہد میں مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے معتقد مرید مولانا محمد مجیر وجیہہ ادیبؒ نے مفاتح الجنان تصنیف فرمائی، جس میں ملفوظات مشائخ چشت سے بھی استفادہ کیا ہے، ان کے ماخذات میں خیر المجالس بھی ہے، مفاتح الجنان کو بنظر اصلاح خواجہ کمال الدین علامہؒ نے بھی دیکھا تھا، اگرچہ خیر المجالس میں یہ اذکار رفتہ بیان ہوتا تو اس سے وہ ضرور متاثر ہوتے اور اپنے شیخ کے نظریہ کو ہرگز نظر انداز نہ کرتے، تواتر سے ثابت ہے کہ عہد بہ عہد ثقہ اہل قلم کتب ملفوظات سے استفادہ کرتے رہے ہیں، سید محترم سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب لکھتے ہیں:۔

"حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کا ابتدائی زمانہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ ہی کا تھا، ان کی وفات ۷۸۲ھ میں یعنی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے وصال کے ۵۷ سال بعد ہوئی، ان کے مجموعۂ ملفوظات "خوان پر نعمت" میں صاف طور پر ذکر ہے کہ شیخ عثمان ہارونیؒ

لہ خیر المجالس ص ۸

٢ سیر الاولیاء ص ۴۷-۷۶-۱۱۸-۲۰۰-۲۷۸-۳۰۸-۲۹۶-۴۹۱-

کے ملفوظات کو حضرت خواجہ معین الدینؒ نے جمع کیا ہے' (ص ۸۸) اسی طرح ان کے مجموعۂ ملفوظات مخ المعانی میں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے ملفوظات کے حوالے ہیں (ص ۴۹-۵۱) اُن سے حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ نے استفادہ بھی کیا ہے' پھر شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے مطالعہ میں بھی ملفوظات رہے' انھوں نے واضح طور پر اخبار الاخیار میں لکھا ہے کہ خواجہ بختیار اوشیؒ نے حضرت خواجہ معین الدین قدس سرہٗ کے ملفوظات جمع کیے[1] (ص ۲۴۲) اور حضرت گنج شکرؒ کے ملفوظات شیخ نظام الدین اولیاؒ نے مکتوب کیے[2]
(ص ۵۲ معارف اعظم گڑھ مارچ ۱۹۷۹ء)

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے مطالعہ میں بھی خیر المجالس تھی۔ انھوں نے تین صفحے سے زیادہ اس سے استفادہ کیا ہے' پھر کیا وجہ ہے کہ کوئی بھی خیر المجالس کے مذکورہ بیان سے متاثر نہیں' نیز مشائخ چشت کی کتب ملفوظات سے متواتر آج تک استفادہ کیا جا رہا ہے' اور کوئی بھی الحقیں جبلی مان کر نظر انداز نہیں کرتا۔ دراں حالیکہ مذکورہ بیان کو حضرت محبوب الٰہیؒ سے منسوب' اور مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ سے منقول بتایا گیا ہے' پھر یہ اعتنائی کا سبب کیا ہو سکتا ہے؟ دو باتوں میں سے ایک بات ماننی پڑے گی' یا تو یہ بیان خیر المجالس کے قدیم نسخوں میں نہیں ہے جو زیادہ قرین قیاس ہے' یا اگر ہے تو جیسا بتایا جا چکا ہے کہ یہ وہ اونٹ ہے جس کی کوئی کل سیدھی نہیں' ثقہ اہل قلم نے اسے درخور اعتنا نہیں سمجھا' اور نظر انداز فرماتے رہے' اگر ایسا کیا ہے تو یہ ان کی نکتہ دانی اور بصیرت باطنی کی دلیل ہے۔

---

[1] در دلیل العارفین کہ خواجہ قطب الدین بختیار اوشیؒ از ملفوظات خواجہ قدس سرہٗ جمع کردہ۔
[2] بعضے از ملفوظات گنج شکرؒ کہ بخط شیخ نظام الدین اولیاؒ یافتہ اند مکتوب می گردد (اخبار الاخیار ص ۵۲)۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت بابا صاحبؒ کے ملفوظات مولانا بدرالدین اسحاقؒ نے بھی جمع کیے تھے۔ "وے را رسالہ ایست مسمّٰی اسرار الاولیاء کہ دروے ملفوظات گنج شکرؒ را جمع کردہ (اخبار الاخیار ص ۶۷)

البتہ چودھویں صدی کے تنقید نگاروں کو یہ شگوفہ ہاتھ لگا ہے۔

بہر حال خیر المجالس کی زیر بحث عبارت ہرگز لائق اعتنا نہیں اور اس کے پیش نظر مشائخ چشت رحمہم اللہ تعالیٰ کی کتب ملفوظات کو جعلی قرار دینا درست نہیں۔

۲۹۔ جعلی کے واہمہ کو ذہن نشین کرانا اس واہمہ کو کہ کتب ملفوظات جعلی ہیں، ذہن نشین کرانے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کی گئی ہے، فوائد الفواد ہی کے بیان کو جس کا ایک جملہ اس سے پہلے بیان میں نقل ہو چکا ہے مسخ شدہ صورت میں دہرایا اور لکھا ہے:۔

بندہ عرض داشت کرد کہ در فوائد الفواد آمدہ است کہ شخصے بخدمت شیخ نظام الدین قدس اللہ سرہ العزیز عرض داشت کرد کہ من بر شخصے کتابے دیدہ ام از تصنیف شیخ۔ خدمت شیخ فرمودی۔ او تفاوت گفتہ است من ہیچ کتابے تصنیف نہ کردہ ام، و خواجگان ما نیز نہ کردہ اند، خواجہ سلمہٗ فرمودند، آرے خدمت شیخ ہیچ کتابے تصنیف نہ کردہ است، باز بندہ عرض داشت کرد کہ ایں نسخہ ہا دریں وقت پیدا شدہ است، ملفوظات شیخ قطب الدینؒ و شیخ عثمان ہارونیؒ در حیات خدمت شیخ نہ بود؟ خواجہ فرمودند، نہ بود۔ اگر بودے خدمت شیخ فرمودے و پیدا شدے، (خیر المجالس ص ۵۳)

قطع نظر اس سے کہ فوائد الفواد کے حوالے سے جو عبارت منقول ہے، بعینہٖ وہ فوائد الفواد میں نہیں ہے، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب پہلے ہی بیان میں یہ موجود ہے کہ خواجگان چشتؒ و از مشائخ شجرۂ ما ہیچ شخصے تصنیف نہ کردہ است (ص ۵۲) تو اس سے تسلی کیوں نہیں ہوئی، کیا خامی رہ گئی تھی جس کو رفع کرنے کے لیے مکرر دریافت کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی؟ ہے کوئی جو یہ کہہ سکے کہ یہ سات سطری بیان تحصیل حاصل نہیں ہے جس سے کتاب کا اعتبار و رسوخ مجروح ہوتا ہے، یہی دلیل ہے اور روشن دلیل ہے کہ جعلی کے واہمہ کو تقویت دینے اور ذہن نشین کرانے کی یہ بے جا کوشش کی گئی ہے۔

جس نے حقیقت کے چہرے سے نقاب الٹ دیا ہے۔

یہ بتایا جا چکا ہے کہ جو عبارت اس بیان میں فوائد الفواد کے حوالے سے نقل ہے وہ بعینہٖ فوائد الفواد کی عبارت نہیں ہے، بلکہ مسخ شدہ ہے، اَنمل، بے جوڑ اور اغلاط کی دلدل ہے جس کا تجزیہ مناسب محل ہوگا۔

متکلم کا بیان ہے "من بشخصے کتابے دیدہ ام از تصنیف شیخ"، متکلم نے کہیں کسی کے پاس کتاب دیکھی، غالباً اسی مماثلت سے اس کو شبہ ہوا اور وہ سمجھا کہ یہ شیخ کی تصنیف ہے۔ یہ رائے دیکھنے والے نے خود قائم کی ہے، یہ بات اسے کسی نے سکھائی یا بتائی نہیں ہے کہ شیخ کی تصنیف ہے، اس جزو کے متعلق اتنا ہی ذہن نشیں رکھنا کافی ہے۔

جملہ کا آخری حصہ ہے "از تصنیف شیخ" یہ مبہم ہے، لفظ شیخ وضاحت چاہتا ہے کہ شیخ سے مراد کون بزرگ ہیں، یہ جملہ حضرت محبوب الٰہیؒ کے روبرو بولا گیا ہے، قرینہ یہ بتاتا ہے کہ شیخ سے مراد متکلم کی حضرت محبوبِ الٰہیؒ ہیں، محل گفتگو اور آدابِ مجلس کا تقاضا یہ ہے کہ شیخ کے ساتھ تعظیمی الفاظ کا اضافہ بھی ہوتا، تاکہ دلالت تشنۂ تکمیل نہ رہتی خصوصاً اس لیے کہ حضرت محبوب الٰہیؒ کی مجلس وہ مجلس تھی، جہاں اچھے اچھے باکمال عجز و نیاز سے سر بہ خم رہتے تھے، صرف شیخ کہنا اور حضرت محبوب الٰہیؒ کے روبرو کہنا ہرگز مقتضائے حال کے مطابق نہیں ہے۔

اس کے بعد اس بیان کا جواب ہے جو حضرت محبوبِ الٰہیؒ کی زبانی نقل کیا ہے۔ یہ بھی فوائد الفواد کی مسخ شدہ عبارت ہے، جس میں ایک جملہ کا اضافہ بھی ہے، یہ عبارت اغلاط سے بھرپور، بے محل اور کسی ایسے شخص کی مسخ کردہ ہے جو بالکل ہی مبتدی ہے، بلکہ مبتدی سے بھی گیا گزرا ہے، جو ہرگز مذکورہ بیان کا جواب نہیں، اسے بطور جواب کے حضرت محبوب الٰہیؒ سے منسوب کرنا درست نہیں ہے، وہ مبتدی جسے فارسی میں ذرا بھی شُدبُد ہے، وہ بھی مذکورہ بیان کا یہ جواب نہیں دے سکتا، جو حضرت محبوب الٰہیؒ سے

منسوب کر دکھایا ہے جو عالم و عارف، زبان دان و اہل زبان اور برگزیدہ و عمر رسیدہ بزرگ تھے، جواب یہ ہے :-

"او تفاوت گفتہ است، من ہیچ کتاب تصنیف نہ کردہ ام، و خواجگان ما نیز نہ کردہ اند۔"

متکلم و مخاطب موجود ہے، پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ "او تفاوت گفتہ است" فعل بھی بصیغۂ غائب اور ضمیر بھی بصیغۂ غائب، متکلم نے جو کچھ کہا ہے، اپنے صوابدید سے کہا ہے، اس سے کسی نے کچھ کہا سنا نہیں ہے، ضمیر و فعل دونوں بصیغۂ حاضر ہونے چاہئیں، افعال و ضمائر کی ایسی غلطیاں تو مبتدیوں سے بھی کم ہی ہوتی ہیں چہ جائیکہ کسی پڑھے لکھے سے صادر ہوں اور جو اہل زبان بھی ہو حضرت محبوب الٰہیؒ فرماتے تو کچھ اس طرح فرماتے :

"تفاوت دیدہ"، "تفاوت می گوئی"

بلاشبہ یہ تفاوت کثیرہ بعض جملے فوائد الفواد سے منقول ہیں، ناقل پہلے جملے کے محل استعمال سے ناواقف ہے، دوسرے جملے میں "نہ نوشتہ ام" کو "تصنیف نہ کردہ ام" کر دیا ہے، تیسرے جملے کا اضافہ کیا ہے جو حشو قبیح ہے بلکہ افترا ہے، یہ ہے وہ ساری کائنات جو کتب ملفوظات کو جعلی بتانے کی بنیاد ہے، مولانا حمید الدین قلندرؒ سے تو یہ ہرگز توقع نہیں کہ وہ یہ بے سر و پا عبارت لکھتے۔ کہنے والا یہ کہتا ہے کہ میں نے دیکھی ہے، جواب دینے والا کہتا ہے کہ وہ غلط کہتا ہے، یہ کیا منطق ہے، کہنا تھا: تم نے غلط کہا ہے۔ تعجب ہے اُن دانشوروں پر جو اس بے ربط عبارت کو بنیاد بنا کر کتب ملفوظات کو جعلی بتا رہے ہیں، جناب محترم سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب کا یہ فرمانا بجا ہے :

"یہ وہ لوگ ہیں جو ہماری مذہبی روحانی اور ثقافتی وراثت کا تمسخر کر کے ہم کو اپنے ماضی کی عظمت سے بے گانہ کرنا چاہتے ہیں۔"

(معارف اعظم گڑھ ص ۴۲۳، ۴۲۴ ۱۹۷۹ء)

تاکہ خالی الذہن ہو کے مادی قارئوں کو آسانی سے قبول کر لیا جائے، سچ ہے کہ جو قومیں تنزل کے گڑھے میں گرنے لگتی ہیں، یا گر چکی ہوتی ہیں، ان کے اسلاف کو اسی طرح ہدفِ ملامت بنایا جاتا ہے۔ تقریباً یہی صورتِ حال یہاں ہے۔

۳۰۔ **تراجم کی کیفیت** مشائخ چشت رح کے ملفوظات کے جو تراجم دستیاب ہوتے ہیں وہ فارسی متن سے بھی زیادہ مخدوش اور غلط ہیں، وہ روایت جو حضرت خواجہ عثمان ہرونی رح کے مجموعۂ ملفوظات میں ہے، وہ متن میں کس طرح ہے اور ترجمے میں اس کا کیا رنگ روپ ہے، دیکھنے کے لائق ہے، فارسی متن میں ہے:-

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرد	عبداللہ بن مسعود رض نے رسول اللہ
از رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر کہ	صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ
چہل مادہ گاؤ بسمل کند خون یک	جو چالیس گائیں زخمی یا ذبح کرتا ہے
گناہ در نامۂ اعمال او بنویسند وہر کہ	اس کے نام ایک خون لکھتے ہیں اور
دہ گوسفند بسمل کند یک خون بنام او	جو دس بھیڑیں زخمی یا ذبح کرتا
بنویسند ہر کہ جانورے را بہوائے	ہے، اس کے نام ایک خون لکھتے
نفس بسمل کند ہچناں باشد کہ	ہیں، جو کوئی کسی ایک جانور کو
ویراں کردن خانۂ کعبہ یاری کردہ	نفسانی خواہش سے زخمی یا ذبح
باشد، مگر بہ مجلسے کہ دراں روا	کرتا ہے وہ ایسا ہے کہ اس نے خانۂ
باشد۔	کعبہ کو ویران کرنے میں مدد کی ہے،
(انیس الارواح ص ۲۷)	مگر جس کسی مجلس میں روا ہے، روا ہے"

اس روایت میں خون یک گناہ کی ترکیب محل نظر ہے۔ گناہ یک خون مناسب ہوتی۔ یہ روایت بطورِ حدیث مروی ہے، صوفیائے کرام کا حدیث کے باب میں مسلک یہ ہے کہ حالت اطلاق میں رہنے دیا جائے، حضرت محبوبِ الٰہی رح کا ارشاد ہے:-

فارسی	اردو ترجمہ
حدیثے کہ مردم بشنوند نتواں گفت	جو حدیث سنیں تو یہ نہ کہنا چاہیے
کہ ایں حدیث رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)	کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی
نیست، اما ایں تواں گفت کہ در	حدیث نہیں ہے، مگر یہ کہہ سکتا
کتبے کہ ایں احادیث جمع کردہ اند	ہے کہ جن کتابوں میں انھوں نے
واعتبار یافتہ اند، نیامدہ است،	(محدثین نے) حدیثیں جمع کی ہیں اور
(فوائد الفواد ص ۲۳۳)	وہ معتبر مانی گئی ہیں (ان میں یہ
	حدیث) نہیں ہے۔

لہٰذا اس حدیث کو حالت اطلاق میں رہنے دیا جائے گا، البتہ یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے کہ اس مجموعۂ ملفوظات میں صحت کے ساتھ نقل نہ ہو سکی ہو، اس روایت کا ترجمہ مولوی غلام احمد خاں بریاں مرحوم نے یہ کیا ہے:

"عبداللہ بن مسعودؓ نے حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ جو شخص چالیس گایوں کو ذبح کرے، ایک خون اس کے نام لکھا جاتا ہے اور جو شخص سو بکریاں ذبح کرے اس کے نام بھی ایک خون تحریر کرتے ہیں اور جو شخص جانور کو ہوائے نفس سے ذبح کرتا ہے، اس کا حال ایسا ہے جیسا کہ اس نے خانۂ کعبہ کے ڈھانے میں مدد کی، مگر ان کا ذبح کرنا اس محل میں روا ہے جہاں ان کا ذبح کرنا درست ہے۔"

(مجموعۂ ملفوظات خواجگان چشت ترجمہ انیس الارواح ص ۳۰)

"خون یک گناہ" کا ترجمہ "ایک خون" کیا ہے، "نامۂ اعمال" کا ذکر ہی نہیں، "دہ گوسفند" دس بھیڑوں کا ترجمہ سو (صد) بکریاں کیا ہے۔ بھیڑ بکری ہیں یا عقبار لغت مترادف نہیں،

لہ موضوعات سے متعلق مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ اس طرح ارشاد فرماتے تھے کہ ایں حدیث از مفتریان است درکتب مشہور نیست (خیر المجالس ص ۲۰۲) مگر اس حدیث کے باب میں کچھ بھی ارشاد نہیں فرمایا جو حیرت انگیز ہے۔

'بھی' کا اضافہ ہے، 'جانورے' کی یائے وحدت یا تنکیری کا ترجمہ محذوف ہے، 'ویران' کا ترجمہ ڈھانے کیا ہے، ویران لغت میں اجاڑ اور غیر آباد کو کہتے ہیں' ڈھانے کو نہیں کہتے متن میں مجلسے ہے، جو غالباً کاتب کا سہو ہے، محلے ہو سکتا ہے اس کا ترجمہ 'محل' قرین قیاس ہے، اصل اور ترجمہ میں جو فرق ہے، وہ ظاہر ہے، اسی روایت کا ذکر بقول مولانا حمید قلندر، مخدوم نصیر الدین چراغ دہلی کی مجلس میں آیا تھا اور اس طرح آیا تھا:

ایشاں (خواجہ عثمان ہرونی) فرمود	انھوں نے (خواجہ عثمان ہرونیؒ)
اند ہر کہ دو مادہ گاؤ ذبح کند یک	نے فرمایا ہے جو کوئی دو گائیں ذبح
خون کردہ باشد و ہر کہ چہار مادہ	کرے اس نے ایک خون کیا اور جو
گاؤ ذبح کند دو خون کردہ باشد،	چار گائیں ذبح کرے اس نے
و ہر کہ دہ گوسفند ذبح کند یک خون	دو خون کیے، جو دس بھیڑیں ذبح
کردہ باشد، و ہر کہ بست گوسفند	کرے اس نے ایک خون کیا اور
ذبح کند دو خون کردہ باشد،	جو بیس بھیڑیں ذبح کرے اس نے
(خیر المجالس ص ۵۲)	دو خون کیے۔

انیس الارواح میں چہل مادہ گاؤ ہے، خیر المجالس میں دو مادہ گاؤ ہے، زمین و آسمان کا فرق ہے، لطف یہ ہے کہ جو صلہ چالیس کا ہے وہی دو کا ہے، پھر دوگنی تعداد بیان کی ہے، اسی کے مطابق صلہ بتایا ہے، اس کی ضرورت کیا تھی، البتہ دہ گوسفند بدستور ہے۔ بکریاں کی طرح منّو نہیں بنایا ہے، مگر دوگنی تعداد اس کی بھی بیان کی ہے جو بالکل بے مصرف ہے میں حیران ہوں کہ مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ کی جناب میں ایسی گفتگو بھی ہوتی تھی، پھر مولانا حمید قلندرؒ جو اچھے انشاء پرداز تھے، انھوں نے کیسے گوارا کر لیا، اور جوں کا توں نقل کر دیا، جو بیان کا بھی نقص ہے، اور انشاء کا بھی، البتہ یہ ممکن ہے کہ مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ کی جناب میں نہ یہ ذکر آیا ہو اور نہ مولانا حمید قلندرؒ نے اسے قلم بند کیا ہو،

اور یہ کسی اور ہی کی کارستانی ہو۔

خیر المجالس کی روایت از اول تا آخر نا تمام ہے، یہ ذکر ہی نہیں کہ بطورِ حدیث اسے ذکر کیا ہے ورنہ ممکن تھا حضرت مخدوم کا جواب کچھ اور ہی ہوتا اور بصیرت افروز ہوتا، اس سے تو یہ بیان مشتبہ ہو جاتا کہ 'ایں نسخہ با برہمن رسیدہ است' اگر یہ صحیح ہے تو جواب ایسا ہو جاتا ہے جس سے پوری روایت متاثر ہوتی البتہ جس طرح بیان کیا گیا ہے اس کے متعلق یہ کہنا صحیح ہے کہ 'ایں ملفوظ ایشاں نیست' کچھ بھی سہی یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ خیر المجالس کی یہ روایت مخدوش ہے، واقعہ کی صحیح عکاسی نہیں ہے، اور خواجہ عثمان ہرونیؒ سے مطلقاً منسوب بتانا دروغ بیانی ہے، خیر المجالس کے مترجم مولوی احمد علی ٹونکی مرحوم نے یہ ترجمہ کیا ہے۔

ایک عزیز نے اہلِ محفل سے عرض کی کہ ملفوظ حضرت خواجہ عثمان ہارونیؒ قدس اللہ سرہ العزیز میں لکھا ہوا ہے کہ درویشوں کا مقولہ ہے کہ جو دوگائے ذبح کرے اس نے گویا دو خون کیے، جو چار ذبح کرے گویا چار خون کیے، اور جو چار گوسفند ذبح کرے اس نے گویا ایک خون کیا۔ (سراج المجالس ص ۳۵)

کون کہہ سکتا ہے کہ یہ اسی عبارت کا ترجمہ ہے جو خیر المجالس میں ہے، خیر المجالس میں دو گائیں ذبح کرنے کا صلہ ایک خون ہے جو اس ترجمہ میں دو خون ہو گیا ہے، اور چار کے عوض دو خون کی بجائے چار خون ترجمہ فرمایا ہے، خیر المجالس میں دس بھیڑوں کے ذبح کرنے کا صلہ ایک خون ہے، ترجمہ میں چار کے ذبح کرنے کا صلہ ایک خون ہے، انیس الارواح میں مثل حدیث مروی ہے، خیر المجالس میں خواجہ عثمان ہرونیؒ کا مقولہ ہے، مترجم نے درویشوں کا مقولہ بتایا ہے، غرض کہ جتنے منہ اتنی باتیں۔ اس ایک ہی روایت سے ترجمے کی کیفیت آئینہ ہو جاتی ہے، وہ کیسے دانشور ہیں جو ایسے ترجموں کو تنقید کی بنیاد قرار دیتے ہیں اور لکھتے ہیں

"اس وقت میرے سامنے کوئی فارسی متن نہیں ہے، اس مضمون میں جتنے حوالے دیے گئے ہیں، وہ اس اردو ترجمہ کے ہیں جو 'ہشت بہشت' کے

> نام سے ۱۹۵۷ء میں لاہور سے چھپا تھا......... اگر مترجم نے کہیں فارسی متن سے انحراف کیا ہو تو میں فی الوقت اس کی تصحیح سے قاصر ہوں۔
> (منادی دہلی ص ۱۷۰ حاشیہ بابا فرید نمبر جلد ۴۹ شمارہ ۴-۵-۶ ۱۹۷۴ء)
>
> اصل فارسی کتاب میں نے دیکھی ہے، مگر یہ مضمون لکھتے وقت میری دسترس میں نہیں ہے، اگر مترجم نے کہیں ترجمہ میں غلطی کی ہو تو میں اس کی نشاندہی سے قاصر ہوں (منادی دہلی ص ۷۷ (حاشیہ) بابا فرید نمبر جلد ۴۹ ۱۹۷۴ء)

کیا یہ کوئی معقول معذرت ہے، فارسی متن نہ سہی مگر غلط تراجم کو محور بنانا چہ معنی دارد؟ بہر حال! کتب ملفوظات کے فارسی متن کمیاب تو ہیں، مگر نایاب نہیں، لائبریریوں سے بآسانی دستیاب ہو جاتے ہیں، یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ کام کرنے میں کتنا وقت لگا، اور کن حالات میں کیا گیا ہے، بلکہ دیکھتے یہ ہیں کہ کیا کیا ہے اور کیسا کیا ہے؟ تنقید نگار لکھتے ہیں:

> جعلی ملفوظات کے تمام ذخیرے کے انداز اور ترتیب میں حیرت انگیز یکسانی پائی جاتی ہے، چنانچہ انیس الارواح، دلیل العارفین، فوائد السالکین، راحت القلوب، اسرار الاولیا، افضل الفوائد سب کا ایک سا ہی انداز ہے۔ (منادی دہلی ص ۹۳، بابا فرید نمبر ۱۹۷۴ء)

ناقص اردو تراجم کو پڑھ کر شاید موصوف نے یہ رائے قائم کی ہے، کہنے کا مدعا یہ ہے کہ تراجم کی حالت فارسی متن سے بھی گئی گزری ہے، تراجم کے مطالعہ سے، خیر زبان کے اسلوب کے متعلق رائے قائم کرنا ہرگز درست نہیں، پھر ان غلط تراجم کی روشنی میں اس روش کو صحیح اور جائز کیسے کہا جا سکتا ہے۔

وقت کا تقاضا | وقت کا تقاضا یہ ہے کہ بزرگان دین کے سب ہی عقیدت مند اس ضرورت کو محسوس کریں، اور مل کے بیٹھیں اور غور کریں کہ ملفوظات کے خلاف جو محاذ قائم

کیا جا رہا ہے، یہ کیوں؟ غور و فکر سے بات کی تہہ کو پہنچ جائیں گے، اور تدارک کے لیے لائحہ عمل تجویز کر دیا جائے گا، جو بالاتفاق طے ہو، اس پر عمل کیا جائے تو خاطر خواہ یہ فتنہ فرو ہو سکتا ہے۔

ہلکی سی تدبیر یہ ہے کہ قدیم ملفوظات کے مائکرو فلم یا ان کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں فراہم کی جائیں، جو آسانی سے دستیاب ہو سکتی ہیں، ان کے باہمی مقابلے سے ان کی تصحیح کی جائے اور انھیں شائع کر دیا جائے، اور مختلف زبانوں میں ان کے تراجم شائع کیے جائیں، اردو، ہندی، پنجابی، پوربی، بنگالی، گجراتی، راجستھانی، تامل، تلنگی، مہاراشٹری، غرض کہ ہندوستان کی ہر زبان میں اور انگریزی میں بھی نہایت استقلال اور حزم و احتیاط سے اور کامل اخلاص کے ساتھ اس کام کو کیا جائے، اور نشر و اشاعت کی بھی کوشش کی جائے۔

ہر کتاب پر سیر حاصل مقدمہ لکھا جائے اور پوری صحت سے اعتراضات کے جواب دیے جائیں، اور غلط بیانیوں کو سلیقہ سے رفع کیا جائے، اگر کامل استقلال سے کام لیا جائے گا، تو یہ فتنہ رفع ہو جائے گا، اور اچھا معاشرہ رواج پائے گا جو مقصود اصلی ہے ان ملفوظات کا۔ لیکن اس کے لیے باہمی اتحاد و اشتراک ضروری ہے۔ مجھے توقع ہے کہ اولیاء اللہ کے عقیدت مند اس ضرورت کو محسوس کریں گے اور اپنے اپنے حلقے میں کام شروع کر دیں گے، پہلا قدم یہی ہے کہ ملفوظات کے فارسی نسخوں کو صحت کے ساتھ شائع کیا جائے، اگر مستعدی سے کام کیا جائے گا تو اشاعت بھی آسان ہو جائے گی یہ تحریک ہے، جب عمل کا آغاز ہوگا تو جو موانع حائل ہوں گے، رفع ہوتے رہیں گے۔

؏ بندہ کام و کامیکہ خواہی بیاب

—— بشکریہ معارف، اعظم گڑھ
اگست، ستمبر، اکتوبر، نومبر ۱۹۷۹ء

اخلاق حسین دہلوی

فوائد السالکین کا مطالعہ

" حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مجموعۂ ملفوظات فوائد السالکین کا مطالعہ ذیل کے مضمون میں جس طرح کیا گیا ہے، اس سے ہمارے ناظرین کی تشفی اور تسلی ہو جائے، تو فاضل مضمون نگار کی سعی مشکور ہوگی، یہ یقین ہے کہ اگر فاضل مضمون نگار نے فوائد السالکین کے قدیم اور مختلف نسخوں کو سامنے رکھ کر اس کو فاضلانہ انداز میں مفید حواشی اور تعلیقات کے ساتھ ایڈٹ کیا تو یہ نہ صرف ایک بڑی خدمت ہوگی، بلکہ سنین اور اسماء کے غلط اندراج و کتابت سے جو غلط فہمی پیدا ہو رہی ہے، وہ بھی دور ہو جائے گی، اور خواجگان چشتؒ کے قدائی ان کے ملفوظات کے روحانی سرمایہ سے برابر مستفیض ہوتے رہیں گے۔" [1]

"معارف"

تعارف | فوائد السالکین فارسی نسخہ مطبوعہ سنہ ۱۳۱۰ھ (1892) مطبع مجتبائی، دہلی (انڈیا)، حجم ۱۴۳ صفحات، سائز $\frac{۲۰×۲۶}{۸}$ سطر ۱۹ سطری، یہ کتاب قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہ العزیز المتوفی سنہ ۶۳۳ھ (1234) کے گراں قدر ملفوظات کا مجموعہ ہے، جسے حضرت بابا فرید مسعود گنج شکر قدس اللہ سرہ العزیز متوفی سنہ ۶۶۴ھ (۱۲۶۷ء) نے مدون فرمایا تھا، یہ مجموعۂ ملفوظات

---

[1] راقم حروف اخلاق حسین دہلوی نے حسب ہدایت کام شروع کر دیا ہے، کچھ قلمی نسخوں کے مائکرو فلم آ گئے ہیں۔ کچھ کے آنے ہیں۔ جن کے فلم تیار نہیں ہو سکتے ان کے لیے سفر کی راہ اختیار کرنی ہوگی۔ ناظرین سے اس مقصد میں کامیابی کے لیے دعا کی درخواست ہے ——— اخلاق حسین دہلوی

سات مجالس پر مشتمل ہے، ہر مجلس کے آغاز میں لفظ مجلس اور اس کا شمارہ جلی قلم سے لکھا ہوا ہے، جس سے مجالس کی ترتیب بخوبی واضح ہے، ابتدائیہ میں ہے :-

"از زبانِ فقیر حقیر بندۂ درویشاں ملکہ خاکِ قدمِ الشیاں فرید مسعود اجودھنی"[1]

(فوائد السالکین ص۲)

فوائد السالکین کے ناشر مولوی عبدالاحد مرحوم نے خاتمہ پر لکھا ہے :-

اصل ایں نسخہ صحیح نہ بود ہر چند کہ	اس نسخہ کی اصل یعنی وہ نسخہ جس سے
نسخہ دیگر پیدا شد تاہم فیمابین	مطبوعہ نسخہ منقول ہے، صحیح نہ تھی، اور
مغایرتے یافتہ شد لیکن بقدر	اگرچہ دوسرا نسخہ بھی دستیاب ہوا تھا
وسع در رفع اغلاط کوشیدہ آمد۔	لیکن دونوں میں فرق بہت تھا، لہٰذا
(فوائد السالکین ص۲۰)	بقدر امکان رفع اغلاط کی کوشش کی ہے،

مولوی عبدالاحد مرحوم نے جو بھی تصحیح فرمائی ہے، وہ بساغنیمت اور لائق شکریہ ہے تاہم مطبوعہ نسخہ بھی اغلاط سے پاک نہیں ہے لیکن اگر وہ طبع نہ کرتے تو ممکن تھا کہ ہم اس کے مطالعے کی سعادت سے محروم رہتے، کیا اچھا ہوتا جو موصوف یہ بھی لکھ دیتے کہ نسخہ دیگر میں متبادل کیا کیا کچھ تھا، اور جو نسخہ انھیں دستیاب ہوا تھا، وہ کس عہد کا مکتوبہ تھا، کیونکہ ایسے نسخوں کا بھی رواج رہا ہے جو ان پڑھ عقیدت مند اچھے اچھے خوشنویسوں سے نقل کراتے،

---

[1] اجودھنی میں کلام ہے کیونکہ اجودھن (پاکپتن) میں حضرت بابا صاحبؒ کا قیام عمر کے آخری ربع میں تھا، اس سے پہلے نہ تھا، ایسا لگتا ہے کہ فرید اجودھنی چونکہ زبان زد خلائق ہے اور سلاسل کے شجرات میں بھی شامل ہے، جو اکثر پڑھے جاتے ہیں، لہٰذا کسی کاتب و ناقل نے یا کسی مطالعہ کرنے والے نے بطور تعارف اپنے صوابدید سے اجودھنی کا اضافہ کر دیا ہے جو نقل ہوتا چلا گیا ہے، ایسے تصرفات قلمی نسخوں میں ملتے ہیں جن سے صرف نظر انداز کرنا پڑتا ہے، اس لیے کہ کسی کتاب کے استناد کا دار و مدار شطحیات پر نہیں حقائق پر ہوتا ہے۔

اور تبرکاً اپنے پاس رکھتے تھے، جو عموماً صحت سے عاری ہوتے تھے،

مطلوب الطالبین کے نام سے فوائد السالکین کا اردو ترجمہ بھی مولوی عبدالاحد مرحوم نے ۱۳۱۶ھ/1898 میں مطبع مجتبائی دہلی سے شائع کیا تھا، اس کے مترجم محمد بیگ نامی کوئی ذی ہوش عالم تھے، انھیں اس مجموعۂ ملفوظات کے ناقص ہونے کا احساس تھا، انھوں نے دیباچہ میں لکھا ہے:-

"اس میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے ملفوظات ہیں جن کو حضرت باباصاحبؒ نے خود جمع کر کے مرتب کیا ہے، غالباً یہ کتاب بڑی ہوگی، جو مرور زمانہ سے پوری نہیں ملتی—

(مطلوب الطالبین ص ۲)

مترجم کا یہ احساس بلاشبہ بجا و درست ہے، قلمی نسخوں کو اسی طرح دیکھنا اور پرکھنا چاہیے، فوائد السالکین بظاہر موجودہ صورت میں کامل نہیں ہے، شاہ محمد بولاق مرحوم نے روضۃ الاقطاب تالیف ۱۱۲۴ھ/1712 (مطبوعہ ۱۳۰۵ھ/1887 مطبع محبّ ہند دہلی) میں فوائد السالکین سے ایک روایت نقل کی ہے، جو فوائد السالکین کے مطبوعہ فارسی نسخہ میں نہیں ہے، اور وہ یہ ہے:-

"وقتے در خدمت خواجہ قطب الدین قوالاں در رسیدند و ایں بیت را بصوت زیبا و آہنگ دل ربا آغاز گردانیدند—

بیت

سرود چیست کہ چندیں فسون عشق دروست
سرود محرم عشق است و عشق محرم اوست

خواجہ ایں بیت در گرفت و ہفت شبانہ روز بے ہوش ماند، میل بہ طعام و شراب نہ داشت اما وقت نماز از دست نمی داد و بے ہوش

بانگ می ماند و نماز را بدستور قدیم می گزاشت "۔[1]

(روضۃ الاقطاب ص ۴۳-۴۴)

گمان غالب یہ ہے کہ مطبوعہ نسخہ کسی ایسے نسخے سے منقول ہے کہ جو دستیاب شدہ کچھ اوراق پریشان کا مجموعہ تھا، فوائد السالکین کے کچھ قدیم نسخے ہند و پاک کے معتبر کتب خانوں (لائبریریوں) میں محفوظ ہیں، میرے علم میں اس کا ایک قدیم نسخہ جو ۱۰۹۶ھ / 1684 کا مکتوبہ ہے، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ کے ذخیرۂ مخطوطات کی زینت ہے، تلاش و تجسس سے بہت ممکن ہے کہ اس سے بھی قدیم تر کوئی نسخہ دستیاب ہو جائے، بہرحال مطبوعہ نسخہ بحالت موجودہ جیسا کچھ ہے، سالکان راہ طریقت کے لیے خضر راہ اور عقیدت مندوں کے لیے سرمۂ چشم ہے۔

۳۔ فوائد السالکین کی قدامت | فوائد السالکین کی قدامت اور اس کے استناد کا اہم ترین و معتبر ثبوت یہ ہے کہ حضرت محبوب الٰہیؒ کے بزرگ خلیفہ مولانا برہان الدین غریبؒ متوفی ۷۳۸ھ / 1337 کے لائق ترین مرید مولانا رکن الدین عماد دبیر کاشانیؒ نے تصنیف کتاب شمائل الاتقیاء و دلائل الاتقیاء مرتب کرائی تھی، اس کی فہرست ماخذات میں فوائد السالکین بھی ہے، جو

---

[1] بصورت زیبا وہ آہنگ دلربا اور بدستور قدیم تینوں مرکب حضرت بابا صاحبؒ کے اسلوب کے ممیز ہیں، بدستور قدیم بے محل و بے مصرف ہے، اگر حسب معمول ہوتا تو مضائقہ نہ تھا، ورنہ ضرورت تو اس کی بھی نہیں۔

[2] شمائل الاتقیاء و دلائل الاتقیاء مکتوبہ ۱۱۲۹ھ / 1717 کا ایک نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کلکتہ کے ذخیرۂ مخطوطات کی زینت ہے، ایک نسخہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں ہے جو ۱۳۴۰ھ / 1921 کا مکتوبہ ہے، ایک نسخہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ہے، جو ۱۲۸۲ھ / 1865 کا مکتوبہ ہے، ایک نسخہ مولوی نسیم احمد فریدی صاحب مفتی امروہہ نے مجھے مستعار بھیجا تھا جس سے میں نے استفادہ کیا ہے جو ۱۲۶۸ھ / 1851 کا مکتوبہ ہے، ایک قلمی نسخہ رضا لائبریری رام پور میں ہے جس میں سنہ کتابت نہیں ہے، ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ مئی ۱۹۷۹ء ص ۳۸۵ کے حاشیہ میں ہے کہ یہ کتاب ۱۳۴۷ھ / 1928 میں اشرف پریس حیدرآباد سے شمائل الاتقیاء کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔

اس کی قدامت کی بیّن دلیل ہے، اور اس سے فوائد السالکین کے جعلی ہونے کا وسوسہ رفع ہو جاتا ہے،

اس کے علاوہ فوائد السالکین کی قدامت کا ثبوت یہ بھی ہے کہ اس کی بعض روایتیں ان کتابوں میں بھی منقول ہیں، جو ادب صوفیہ میں بے مثل اور نہایت درجہ مستند مانی جاتی ہیں[1]۔ گویا فوائد السالکین مستند و معتبر کتب تصوف کا ماخذ بھی ہے،

یہ بھی ہے کہ معاصر کتابوں میں کسی کتاب کا یا کسی واقعہ کا ذکر نہ ہونا اس کے عدم وجود کی دلیل نہیں، ہر اہل قلم کا اپنا نقطۂ نظر اور اپنا ہی دائرۂ علم وعمل ہوتا ہے، جو کچھ وہ لکھتا ہے اپنے ہی صوابدید سے لکھتا ہے، ایسا بھی ممکن ہے کہ بعض معلومات کسی کی دسترس سے باہر ہوں اور بروقت دستیاب نہ ہو سکی ہوں ایسی ہی وجوہ کی بنا پر زندہ اہل قلم کی کتابوں کے ابتدائی مطبوعہ نسخے بعد کے نسخوں سے مختلف ہوتے ہیں، لہٰذا اگرچہ درر نظامی کا ذکر سیر الاولیاء میں نہیں ہے، لیکن اس کا وجود مسلم ہے، اسی طرح اگر فوائد السالکین کا ذکر صراحۃً فوائد الفواد و خیر المجالس اور سیر الاولیاء میں نہیں ہے، تو نہ سہی، یہ اس کے عدم وجود کی دلیل نہیں، اس کا وجود دیگر معتبر شواہد سے مسلم ہے، اور اس کے مندرجات بذات خود اس کے وجود کی اور اس کی قدامت کی بیّن دلیل ہیں، واقعات کی نوعیت بھی کچھ ایسی ہی ہوتی ہے، جناب مولانا سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب رقمطراز ہیں:۔

> "حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے فیوض و برکات سے ہندوستان اسلام کے نور سے منور ہو گیا، وہ وارث النبی فی الہند ہو کر یہاں جلوہ افروز ہے، مگر طبقات ناصری[2]

---

[1] فوائد الفواد ص ۵، ۲۰۳ سیر الاولیاء ص ۴۴، ۴۶، ۴۷، ۵۷، ۵۳، ۳۳۸

[2] طبقات ناصری ابو عمر منہاج الدین عثمان بن سراج الدین الجوزجانی معروف بہ منہاج سراج المتوفی ۶۵۸ھ (1260) کی مشہور تالیف ہے۔

تاج المآثر[1] اور فخر مدبر کی تاریخ مبارک شاہی[2] جیسی معاصر تاریخوں میں
ان کے کارناموں کا مطلق ذکر نہیں' ان کا اسم گرامی بھی ان تاریخوں کے صفحات
میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا' اب کوئی عجیب جو اہل قلم یہ دعویٰ کرے
کہ ان کے کارناموں کو بعد کے تذکرہ نگاروں نے محض گھڑ لیا ہے' تو
یہ ہندوستان کے مسلمانوں کی روحانی تاریخ پر شدید ضرب کاری
لگائی ہوگی۔ (ماہنامہ معارف اعظم گڑھ' مارچ ۱۹۷۹ء ص ۱۷۴)

سلطان ناصر الدین محمود متوفی ۶۶۴ھ/۱۲۶۵ء کا اور اس کے لشکر کا حضرت بابا صاحبؒ
کی خدمت میں حاضر ہونے کا ذکر اسرار الاولیاء (ص ۸۴) اور فوائد الفواد (ص ۱۲۵) سیر الاولیاء
(ص ۷۰) میں موجود ہے' لیکن طبقات ناصری میں نہیں ہے' جو اس عہد کی معتبر تاریخ ہے'
اور سلطان ناصر الدین محمود سے منسوب و معنون ہے' تو کیا ان بزرگوں پر بدگمانی کی جا سکتی
ہے' جن کے ملفوظات کا مجموعہ مذکورہ کتابیں ہیں' جن کے صادق القول ہونے میں شبہ کو
بھی دخل نہیں' اس لیے اگر فوائد السالکین کا ذکر و حوالہ فوائد الفواد' دُرر نظامی' خیر المجالس
اور سیر الاولیاء میں نہیں ہے' تو کیا مضائقہ ہے' وہ بذات خود معتبر و مستند ہے' کیونکہ
اس کے وجود و قدامت کے دیگر مستند و معتبر شواہد دستیاب ہوتے ہیں' لہٰذا یہ ماننا
ہوگا کہ فوائد السالکین بلاشبہ قدیم مجموعہ ملفوظات ہے اور معتبر و مستند ہے۔

۳۔ **تاریخی اندراجات** | قدیم ترین ملفوظات انیس الارواح اور دلیل العارفین کے مطالعے
سے یہ حقیقت آشکارا ہے کہ کتب ملفوظات میں تاریخی اندراجات کا رواج عہد قدیم میں

---

[1] تاریخ تاج المآثر مولفہ تاج الدین محمد حسن نیشاپوری المعروف نظامی عروضی مصنف چہار مقالہ کا
المتوفی ۷۳۳ھ/۱۳۳۳ء عہد قطب الدین ایبک میں آغاز اور عہد شمسی میں اختتام ہوا' یہ بزرگ عہد ایبک میں
دہلی آگئے تھے' برٹش میوزیم لندن میں اس کتاب کا قلمی نسخہ ہے' طبع نہیں ہوئی ہے۔

[2] تاریخ مبارک شاہی تالیف فخر الدین مبارک شاہ صدیقی المعروف فخر مدبر' عہد قطب الدین
ایبک کے نامور مورخ ہیں۔ یہ تاریخ ۱۳۴۶ھ/۱۹۲۷ء میں لندن میں طبع ہوئی تھی۔

نہ تھا، فوائد السالکین میں جو تاریخی اندراجات ہیں وہ بھی مشکوک و مشتبہ اور ناتمام ہیں، گمانِ غالب یہ ہے کہ کسی نے سیر الاولیا (ص ۹۱) کی الحاقی[1] عبارت سے متاثر ہو کر تاریخی اندراجات کی سعی کی ہے، لیکن کر نہیں سکا ہے، اور ناتمام ہی چھوڑ دینا پڑا ہے، کیونکہ بیعت وارادت کا جو ۵۸۲ھ (۱۱۸۶ء) اس میں مرقوم ہے وہی فوائد السالکین میں ہے، اور وہ بالکل غلط ہے، جس کا ذکر آئندہ آئے گا، لہٰذا یہ خیال قرینِ قیاس ہے کہ قدیم کتبِ ملفوظات کے مثل فوائد السالکین میں بھی تاریخی اندراجات نہ تھے ۔

فوائد السالکین کے فارسی نسخے (مطبوعہ ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء مطبع مجتبائی دہلی) میں جو تاریخی اندراجات مطالعہ میں آئے ہیں، وہ بھی ناکام کی نشان دہی کرتے ہیں، اور وہ یہ ہیں:—

(۱) مجلس اول .... نہ دن نہ تاریخ نہ مہینہ نہ سنہ

(۲) مجلس دوم ... ... " " " "

(۳) مجلس سوم دوشنبہ ماہ شوال ۵۸۲ھ اگر تاریخ بھی ہوتی تو تقویم تصدیق یا تردید کر سکتی،

(۴) مجلس چہارم دوشنبہ ماہ ذیقعدہ ۵۸۲ھ اگر تاریخ بھی ہوتی تو تقویم تصدیق یا تردید کر سکتی،

(۵) مجلس پنجم ماہ ذی الحجہ سنہ مذکورہ دن اور تاریخ دونوں ندارد،

(۶) مجلس ششم روز جمعہ شوال ۵۸۲ھ، تاریخ ندارد، ذی الحجہ کے بعد شوال ہے تو سنہ مذکور چہ معنی دارد،

(۷) مجلس ہفتم روز چہار شنبہ " تاریخ نہ مہینہ، سنہ مذکور عجب شے ہے،

کیا بلا تحقیق ان ادھورے اور بے تکے اندراجات کو معتبر مانا جا سکتا ہے، اور ان پر اعتماد کیا جا سکتا ہے؟

[1] الحاق کنندہ کو اتنا بھی علم نہیں کہ ۵۸۲ھ (۱۱۸۶ء) میں نہ تو دہلی فتح ہوئی تھی، اور نہ دہلی میں حضرت قطب صاحبؒ قیام فرما تھے، دہلی ۵۸۹ھ (۱۱۹۳ء) میں فتح ہوئی اور ۵۹۰ھ (۱۱۹۴ء) میں دہلی کو پایۂ تخت بنایا گیا۔

مطلوب الطالبین (مطبوعہ ۱۳۱۶ھ (1898) مطبع مجتبائی دہلی) فوائد السالکین کا اردو ترجمہ ہے، اس میں خلا کو پُر کرنے کی کچھ کوشش کی ہے، مگر اتنی ہی کہ پہلی اور چھٹی [illegible] کے تاریخی اندراج میں قدرے تصرف کیا ہے، باقی فارسی نسخے کے مطابق ہے ۵۸۲ھ (1186) ہی ہے جو غلط ہے،

ہشت بہشت خواجگانِ چشتؒ کے آٹھ مجموعہ ملفوظات کا اردو ترجمہ ہے جس میں فوائد السالکین کا ترجمہ بھی شامل ہے، اس میں پہلی، دوسری اور پانچویں مجلس کے تاریخی اندراج میں قدرے تصرف کیا ہے، باقی فارسی نسخے کے مطابق ہیں، سنہ وہی ۵۸۴ھ (1188) ہے جو خلاف واقعہ ہے۔

مولوی غلام احمد خاں بریاں مرحوم نے ۱۳۱۰ھ (1892) میں مجموعہ ملفوظات خواجگان چشت کے نام سے پانچ کتب ملفوظات کا اردو ترجمہ شائع کیا تھا، جس میں فوائد السالکین کا ترجمہ بھی ہے، مگر صرف چھ مجالس کا ترجمہ ہے، بلکہ چھٹی مجلس بھی نا تمام ہے، ساتویں مجلس کا ترجمہ شامل ہی نہیں ہے، تاریخی اندراجات اس میں بھی نا تمام ہیں، البتہ مجلس دوم و چہارم و پنجم میں مکمل ہیں، مگر غلط ہیں، تقویم سے ان کی تصدیق نہیں ہوتی، سنہ مجوزہ روزگار ہے، اور وہ ۶۴۸ھ (1250) ہے، اگرچہ مولوی غلام احمد خاں بریاں مرحوم نے اردو سیر الاولیاء کے نام سے ۱۳۲۰ھ (1902) میں خود سیر الاولیا کا ترجمہ کر کے شائع کیا تھا جس کے ص ۶۲-۶۳ میں قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہ العزیز کے سنہ وفات ۶۳۳ھ (1235) کا ذکر موجود ہے، حیرت ہے کہ پھر انھوں نے ۶۴۸ھ (1250) کیوں لکھا ہے، ان کارستانیوں سے یہ حقیقت آشکارا ہے کہ ان صاحبوں کے پیش نظر فوائد السالکین کا کوئی قدیم و مستند ایسا نسخہ نہ تھا، جو صحیح تاریخی اندراجات کا حامل ہوتا، اور یہ اندراجات ہرگز کسی صحیح نسخے سے منقول نہیں ہیں، بلکہ ما بعد کی جدت کا ثمرہ ہیں، جو سراسر غلط ہیں، اور اس یقین کے لیے کافی گنجائش ہے کہ فوائد السالکین تاریخی اندراجات سے قطعاً مبرا ہے، اور یہ اندراجات ہرگز اس لائق نہیں کہ ان پر اعتبار کیا جائے، یا تنقید کے لیے انھیں محور بنایا جائے، بلاشبہ انھیں مسترد قرار دیا جائے گا،

۵- سیر الاولیا کی الحاقی عبارت | سیر الاولیا (چرنجی لال ایڈیشن) میں اگرچہ متعدد الحاقی

عبارتیں ہیں مگر ہمارے موضوع سے متعلق صرف وہ عبارت ہے جو ص ۹۱[1] پر ہے، جس کا آغاز 'پوشیدہ نماند' سے ہوتا ہے اور وہ مجموعہ ہے حضرت باباصاحبؒ کے سنین ولادت وارادت اور وفات وغیرہ کا جس کے سارے ہی سنہ خلاف واقعہ ہیں، اُن ہی میں سنہ ارادت ۵۸۴ھ (1188) ہے، اور یہی فساد کی جڑ ہے، ان سب ہی کا تجزیہ کرنا ہوگا، تاکہ مفروضہ سنہ ارادت ۵۸۴ھ (1188) کا غلط ہونا واضح ہوجائے، طوالت کے خوف سے اصل عبارت نقل نہیں کرتا، اس کا لب لباب نقل کیے دیتا ہوں،

۱- حضرت باباصاحبؒ کا سنِ ولادت ۵۶۹ھ	۴- وفات کے وقت باباصاحبؒ کی عمر ۹۵ سال
۲- حضرت باباصاحبؒ کا سنہ ارادت ۵۸۴ھ	۵- حضرت باباصاحبؒ کا سنہ وفات ۶۶۴ھ
۳- عمر بوقتِ بیعت وارادت ۱۵ سال	۶- بیعت وارادت کے بعد مدتِ حیات ۸۰ سال

دریافت طلب امر یہ ہے کہ ان معلومات کا ماخذ کیا ہے، جو سراسر غلط ہے، اور جس کی تصدیق فوائد الفواد وسیر الاولیا بلکہ دیگر مستند کتب تاریخ وتذکرہ سے بھی نہیں ہوتی، اس میں سنہ بیعت وارادت ۵۸۴ھ ہے، ہمارے نزدیک اسی سے فوائد السالکین میں تاریخی اندراج کی کوشش

---

[1] سیر الاولیا ص ۹۱ کی الحاقی عبارت:

"پوشیدہ نماند کہ تولد حضرت شیخ الشیوخ فرید الحق والدین مسعود گنج شکر در سنہ ۵۶۹ھ پانصد وشصت ونہ بود، وفات حضرت ایشان در شش صد وشصت وچہار (۶۶۴ھ) بود، عمر حضرت ایشان نود وپنج (۹۵) باشد واللہ اعلم، وارادت آوردن حضرت گنج شکر بحضرت خواجہ قطب الدین قدس اللہ سرہ العزیز در پانصد وہشتاد وچہار (۵۸۴) بود و بعد ازاں ارادت آوردن ہشتاد (۸۰) سال در عقدِ حیات بود طیب اللہ مرقدہ وجعل حظیرۃ القدس مثواہ از حضرت سلطان المشائخ پرسیدند کہ عمر شریف حضرت شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین قدس اللہ سرہ العزیز چند سال بود فرمودند کہ نود و پنج (۹۵) سال۔

کی گئی ہے، جو نا تمام رہی، اور جس میں کامیابی نہ ہو سکی '

۴۔ **الحاقی عبارت کے خلاف شواہد** | ناظرین کو حیرت ہو گی کہ نہ صرف ۵۸۴ھ/1188 کی بلکہ جملہ مفروضہ الحاقی سنین کی تردید حضرت محبوبِ الٰہیؒ کے بیانات سے ہو جاتی ہے اور اگرچہ یہ موضوع تفصیل طلب ہے لیکن میں نہایت اختصار سے ضبطِ تحریر میں لانے کی کوشش کرتا ہوں :

(۱) امیر خورد کرمانیؒ ناقل ہیں، اور لکھتے ہیں :۔

"حضرت محبوبِ الٰہیؒ نے خود اپنے مبارک قلم سے لکھا ہے کہ ۲۵ جمادی الاول سنہ ۶۶۹ھ/1270 جمعہ کے دن بعد نماز جمعہ حضرت بابا صاحبؒ نے مجھے بلایا اور اپنا لعابِ دہن مبارک میرے منھ میں ڈالا ' (سیر الاولیا ۱۲۳)

یہ بیان تاریخی اعتبار سے مکمل ہے، دن بھی ہے، تاریخ بھی ہے، مہینہ بھی ہے اور سنہ بھی ہے حتیٰ کہ وقت بھی ہے، تقویم آج بھی اس کی تصدیق کرتی ہے، یہ بیان بتاتا ہے کہ حضرت بابا صاحبؒ سنہ ۶۶۹ھ/1270 میں بقیدِ حیات تھے، امیر خورد کرمانیؒ نے حضرت محبوبِ الٰہیؒ کا ایک بیان اور بھی نقل کیا ہے، جو عطائے سندِ خلافت سے متعلق ہے، لکھا ہے :۔

"حضرت محبوبِ الٰہیؒ کا ارشاد ہے کہ ۱۳ ر رمضان المبارک سنہ ۶۶۹ھ/1271 کو حضرت بابا صاحبؒ نے مجھے بلایا اور دریافت فرمایا، کہ نظام! تمھیں یاد ہے جو میں نے کہا تھا، میں نے عرض کیا جی ہاں یاد ہے، فرمایا کاغذ لاؤ تاکہ اجازت نامہ (خلافت نامہ) لکھا جائے، کاغذ لا دیا گیا اور خلافت نامہ لکھا گیا "

(سیر الاولیا ص ۱۱۶)

اس بیان سے بھی یہ تصدیق ہوتی ہے کہ حضرت بابا صاحبؒ رمضان المبارک سنہ ۶۶۹ھ/1271 میں بھی بقیدِ حیات تھے، خواجہ امیر حسن علا سنجریؒ (س۔ ن۔ ج۔ ر۔ ی) نے یہ بھی لکھا ہے،

"حضرت محبوبِ الٰہیؒ سے دریافت کیا کہ آپ حضرت بابا صاحبؒ کے وصال کے وقت حضرت بابا صاحبؒ کی خدمت میں موجود تھے، تو آپ نے

آبدیدہ ہو کر فرمایا، نہیں، مجھے شوال کے مہینے میں دہلی بھیج دیا تھا اور
حضرت باباصاحبؒ کا وصال پانچویں محرم کی رات کو ہوا ہے" (فوائد الفواد ص ۵۲)

اس بیان سے واضح ہے کہ شوال کی کسی تاریخ سے پانچویں محرم تک کا فصل ہے یعنی تین ماہ کے اندر ہی اندر حضرت باباصاحبؒ کا واقعۂ ارتحال پیش آیا تھا، معتبر اہل قلم اس پر متفق ہیں کہ حضرت باباصاحبؒ کا سنہ وفات ۶۷۰ھ (1272) ہے، حضرت محبوب الٰہیؒ کے ارشاد سے بھی سنہ وفات ۶۷۰ھ (1272) ہی کی تصدیق ہوتی ہے، مذکورہ الحاقی عبارت میں حضرت باباصاحبؒ کا سنہ وفات ۶۶۴ھ (1265) لکھا ہے، جو حضرت محبوب الٰہیؒ کے بیانات کے منافی اور غلط ہے بے سند اور خلاف واقعہ بھی ہے، جو ہرگز قابل قبول نہیں،

(۲) خواجہ امیر حسن علائے سجزیؒ نے حضرت باباصاحبؒ کی مدت عمر کے متعلق حضرت محبوب الٰہیؒ کا مبارک بیان نقل کرتے ہوئے لکھا ہے :-

"حضرت محبوب الٰہیؒ نے حضرت باباصاحبؒ کی عمر کے متعلق دریافت کیا تو
آپ نے فرمایا نود و سہ سال، یعنی ۹۳ سال کی تھی" (فوائد الفواد ص ۵۲)

الحاق کنندہ نے ۹۵ سال لکھی ہے، جو حضرت محبوب الٰہیؒ کے بیان کے خلاف اور غلط ہے۔

(۳) جب تحقیقی نقطہ نظر سے اور حضرت محبوب الٰہیؒ کے ارشاد کے مطابق حضرت باباصاحبؒ کا سنہ وفات ۶۷۰ھ (1271) ہے، اور مدت عمر ۹۳ سال ہے تو سن ولادت لازماً ۵۷۷ھ (1181) ہے، الحاق کنندہ نے سنہ ولادت ۵۶۹ھ (1173) لکھا ہے جو حضرت محبوب الٰہیؒ کے ارشاد کے منافی اور غلط ہے۔

(۴) حضرت محبوب الٰہیؒ کے ارشاد کے مطابق بیعت و ارادت کے وقت حضرت باباصاحبؒ کی عمر ۱۸ سال کی تھی[1] مولانا حامد جمالی متوفی ۹۴۲ھ (1535) لکھتے ہیں :-

"سلطان المشائخ حضرت نظام الملۃ والدین سے منقول ہے کہ جب حضرت

[1] بعض اقتباسات کا ترجمہ شامل ہے مگر حوالے تمام صفحات فارسی کتب کے ہیں۔

قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی ؒ قدس اللہ سرہ العزیز
کی خدمت میں حضرت بابا صاحب ؒ شرف بیعت وارادت سے مشرف ہوئے
تو آپ کی عمر اٹھارہ سال کی تھی۔" (سیر العارفین فارسی ص ۳۶)
شہزادی جہاں آرا بیگم بنت شاہ جہان بادشاہ نے بھی اس قول کو اپنایا ہے۔
(مونس الارواح ص ۱۷ فارسی) اس اعتبار سے بیعت وارادت کا سن ۵۹۵ھ 1198 متعین ہوتا ہے، الحاقی عبارت میں ۵۸۴ھ 1188 ہے، اور الحاق کنندہ نے جو سنہ ولادت ۵۶۹ھ 117 لکھا ہے اس کے اعتبار سے ۵۸۴ھ 1188 میں حضرت بابا صاحب ؒ کی عمر پندرہ سال کی ہوتی ہے اور تحقیقی نقطۂ نظر سے ۵۸۴ھ 1188 میں آپ کی عمر سات سال کی ہوتی ہے، اور اس عمر میں بیعت وارادت کی کسی اعتبار سے بھی تصدیق نہیں ہوتی۔

(۵) بیعت وارادت کے عہد سے وفات تک کا وقفہ تحقیقی نقطۂ نظر سے ۷۵ سال ہے، مگر الحاق کنندہ نے ۸۰ سال بتایا ہے، اگرچہ اس کے اظہار کی چنداں ضرورت نہ تھی لیکن بتانا مقصود یہ ہے کہ حضرت بابا صاحب رح کی ولادت سے وفات تک کے تمام سنین مصدقہ طور پر محفوظ ہیں، اگر جذبۂ تلاش اخلاص پر مبنی ہے تو سب کچھ صحیح صحیح دستیاب ہو جاتا ہے۔ سہولت کار کے لیے مذکورہ سنین کا نقشہ پیش کیا جاتا ہے:

حضرت بابا صاحب ؒ کی ولادت تا وفات کے صحیح اور اہم سنین کا نقشہ

(۱) حضرت بابا صاحب ؒ کا سنہ ولادت	۵۷۷ھ 1181
(۲) حضرت بابا صاحب ؒ کا سنہ بیعت وارادت	۵۹۵ھ 1198
(۳) حضرت بابا صاحب ؒ کی عمر بوقت بیعت وارادت	۱۸ سال
(۴) وفات کے وقت حضرت بابا صاحب ؒ کی عمر	۹۳ سال
(۵) حضرت بابا صاحب ؒ کا سن وفات	۶۷۰ھ 1271
(۶) بیعت وارادت سے وفات تک کی عمر	۷۵ سال

ان سنین کے مصدقہ ہونے کی اہم دلیل یہ ہے کہ یہ سنین حضرت محبوب الٰہی ؒ کے مبارک ارشادات پر مبنی ہیں، جو اس باب میں سب سے زیادہ واقف حال بزرگ تھے، کیا کوئی آپ کے ارشادات کو شبہ کی نگاہ سے دیکھ سکتا ہے، ؎

سر ریدہ قلم دریں شبِ تار
لیسے معنی خفتہ کرد بیدار

وہ اہل قلم جو یہ لکھتے ہیں، کہ فوائد السالکین وغیرہ کتب ملفوظات کی بعض روایات کو تاریخ بھی رد کرتی ہے، تو کیا وہ بتا سکتے ہیں کہ انھوں نے تاریخی اندراجات کی اسی طرح تحقیق فرمائی ہے، بلا تحقیق کچھ لکھنا کہاں کی دانائی ہے،

الغرض اس تحقیق و تفصیل سے یہ واضح ہے کہ فوائد السالکین میں مندرجہ سنین بیعت و ارادت اور نا تمام اندراجات سب ہی غلط ہیں، اور نہ صرف یہی بلکہ اکثر اہل قلم جنھوں نے بلا تحقیق اس الحاقی عبارت کو جو گونا گوں انشائی معائب سے بھر پور ہے، امیر خورد کرمانیؒ کی نوشتہ تصور کر کے اعتماد کیا ہے، انھوں نے بھی غلط سنین کو اپنایا ہے، جو قابلِ قبول نہیں ہیں، اس لیے کہ امام ابن ہمام کا ارشاد ہے ۔ وکثیرًا ما یقلد الساھون الساھین (فتح القدیر) بھولے بھٹکے، بھولے بھٹکوں ہی کی پیروی کرتے رہتے ہیں۔

نقاد ہو یا محقق یا سیرت نگار اس کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ اخلاص اور موضوع سے ہمدردی کے ساتھ لفظ لفظ کا جائزہ لے اور جانچے پرکھے، اور پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد قلم اٹھائے، یہ نہیں کہ کسی نے کہہ دیا کہ کوّا کان لے گیا، کوّے کے پیچھے دوڑ لیے، کانوں کو ٹٹولا تک نہیں۔[۲]

فوائد السالکین زبانِ حال سے کہہ رہی ہے کہ وہ تاریخی اندراجات سے مبرّا ہے،

ع میری سنو! جو گوشِ حقیقت نیوش ہے

[۱] انوار الفریدیہ ص ۲۰، مطبوعہ پاکستان، [۲] قلمی نسخے ایسے بھی دستیاب ہوتے ہیں جن میں تاریخی غلطی نہیں ہے

اس کے مطبوعہ فارسی نسخے میں جس قدر تاریخی اندراجات ہیں، وہ بعد کے اضافے ہیں، اس قسم کے اختراعی اندراجات سے کسی کتاب کو جعلی نہیں قرار دیا جاسکتا ہے، یہ سقم تاریخ کی معتبر کتابوں میں بھی ہے، اگر اس بنا پر جعلی قرار دیا جائے گا تو بہت بڑے علمی ذخیرے کو دریا برد کرنا ہوگا۔

بہر حال پھر بھی کوئی غلط سنین پر اعتماد کر کے انھیں تنقید کے لیے محور بناتا ہے تو ماننا ہوگا کہ وہ فن تنقید سے نابلد اور بے بہرہ ہے، اس کے قول و فعل پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔

۸۔ فوائد السالکین کا عہد تدوین | جن صاحبوں کے مطالعہ میں قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہ العزیز کی سیرت و سوانح ہے، انھیں علم ہے کہ حضرت قطب صاحبؒ اکثر اوقات تلاوتِ قرآن پاک میں محو و مستغرق رہا کرتے تھے اور بہت کم کلام فرماتے تھے[1] البتہ طالبوں کو جو ہدایتیں فرمانی ہوتیں وہ برمحل فرماتے، فوائد السالکین کا مطالعہ شاہد ہے کہ وہ حضرت بابا صاحبؒ کے بیعت ہونے کے وقت سے حضرت قطب صاحبؒ کے آخری ایام حیات تک کے بیانات و واقعات کی جامع ہے، حضرت بابا صاحبؒ کا سنہ بیعت ارادت ۵۹۵ھ (1198) ہے، لہذا فوائد السالکین کا عہد تدوین ۵۹۵ھ تا ۶۳۳ھ (1198 - 1235) کا درمیانی وقفہ ہے، اس میں ۵۸۴ھ (1188) جو الحاق ہے وہ بالکل غلط ہے، دہلی ۵۸۹ھ (1193) میں فتح ہوئی ہے، فتح دہلی سے پہلے حضرت قطب صاحبؒ کا دہلی میں قیام ثابت نہیں ہے۔

فوائد السالکین بلاشبہ ۳۸ سالہ درمیانی وقفے کی اُن مجالس کے بیانات و واقعات کا مجموعہ ہے جو گاہ بگاہ منعقد ہوئی تھیں، اور ان میں سے جن بیانات و واقعات کو

---

[1] امیر خورد کرمانیؒ لکھتے ہیں ـــــ حالِ شغل بحق بجائے رسیدہ بود، چوں کسے بزیارت ایشاں آمدے زمانے بایستے تا بخود باز آمدے، آں گاہ بہ آیندہ مشغول شدے یا از حال خود یا حال آیندہ چیزے بگفتندے بعدہ گفتے مرا معذور دارید باز بحق مشغول شدے۔ (سیر الاولیا ص ۴۹ ج ۱)

حضرت باباصاحبؒ نے مناسب سمجھا انھیں قلمبند فرمایا تھا' جو آج بھی مشعلِ رشد و ہدایت ہیں۔ ~~۵۸۴ھ~~ ۱۱۶۹ھ ہر اعتبار سے الحاق ہے'

۹۔ ما فوق الفطرت عناصر/ فوائد السالکین میں بعض روایتیں بلاشبہ ما فوق الفطرت ہیں' لیکن فوائد الفواد' خیر المجالس اور سیر الاولیا کی نسبت تدرے قلیل ہیں' اتنی ہی کہ انگلیوں پر گِنی جاسکیں' اور ایسی کوئی نہیں جیسی خیر المجالس (ص ۵۳) میں مجذوب کی حکایت ہے' جو آپ اپنی مثال ہے اور جس سے چنگیز و ہلاکو کی یاد تازہ ہوتی ہے' ما فوق الفطرت روایات کا تعلق عصری حالات سے بھی ہے' اور روحانی کمالات سے بھی۔

عہدِ وسطیٰ کا ادب مشرقی ہو یا مغربی اس وصف سے خالی نہیں' اگر فوائد السالکین میں ایسی روایات نہ ہوتیں تو وہ عصری اثرات سے معرّیٰ مانی جاتی جو اس کی خوبی نہیں بلکہ اس کا نقص متصور ہوتا' اور اسے اس عہد کی تالیف قرار دینے میں تکلف ہوتا' اور روحانیت سے اس کا رشتہ منقطع رہتا۔

معجزہ ہو یا کرامت ان کا تعلق ما فوق الفطرت ہی سے ہے' یہ تبلیغِ دین میں ممد و معاون تو ہیں' لیکن عین ارکانِ تبلیغ نہیں ہیں' ان کا اپنا اپنا دائرہ عمل ہے' اس سے الگ کوئی توقع امیدِ موہوم ہے' سحر و شعبدہ اور معجزہ و کرامت میں کھلا فرق ہے' حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے باہمی امتیاز کی اس طرح وضاحت فرمائی ہے:۔

> "سحر و شعبدہ صرف دل لگی کے آنی تماشے ہوتے ہیں' لیکن معجزات و آیات قوموں اور جماعتوں کے اصلاح و فساد۔ تعمیر و تخریب' ترقی اور تنزّل کے اسباب و سامان ہوتے ہیں۔ (سیرۃ النبی جلد ۳ ص ۱۳۳)

یہ کہنا یا سمجھنا کہ ایسے شعبدے اور کرامتیں دکھا کر مسلمان بنایا گیا ہوتا تو آج شاید ہی کسی دوسرے مذہب کا وجود ہوتا[۱] یہ خیال معجزہ اور کرامت کے موقف سے کم آگاہی اور ذہنی بے راہ روی کی کھلی علامت ہے' معجزہ کا ذکر قرآن پاک میں ہے جو کرامت سے

---

[۱] ۔ منادی بابا فرید نمبر

افضل ہے، اس سے کوئی مسلمان انکار نہیں کرسکتا، کیا یہ کہنے والا اپنے وہبی وصف کو معجزات سے ثابت کرسکتا ہے، اگر وہ معجزات کا بھی منکر ہے تو وہ نہ لائقِ تخاطب ہے، اور نہ اس کا قول لائقِ اعتنا ہے، ہذیان سے زیادہ اس کے قول کی وقعت نہیں۔

کرامت عطیۂ خداوندی اور اعمالِ صالحہ کا ثمرہ ہے، سلوک کے لیے منازل و مراتب متعین ہیں، بقول حضرت محبوب الٰہیؒ ان کی تعداد یک صد ہے، سترہویں منزل سے کرامات کا ظہور ہونے لگتا ہے، سالکین کو یہ ہدایت ہے کہ جب تک سَو کی سَو منزلیں طے نہ کرلیں، اظہارِ کرامت کی طرف متوجہ نہ ہوں، (فوائد الفواد ص ۱۷۱) البتہ جب سو سے آگے نکل جاتے ہیں تو وہ مختار ہیں (فوائد السالکین ص ۲۰) اکابر صوفیہ نے کرامت سے خاطر خواہ کام لیا ہے اور بالارادہ لیا ہے، یہ کہنا کہ کرامت کو اہلِ صوفیہ نے پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں دی ہے، مذاقِ تصوف سے کم آگاہی کی علامت ہے، اکابر صوفیہ نے کبھی عطیۂ خداوندی کو تحقیر کی نظر سے نہیں دیکھا ہے، یہ ان پر تہمت ہے، کرامات کا ظہور اکابر صحابہ سے بھی ہوا ہے، اور بقول خواجہ گیسو دراز بندہ نوازؒ جس قدر کرامتیں سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منقول ہیں اتنی اور کسی صحابیؓ سے منقول نہیں ہیں (جوامع الکلم ملفوظ ۹ رمضان ۸۰۲ھ) رودِ نیل کے واقعہ کو شہرت عام حاصل ہے، کہ دریائے نیل (مصر) میں ہر سال طغیانی آتی، اور جب تک انسانی جان بھینٹ نہ کی جاتی طوفانی کیفیت برقرار رہتی، جب مصر پر مسلمانوں کا تسلط ہوا تو حاکم مصر نے امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے استصواب کیا، آپ نے دریائے نیل کے نام ایک خط لکھا، اور بھیج دیا اور فرمایا اسے دریائے نیل میں ڈال دیا جائے، وہ ڈال دیا گیا، پھر نہ طغیانی آئی اور نہ اس نے بھینٹ لی۔

شیخ الشیوخ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ کے ایام حیات میں دریائے دجلہ (بغداد) میں سخت طغیانی آئی، بہت سے بے در و بے گھر ہو گئے، جب یہ واقعہ شیخ الشیوخ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے علم میں آیا تو آپ نے اپنے خادم سے

کہا، جاؤ یہ کوزا لے جاؤ اور دریا کے مارو اور اس سے کہو جا اپنی جگہ چلا جا' اس نے حکم کی تعمیل کی، دریا کوزا کھاتے ہی اور حکم کے سنتے ہی سمٹ گیا' اور بدستور اپنی جگہ بہنے لگا' جب یہ واقعہ حضرت خواجہ ابوالغیث یمنیؒ کے علم میں آیا تو' انھوں نے حضرت شیخ سہروردیؒ کو خط لکھا کہ اولیاء اللہ نے تو اخفائے کرامت کو لازم گردانا ہے' آپ نے یہ کیا کیا؟ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے خط کو پڑھا' اور پھینک دیا' اور فرمایا یہ اُمّی (جاہل) کیا جانے (جوامع الکلم ملفوظ ۱۷ رمضان المبارک ۸۰۲ھ خیر المجالس ص ۸۷)

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کا مدعا یہ ہے کہ خواجہ ابوالغیث یمنیؒ بلند پایہ فقیہہ اور عالم سہی مگر راہ سلوک کے نشیب و فراز سے آگاہ نہیں تھے، تصوف کا جتنا کچھ تعلق علم سے ہے' اس سے کہیں زیادہ عمل سے ہے، حقائق تصوف سے آگاہی ہوتی ہے عمل پیرا ہونے سے، محض تصوف کی کتابیں پڑھ لینے سے کوئی صوفی نہیں بنتا تاوقتیکہ عمل پیرا نہ ہو' حقائق ان پر منکشف نہیں ہوتے' بلکہ الٹا گمراہی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

بلاشبہ راہ سلوک کی تکمیل سے پہلے اظہار کرامت سے محترز رہنے کی ہدایت ہے، مگر تکمیل کے بعد صوفی با اختیار ہوتا ہے' اور وہ کرامت سے برمحل کام لے سکتا ہے' البتہ اسرار الٰہی کے اظہار کی ممانعت ہے' اور ہر حال میں ہے' مگر جو ذبان اسرار و کرامت میں امتیاز نہیں کر سکتے' وہ کرامت کو بھی اسرار کے حکم میں داخل سمجھتے ہیں' اور یہ غلط ہے۔

اس باب میں اتنا ہی کافی ہے۔ **العاقل تکفیہ الاشارہ**۔

۲۔ **اسلوب بیان** حضرت بابا فرید مسعود گنج شکر قدس اللہ سرہ العزیز نے فوائد السالکین کے ابتدائیہ میں لکھا ہے کہ اسرار الٰہی اور انوار لامتناہی جو قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہ العزیز نے بیان فرمائے اور میں نے سنے، وہ میں نے اس مجموعۂ ملفوظات فوائد السالکین میں اپنی زبان میں لکھے ہیں، گویا کہ فوائد السالکین میں جو مضامین و خیالات ہیں وہ تو قطب الاقطاب

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشیؒ قدس سرہٗ العزیز کے بیان فرمودہ ہیں، اور فوائد السالکین میں جو اسلوب بیان ہے، وہ حضرت باباصاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اسلوب بیان ہے۔

فوائد السالکین کا اسلوب بیان سادہ سلیس، شستہ اور رفتہ اور عام فہم ہے بلکہ سنجیدگی اور متانت سے مالامال ہے، سلوک و روحانیت کے عمیق و نازک خیالات کو ضبط تحریر میں لانا سہل نہیں ہے کیونکہ دقائق کا بیان اختصار کے ساتھ گنجلک اور تفصیلی طوالت سے بے لطف ہو سکتا ہے، مگر حضرت باباصاحبؒ نے کمال انشاپردازی کی بدولت ہر کہیں اسے سنبھالے رکھا ہے، پھر ایسے نازک اور عمیق خیالات کو عام فہم زبان میں بیساختگی کے ساتھ بیان کرنا بھی کمال فن ہی کی دلیل ہے، جس سے ہر کس و ناکس عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔

فارسی ایک وسیع اور نہایت وسیع ملک کی زبان ہے، جو مقامی اور طبقاتی امتیازات کی حامل بھی ہے، مگر فوائد السالکین کے اسلوب کا یہ اہم وصف ہے کہ وہ ان امتیازات سے بالاتر ہے، کوئی جملہ یا کوئی لفظ ایسا نہیں جو عام فہم نہ ہو، اور ہر کہیں مروج نہ ہو، یا وہ طبقاتی یا مقامی خصوصیت کا حامل ہو جس کی فہمید میں کسی کو تکلف ہو سکے، ہر فارسی داں خواہ کسی طبقے سے متعلق ہو یا کسی مقام سے یکساں طور پر آسانی پڑھ لیتا ہے، اور لطف اندوز ہوتا ہے، یہ زبان دانی کا ایسا وصف ہے کہ جو آپ اپنی مثال ہے، مگر تراجم سے استفادہ کرنے والے اس اہم وصف سے واقف نہیں ہو سکتے، پھر تراجم سے اصل اسلوب پر تنقید و رائے زنی کرنا کمال کم آگاہی کی علامت ہے،

بیان میں کیف و جاذبیت اس قدر ہے کہ مطالعہ کرنے والا عالم سرور و کیف میں کھو جاتا ہے اور اسی عالم میں رہنا چاہتا ہے، قلب کی حالت عجیب ہوتی ہے جو بیان نہیں کی جا سکتی، دل میں اللہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، اور دنیا سے دل اچاٹ ہو جاتا ہے، یہ وصف آج بھی ہے جب ہمارا ماحول اور ہمارا معاشرہ روحانیت سے بیگانہ ہے، اور مادیت کی بندشوں میں

جکڑا ہوا ہے پھر بھی دل میں ایک ہوک اٹھتی ہے، اور طلب پیدا ہوتی ہے کہ ان بندشوں کو توڑ پھینکا جائے، اور اللہ کا ہو رہا جائے اسی میں کامرانی ہے، اور اسی میں سکونِ قلب ہے، فوائد السالکین کا یہی وہ وصف ہے جس سے مادہ پرست دہشت زدہ ہیں، اور بیجا ہدفِ تنقید بنانے کے درپے ہیں، محلِ تاسف ہے کہ یہ نادرۂ روزگار صحیفۂ روحانیت عقیدتمندوں کی بے اعتنائی کی بدولت کنجِ خمول کی زینت ہے جو عقیدتمندی کے چہرے کا بدنما داغ ہے۔

اسرار و انوار کی آمیزش نے اسلوب کی جاذبیت اور عظمت و اہمیت کو دوبالا کر دیا ہے، فوائد السالکین اپنے اسلوب و مضامین کے اعتبار سے عظیم ادبی اور روحانی شاہکار ہے، جس کی بدولت ہم اپنی عظمتِ رفتہ سے اور اپنے آبائی ورثے سے دوبارہ مستفید ہو سکتے ہیں۔ یہ گرانقدر صحیفہ جو ہمارا روحانی ورثہ ہے اس کی قدر و منزلت ہمارا اخلاقی فریضہ ہے، حضرت بابا صاحبؒ کے اسلوب کی شائستگی زندۂ جاوید ہے۔ اہلِ کمال آج بھی اسے خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے مجبور ہیں، اس سے زیادہ کسی اسلوب بیان کی خوبی اور کیا ہو سکتی ہے۔

دل کی نگاہ فکر کی بینائی چاہیے، جلوے ہیں عام ظرف تماشائی چاہیے (فرمان)

(۱) نفسِ مضمون: فوائد السالکین کی امتیازی شان ہے کہ حال قال پر چھایا ہوا ہے حالانکہ جذبات کو گرفت میں لانا کارے وارد ہے، خیالات اعلیٰ سے اعلیٰ ہیں، اور نازک اور عمیق بھی ہیں کسے انتخاب کیا جائے اور کسے نہیں، مرزا غالب کو شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا تھا، مجھے یہ اندیشہ ہے کہ میری

خام کاری اور کم مائیگی کہیں مجھے رسوا نہ کر دے،

بہر حال توکلت علی اللہ خیالات کے بعض ٹکڑوں کو تبرکاً نذرِ ناظرین کرنے کی جسارت کرتا ہوں اور مقبولیت کا تمنائی ہوتا ہوں۔

قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہ العزیز کا ارشاد ہے جو سالکین کے لیے ہدایت خاص ہے وہ یہ ہے:۔

"شیخ میں قوتِ قلبی اس قدر ہونی چاہیے کہ جب کوئی بیعت کا

طالب ہو تو وہ بیک نظر اس کے قلب کو دنیاوی آلودگی سے پاک کردے،
پھر اس کا ہاتھ پکڑے اور خدا تک پہنچا دے"

یہی وہ وصف ہے جس سے صوفیائے کرام نے عہد ماضی میں کام لیا اور جم غفیر کو راہ راست پر لگایا، جس سے اللہ کی یاد کا ولولہ موجزن تھا،

"کم خوردن وکم خفتن اور کم گفتن، وکم آمیختن کی تلقین فرمائی ہے۔

دانشوران عالم آج بھی اس کے قائل ہیں کہ کم کھانے سے اور کم سونے سے اور کم بولنے سے اور کم آمیزی سے اطمینان قلب اور جودت طبع کی دولت نصیب ہوتی ہے ورنہ ؎

سکون قلب کی دولت کہاں دنیائے فانی میں

اس وصف سے مستعدی بھی بروئے کار آتی ہے۔

"درویشی میں بہت راحت ہے، اور وہ پناہ گاہ ہے دنیا کی آفتوں سے محفوظ رہنے کیلئے"

ہر خانوادۂ سلوک میں درجات سلوک متعین ہیں، بعض مشائخ کے نزدیک پندرہ درجے ہیں اور پانچواں درجہ کشف وکرامت کا درجہ ہے، حضرت محبوب الٰہیؒ کا ارشاد ہے کہ سلوک کے سَو درجے ہیں سترہواں درجہ کشف وکرامت کا ہے؎ (فوائد الفواد ص ۱۱) جب سالک اس مقام پر پہنچتا ہے تو کشف وکرامت کے وصف سے متصف ہوجاتا ہے تاہم سالکین راہ طریقت کو یہ ہدایت ہے تا وقتیکہ کل درجات طے نہ کرلیں اظہار کرامت سے مجتنب رہیں، ارشاد فرمایا۔

"جب کوئی مرتبۂ کرامت کو پہنچے تو اظہار کرامت سے مجتنب رہے، ورنہ دیگر مراتب سلوک طے نہ کرسکے گا۔ اور کشف وکرامت ہی میں الجھ کر رہ جائے گا البتہ جب پورے درجات طے کرلے بلکہ ان سے بھی سَو درجے آگے نکل جائے تو اظہار کرامت میں کوئی مضائقہ نہیں، مرد کامل وہی ہے جو تا وقتیکہ تمام مراتب طے نہ کرلے اظہار کرامت نہ کرے"

؎ یہ طبقہ جنیدیہ کا نقطۂ نظر ہے (فوائد السالکین ص ۲۰)

یہ بھی فرمایا :۔

"عالم تحیر میں پہنچ جانے کے بعد اظہار کرامت میں کوئی مضائقہ نہیں۔"

اس مقام پر فائز ہونے کے بعد کرامت کا ظہور بلا ارادہ بھی ہوتا ہے۔ ارشاد ہے :۔

"اسرارِ الٰہی کا اظہار قرب الٰہی میں مانع ہے، کامل الحال وہی ہے جو کسی حال میں بھی رازِ دنیاز اور اسرار الٰہی کا اظہار ہونے نہیں دیتا، اسی لیے وہ گنجینۂ اسرار الٰہی بن جاتا ہے۔"

کرامت اور اسرار الٰہی میں بین فرق ہے جو امتیاز کی صلاحیت نہیں رکھتے، وہ کرامت کو بھی اسرار کے حکم میں جانتے ہیں جو غلط ہے :۔

"مردانِ خدا ایسے بھی ہیں جنھوں نے مدارج سلوک طے کر لیے ہیں، اور بہت آگے نکل گئے ہیں، لیکن کیا مجال جو اسرار الٰہی کی بھاپ بھی منہ سے نکلی ہو، دراصل وہی گنجینۂ اسرار الٰہی ہیں۔"

ایک چشم دید، حیرت انگیز و سبق آموز واقعہ کو بیان کرنے کے بعد اس کے تاثرات کو قادرِ مطلق کی قدرتِ کاملہ کے اعتراف کے اسلوب میں کچھ ایسے والہانہ انداز میں بیان فرمایا ہے کہ دل کی دنیا آج بھی زیر و زبر ہوئے بغیر نہیں رہتی، ارشاد ہے :۔

"جب وقت آہی جاتا ہے اور نسیم لطف و کرم چلنے لگتی ہے تو ہزار ہا مبتلائے فسق و فجور اور آلودۂ معصیت و گناہ کو توفیق توبہ نصیب ہوتی ہے، پھر نسیم لطف و کرم انھیں میکدۂ تذلیل و تعیش سے اٹھاتی اور سجادہ نشینی کی بلند و باعظمت مسند پر لے جا بٹھاتی ہے، اور وہ بخش دیے جاتے ہیں اور جب کبھی قہر و غضب کی باد تند چلنے لگتی ہے، تو پھر یہی ہوتا ہے کہ ہزار ہا سجادہ نشینانِ مسند عظمت و کرامت کو اٹھاتی ہے۔ اور میکدۂ تعیش و تذلیل کے قعر مذلت میں لے جا ڈالتی ہے، (پناہ بخدا)

حسن عمل کی ترغیب و تحریص کے باب میں ارشاد فرمایا:۔

فضل ایزدی تو بہر حال اور ہمہ وقت نازل ہے تاہم جسے جو ملا ہے جد و جہد اور حسنِ عمل کی برکت سے ملا ہے، اس لیے جہد و کوشش لازم ہے، اس سے کسی حال میں غفلت مناسب نہیں"

ارشاد ہے:۔

جس کسی نے راہ محبت الٰہی اختیار کی، اور مصیبت و بلا سے گھبرایا تو جان لو کہ وہ محب صادق نہیں ہے"

بتانا مقصود یہ ہے کہ راہ سلوک میں استقامت و استمالت مقدم و درکار ہے۔

مرشد کی ارادت ہی بیش بہا نعمت ہے۔ مرید کو لازم ہے کہ شیخ کی روش پر قائم و دائم رہے، اس سے سرِ مو انحراف نہ کرے۔

میری بھی یہی تمنّا ہے کہ میری یہ کوشش ارادتمندی سے متصف رہے۔ آمین

فرمایا:۔

شیخ کی حیات میں شیخ کا جتنا ادب و احترام ملحوظ رہتا ہے اتنا ہی ان کی وفات کے بعد بھی ملحوظ رہنا چاہیے۔ اس لیے کہ وہ ہماری نظروں سے اوجھل سہی مگر ہم ان سے اوجھل نہیں ہیں۔ اس لیے ہمارا عمل وہی رہنا چاہیے جو تھا۔

فرمایا:۔

نسبت کی تقویت کے لیے تجدید بیعت بیحد مفید ہے۔ اگر شیخ موجود نہ ہو یا بقید حیات نہ ہو تو اس کے کسی کپڑے سے تجدید بیعت کی جا سکتی ہے، فرمایا خواجۂ بزرگ حضرت معین الدین حسن سنجریؒ اسی پر عمل پیرا تھے، اور میں بھی ہوں۔

حضرت بابا صاحبؒ بھی اسی پر عمل پیرا تھے،

صحبت بد سے زیادہ کوئی چیز مضر نہیں، صحبت بد بلائے بے درماں

ہے، صحبت کا اثر لازم ہے، للصحبۃ تاثیر، صحبت بد سے بچنے کی
ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے، مولانا رومؒ نے فرمایا ہے:-

یک زمانہ صحبت با اولیاء — بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا
صحبت صالح ترا صالح کند — صحبت طالع ترا طالع کند

ایسے ہی انمول موتی فوائد السالکین میں جا بجا بکھرے ملتے ہیں، اگر دل زندہ پہلو میں
ہے، اور نگاہ پاک اور باریک بین ہے، تو فوائد السالکین صحیفۂ رشد و ہدایت ہے، اس کا
ہر صفحہ مرقع ہے، عجائبات قدرت کا - ہدایت اسی کو نصیب ہوتی ہے توفیق الٰہی جس کی
سازگار ہوتی ہے - واللہ یھدی من یشاء

۱۱- اہم ترین روایتیں | ملفوظات مجموعہ ہوتے ہیں ان بیانات کے جو صوفی بزرگ
اخلاق فاضلہ اور اعمال صالحہ اور منازل سلوک کی رہنمائی کے لیے طالبوں کے مجمع میں
بیان کیا کرتے تھے اور کرتے ہیں، ان میں سامعین کی استعداد عمل کا اور ان کے امراض قلبیہ
کے دفعیہ کا اور روحانی ترقی کا پورا سر و سامان ہوتا ہے -

کامل صوفی بہت بڑا ماہر نفسیات ہوتا ہے، اس کی نظر قلوب کی تہ پر اور طالبوں کی
افتاد طبع پر ہوتی ہے، وہ ان رازہائے سربستہ سے آگاہ ہوتا ہے جو دلوں کی تہ میں چھپے
ہوئے ہوتے ہیں، حتیٰ کہ وہ بھی ان سے آگاہ نہیں ہوتا جس کے دل میں وہ تہ نشین ہوتے ہیں،
مگر کامل صوفی نفس کی ان چوریوں کو پکڑ لیتا ہے، اور اس خوبی سے ان کا تدارک کرتا
ہے کہ طالب کو خبر تک نہیں ہوتی، بقول حضرت بابا صاحبؒ "پیر مشاطہ مرید باشد"

کتب ملفوظات کا مطالعہ شاہد ہے کہ بظاہر کتب ملفوظات میں نمایاں امتیاز نہیں،
لیکن نظر متعمق بتاتی ہے کہ عام ملفوظات میں اور ان مجموعۂ ملفوظات میں قدرے فرق ہے
جن کے سامعین میں کوئی ایسی شخصیت شریک ہے جسے مخلوق کی رہنمائی کی اور جانشینی
کی ذمہ داری سنبھالنی ہوتی ہے، ان مجموعۂ ملفوظات میں وہ اہم روایتیں بھی ہوتی ہیں جنکی

تفہیم سے وہ قاصر رہتے ہیں، جو ذوقِ تصوف سے لذت آشنا نہیں ہیں۔ ایسی ہی کچھ روایتیں فوائد السالکین میں ہیں، ان میں سے بعض کو نذر ناظرین کیا جاتا ہے، اور ان نکات کی موشگافی کی جاتی ہے جو تفہیم میں قدرے حائل ہوتے ہیں، اور جو "مل او جھل پہاڑ" کی مصداق ہیں۔

روایت نمبر ۱ قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہ العزیز نے بیان فرمایا ہے۔

ایک دفعہ میں اور قاضی حمید الدین ناگوری ہم دونوں دریا کے مسافر تھے[۱]۔ بھوک کے غلبے سے متاثر ہو کر ایک جگہ بیٹھ گئے، جنگل بیابان، ہو کا مکان، دریا کا کنارا، خورد و نوش کا سامان کہاں؟ دم بھر بعد ہی ایک بکری نمودار ہوئی، جو دو روٹیاں جو کی منہ میں لیے ہوئے تھی، آئی اور وہ روٹیاں ہمارے آگے رکھ کر چلی گئی، ہم نے کہا یہ بکری نہیں تھی، مردانِ غیب میں سے کوئی تھا۔ ہم نے وہ روٹیاں اٹھالیں، اور کھالیں، اور کہا کہ یہ اذوقہ ہمیں غیب سے ملا ہے۔

اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بچھو اونٹ کا اونٹ بہت بڑا دریا کی طرف دوڑا چلا آرہا ہے، دریا کے کنارے پہنچتے ہی دریا میں اتر گیا، اور پار جانے لگا، ہمیں حیرت ہوئی، اور ہم نے کہا اس میں بھی کوئی سر، کوئی بھید ہے، آؤ چل دیکھیں، مگر دریا میں کشتی کہاں جو پار جاتے، ناچار بارگاہ ایزدی میں التجا کی "الہ العالمین! اگر ہم اوصاف

---

[۱] مسافر لبودیم، "ہم مسافر تھے" میں بودیم صیغہ جمع متکلم ہے اس کو صیغہ واحد غائب بتانا علم صرف سے کمال کم آگاہی کی دلیل ہے۔ حیرت ہے ان تنقید نگاروں پر جو بودیم کو صیغہ واحد غائب لکھتے ہیں (منادی دہلی بابا فرید نمبر ص ۱۸۵)

درویشی کی تکمیل کرلی ہے تو دریا ہمیں راستہ دے دے[1] تاکہ ہم بھی دیکھیں کہ یہ بھید کیا ہے"

خدا کی قدرت دریا شق ہوگیا خشکی نکل آئی، آگے آگے بچھو، پیچھے پیچھے ہم دریا پار پہنچ گئے، وہاں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک شخص درخت کے نیچے سو رہا پڑا ہے، اس کو ڈسنے کے لیے سانپ اتر آیا ہے، سانپ بھی کیا ہے اژدہا کا اژدہا ہے، ہوگا کوئی ہزار من کا، بچھو سانپ کے پاس پہنچا، ڈنک مارا، اور غائب ہوگیا، سانپ مر کے ڈھیر ہوگیا، ہم سمجھے کہ یہ کوئی بزرگ بندۂ خدا ہے جب ہی تو اللہ پاک نے یہ کرم فرمایا ہے، اور اس کی جان بچائی ہے، یہ جاگے تو ہم اس سے ملیں، اس ارادے سے ہم اس کے پاس پہنچے، دیکھتے کیا ہیں، وہ تو شرابی ہے، شراب پیے نشے کیے مدہوش پڑا سو رہا ہے، یہ دیکھ کر ہمیں حیرت بھی ہوئی، اور ندامت۔ ہوئی، ہم نے کہا کاش ہم نہ آئے ہوتے، اور یہ مکروہ منظر نہ دیکھتے، ہم اسی پس و پیش میں تھے کہ ندائے غیب سنائی دی۔

اے ہمارے پیارو! اگر ہم نیکوں ہی کی رکھوالی کریں تو بدوں کی

---

[1] اپنے کسی عمل صالح کے وسیلے سے بارگاہ ایزدی میں التجا کرنی اور دعا مانگنی بروئے حدیث مبارکہ جائز و روا بلکہ مقبول ہے (بخاری و مسلم ترغیب و ترہیب) یہ دعا حضرت قطب صاحب اور قاضی صاحب نے مانگی تھی مگر ایک تنقید نگار سمجھے ہیں کہ حضرت بابا صاحب بھی اس دعا میں شریک ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ بابا صاحب کی عمر ۱۰-۱۲ سال سے زیادہ نہیں ہوگی اور اس سن وہ دعا کر رہے ہیں کہ اے پروردگار اگر ہم درویشی میں مکمل ہو چکے ہیں تو دریا ہمیں راستہ دے دے ۔۔۔ ابھی منازل سلوک بھی پورے نہیں ہوئے کہ درویشی میں مکمل ہونے کا حوالہ آگیا۔ (منادی دہلی بابا فرید نمبر ص ۱۸۷) تنقید نگار کے فہم و دانش کی داد دیجیے خواہ ماتم کیجیے!

کون کرے گا جب وہ شرابی جاگا اور مرے ہوئے سانپ کو اپنے پاس پڑے دیکھا تو دہشت زدہ حیران رہ گیا، ہم نے سارا ماجرا اسے سنایا، وہ بہت شرمندہ ہوا اور اس نے توبہ کی حتیٰ کہ وہ نیکوکار بندگانِ خدا میں سے ہوگیا، کہتے ہیں کہ اس نے ننگے پیروں اور پاپیادہ ستر حج کیے۔

اختتام پر قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہ العزیز نے فرمایا:۔

جب وقت آجاتا ہے اور نسیم لطف وکرم چلنے لگتی ہے، تو ہزار ہا مبتلائے فسق وفجور اور آلودۂ معصیت وگناہ کو توفیق توبہ نصیب ہوتی ہے اور پھر نسیم لطف و کرم انھیں میکدۂ تذلیل وتعیش سے اٹھاتی اور سجادہ نشینی کی بلند ترین اور باعظمت مسند پہ لے جا بٹھاتی ہے اور وہ بخش دیے جاتے ہیں، اور جب کبھی قہر وغضب کی بادِ تند چلنے لگتی ہے تو یہی ہوتا ہے کہ ہزار ہا سجادہ نشینانِ مسند عظمت و کرامت کو اٹھاتی ہے اور میکدۂ تذلیل وتعیش کے قعر مذلت میں ڈال دیتی ہے۔ (پناہ بخدا) (فوائد السالکین فارسی ص ۸-۹)

یہ روایت تمام تر عجائبات قدرت کا مرقع ہے اور عجب سبق آموز ہے، صدیاں گزر گئیں، تاثیر کا یہ عالم ہے کہ آج بھی کوئی اہل دل متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دل کی دنیا زیر وزبر ہو جاتی ہے اور خدائے قدوس کی قدرت کاملہ کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے۔

اس میں حیرت وعبرت کا وہ سروسامان ہے جو ان عجائبات قدرت میں بھی نہیں ہے، جن کا ذکر عہد قدیم کے سفرناموں میں ہے، یہ روایت اوصاف درویشی کی جامع اور ادب و انشا کا شاہکار ہے۔ کتنی سبق آموز ہے، وہ ندائے غیبی جو کہتی ہے کہ انسانیت کی دنیا میں مساوات ہے، اور انسان دوستی ہے، من وتو کا امتیاز یہاں نہیں چلتا، بندگان خدا

[1] یہ روایت سیر الاولیا (رج اص ۵۲ و ۵۳) میں بھی ہے۔ جسے مخالفین کتب ملفوظات نہایت درجہ مستند اور ادب صوفیہ میں بے مثل مانتے ہیں (منادی دہلی بابا فرید نمبر ص ۱۲)

نیک و بد سب اسی کے ہیں، لاچار و معذور کوئی بھی ہو، امتیاز نیک و بد سے دور رہ کے اس کی دستگیری کرنی چاہیے، یہی وہ نقطۂ عروج ہے، جو اکابر صوفیہ کے اعمال و خدمات کا محور ہے، اونچ نیچ، چھوت چھات اور نیک و بد کے امتیاز کا گزر کہاں؟ اسی امتیاز کو ذہن سے نکال پھینکا تھا کہ کوئی بزرگ ہے، جس کی شخصیت جاذبِ رحمت ہے، ذہن نشین کرانا یہ تھا کہ مقناطیس عصیاں بھی جاذبِ رحمت ہے، رحمت والا قادرِ مطلق ہے۔ اور بے چارگانِ عالم کا وہی دستگیر اور خبر گیر ہے، اس کی قدرت کاملہ میں کسی کو دخل نہیں۔ لاریب وہ قادرِ مطلق اور وحدہٗ لاشریک ہے، یہی عین الیقان ہے یہی دلنشین رہنا چاہیے۔

روزمرہ و محاورہ میں مبالغہ کی آمیزش بھی ہوتی ہے جو ان کی تاثیر کو دوبالا کر دیتی ہے اس وصف سے کوئی زبان مستثنیٰ نہیں، سب ہی سمجھتے ہیں کہ مدعا کیا ہے، اسے مبالغہ آمیز بیان سے تعبیر نہیں کیا جاتا، تشبیہ و استعارہ سے مفہوم کی برمحل جو وضاحت ہوتی ہے، اور جو روشنی ملتی ہے، دفتر کے دفتر اس کے بالمقابل بے مصرف رہتے ہیں، نشتر اسلوب کی سحرسامانی پناہ بخدا، کژدم بقیاس شتر بزرگ اور مار بقیاس ہزار منے محاورہ نہیں تو اور کیا ہے، جنھوں نے وحوش و طیور کے عجائب گھروں کی سیر کی ہے، یا ان کتابوں کا مطالعہ کیا ہے جو عجائب المخلوقات کے موضوع پر ہیں، اور جو زباں داں ہیں اور اسلوب کی ہمہ گیری اور کارفرمائی سے آگاہ ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ہیئت و جسمانیت کی عمیز حالت اور وزن کی فراوانی کا نمایاں اظہار کے سوا اور کیا ہے۔

فارسی داں طبقہ ہمچنیں گویند کے صرف محل سے آگاہ اور واقف ہے، کہ یہ جزو جملہ شہرتِ عامہ اور افواہ کا ترجمان ہے، اخبار مصدقہ کا مخبر نہیں، بات کا بتنگڑ بنا دینا عوام کے مزاج کی خاصیت ہے، سات کو ستر کہنے لگنا، ان سے بعید نہیں ہے اس سے انکار نہیں کہ ان کی یہ روش ان کی پسند و ناپسند کی آئینہ دار بھی ہے، ہمچنیں گویند کا بیان بتاتا ہے کہ وہ شخص عوام میں مقبول ہو چکا تھا، عوام کہنے لگے تھے کہ اس نے سترج

کر لیے ہیں، نہ گنتی گن کر یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ واقعہ کا عہد وقوع کیا متعین ہوتا ہے، اور نہ کسی افواہ پر یقین کیا جا سکتا ہے، جو عوام کی نفسیات سے آگاہ ہیں، ان کے لیے یہ بیان محل اعتراض نہیں۔

اکابر صوفیہ کا اعتماد علی اللہ، سفر میں بے سروسامانی اور رزاق مطلق کی رزاقیت کی شان دعائے مستجاب کی تاثیر سالکان راہ طریقت کے لیے مشعل راہ ہے، یہ روایت ہر اعتبار سے جامع، پُر تاثیر اور ادب صوفیہ میں بے نظیر ہے، ان ہی اوصاف سے متاثر ہو کر امیر خورد کرمانی نے اسے انتخاب کیا اور سیر الاولیا کے اوراق کو اس سے زینت بخشی ہے، جو ادب صوفیہ میں بے مثل اور نہایت درجہ مستند مانی جاتی ہے، اس واقعہ سے جو اثر قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہ العزیز کے مبارک قلب پر ہوا ہے آپ نے نہایت موثر الفاظ میں اس روایت کے آخر میں بیان فرمایا ہے، جو تمام تر قادر مطلق کی قدرت کاملہ کا اعتراف ہے اور اس روایت کے موثر و مستند ہونے کی دلیل ہے، آج بھی اس کا یہ اثر ہے کہ پڑھنے والا بہر دل اس کے اثر سے متاثر رہتا ہے اور حجابات مترفع ہونے لگتے ہیں۔

روایت نمبر ۲ | قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین قدس اللہ سرہ العزیز نے فرمایا:

"ایک مرتبہ میں اور قاضی حمید الدین ناگوری ہم دونوں خانۂ کعبہ کا طواف کر رہے تھے، ایک بزرگ تھے، انھیں بھی شیخ عثمان کہتے تھے، جو بندگان خواجہ ابوبکر شبلی میں سے تھے، اور نہایت بزرگ تھے، ہم نے انھیں طواف میں دیکھا اور ہم ان کے پیچھے پیچھے قدم بہ قدم چلنے لگے، وہ بزرگ روشن ضمیر تھے، وہ ہماری اس اتباع سے آگاہ ہو گئے، مونھ پیچھے کیا، اور فرمایا، ظاہری متابعت کیا کرتے ہو، وہ کرو جو میں کرتا ہوں۔ ہم دونوں نے دریافت کیا کہ آپ کیا کرتے ہیں؟ فرمایا کہ

میں روزانہ[1] ہزار بار ختم قرآن کیا کرتا ہوں، ہم دونوں ان کی بات سن کر
حیران رہ گئے، ہم نے سوچا ہر سورت کی ابتدا سے کچھ تلاوت کر لیتے ہوں گے۔
یہ خیال ہمارے دل میں آیا ہی تھا کہ انھوں نے موکنڈا اوپر اٹھایا اور بآواز بلند
کہا کہ نہیں حرف حرف پڑھتا ہوں۔" (فوائد السالکین فارسی ص ۱۳)

ہر علم وفن کے عہد عروج میں کچھ ایسی شخصیتیں منصۂ شہود پر آتی ہیں جن کے کارناموں سے صدیوں اہل علم انگشت بدنداں رہتے ہیں، یہ روحانیت وتصوف کا عہد عروج تھا جو گزر گیا، اور اپنی یاد چھوڑ گیا، نیک بندے اس کی یاد ہی سے ہدایت ورشد کی شمع روشن رکھتے ہیں لیکن اس قوم کے ذی علم افراد کے اذہان جو آمادۂ زوال ہوتی ہے، یا ہو چکی ہوتی ہے ایسے واقعات سے سبق حاصل کرنے کی صلاحیت کھو چکے ہوتے ہیں، وہ انھیں مبالغہ آمیزی سے تعبیر کرتے اور انکار کی راہ اختیار کرتے ہیں، ایسے اشخاص کا وجود قوم کے لیے فال نیک نہیں بلکہ قوم کی پستی اور مذلت کی علامت ہے۔

جب ہمارا ماضی تابناک تھا تو ایسے محیر العقول واقعات سے انکار نہیں کیا جاتا تھا، کیونکہ اگر بعینہٖ وہ نہیں تو ان جیسے متعدد واقعات سے فضا معمور تھی، ایک بزرگ تھے جو آغاز صبح صادق سے طلوع آفتاب تک قرآن پاک ختم فرمالیا کرتے تھے (فوائد الفواد ص)، امیر خورد کرمانی نے لکھا ہے کہ خواجہ ابو یوسف چشتی روزانہ پانچ قرآن پاک ختم کر لیا کرتے تھے، پھر دیگر امور کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔ (سیر الاولیاء ص ۴۲)

فوائد السالکین کی روایت کو بالفاظہا دیگر حضرت محبوب الٰہیؒ نے بھی نقل فرمایا ہے جو فوائد الفواد، کی زینت ہے، فرق اتنا ہی ہے جتنا مختلف اشخاص کے بیان میں ہوتا اور ہو سکتا ہے۔ ختم قرآن کی تعداد سات سو بیان فرمائی ہے[2] ہزار بھی محیر العقول ہے، اور سات سو بھی، حضرت محبوب الٰہیؒ نے اس روایت کو نہ تو مبالغہ آرائی سے تعبیر فرمایا اور نہ چشتی بزرگوں کے معتقد

[1] من ہر روز ہزار قرآن ختم می کنم کا ترجمہ ہشت بہشت میں بیس ہزار لکھا ہے اور ان بزرگوں کا نام برہان الدین لکھا ہے، جو غلط ہے۔

و تعلیمات کے خلاف قرار دیا، بلکہ جب حاضرین مجلس میں سے آپ کے مخلص مرید اعزالدین علی شاہؒ نے دریافت کیا کہ شاید یہ کرامت ہے تو آپ نے فرمایا:

آرے کرامت باشد ہر معاملہ کہ بعقل	"ہاں کرامت یہی ہے، جو بات
باز خواند آں دیگر ست و آنچہ در	بعید از عقل ہے وہ کچھ اور ہے، اور
عقل گنجائی نہ باشد کرامت باشد	جو عقل میں نہ سمائے وہ کرامت ہی
(فوائدالفواد ص ۷)	ہے۔"

مولانا علاء الدین کرمانیؒ اس نقطۂ نظر سے متفق ہیں، ان کا ارشاد فوائدالسالکین کی روایت کے ساتھ ہے اور وہ یہ ہے:

"جو بات سمجھ سے باہر ہے وہی کرامت ہے، وہ عقل میں سماتی نہیں ہے، یقیناً ان بزرگ کا ہزار قرآن مجید ختم کر لینا کرامت خاص ہے۔"

"قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین اوشی قدس اللہ سرہ العزیز آبدیدہ ہوئے اور فرمایا جسے جو ملا ہے حسن عمل کی بدولت ملا ہے، اور اگرچہ فضلِ ایزدی سب ہی کے شریکِ حال ہے مگر جد و جہد لازم ہے۔"

(فوائدالسالکین فارسی ص ۱۳)

کیا حضرت محبوبِ الٰہیؒ سے زیادہ راہ آشنا اور عالم و عارف آج ہے کوئی؟ لہٰذا یہ ماننا ہوگا کہ یہ روایت بلاشبہ چشتی بزرگوں کے عقائد اور تعلیمات کے عین مطابق ہے، اور کلام کرنے کی گنجائش نہیں ہے، جو منکر ہیں وہ چشتی سلوک کی راہ و رسم سے ناآشنا ہیں۔

اس روایت میں از بندگانِ خواجہ ابوبکر شبلی ہے ان کا سنہ وفات ۳۳۴ھ (945) بتایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ ان کے اور قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین قدس اللہ سرہ العزیز (متوفی ۶۳۳ھ / 1235) کے زمانے میں ڈھائی تین سو سال کا فصل ہے، قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہ العزیز کے ایام حیات میں خواجہ

ابو بکر شبلیؒ کے کسی غلام کا بقید حیات ہونا ممکن نہیں۔ مگر یہ شبہ لاحق ہو سکتا ہے، بندہ اور بندگان کی معنویت وحقیقت اور صرفِ محل سے ناواقف ہونے کی بنا پر۔ بندہ اسم فاعل ہے بستن مصدر سے، جس کے معنی ہیں کسی سے وابستہ ہونا متعلق ہونا اور اس تعلق میں نہ قرب مزاحم ہے نہ بعد۔ وہ بھی بندہ ہے جو کسی کے عہد حیات میں اس سے وابستہ ہے اور وہ بھی ہے جو مدت مدید کے بعد بلکہ وفات کے بعد وابستگی رکھتا ہے، خواجہ بزرگ خواجہ معین الدین سنجری قدس اللہ سرہ العزیز کا ارشاد ہے :۔

"یکے از کمترین بندگان محمد رسول اللہ ام صلی اللہ علیہ وسلم" (فوائد السالکین ص۳)

حضرت شیخ شرف الدین بوعلی قلندرؒ (المتوفی ۷۲۴ھ) کی غزل کا مشہور مطلع ہے ؎

حیدری ام قلندرم مستم   بندۂ مرتضیٰ علیؓ ہستم

عہد حاضر کے ایک فاضل اہل قلم ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے حکیم سنائی کے متعلق لکھا ہے :۔

"وہ دونوں اماموں کے بندے تھے"۔ (ماہنامہ معارف اعظم گڑھ نومبر ۱۹۶۹ء ص ۳۳۲)

ڈاکٹر صاحب موصوف کی دونوں اماموں سے مراد امام اعظم ابوحنیفہؒ (متوفی ۱۵۰ھ/767ء) اور امام شافعیؒ (متوفی ۲۰۴ھ/819ء) ہیں اور یہ واقعہ ہے کہ یہ دونوں بزرگ حکیم سنائی (متوفی ۵۲۵ھ/1130ء) کے ہمعصر نہیں تھے، تین تین سو سال سے زیادہ کا فصل ہے، مگر پھر بھی "وہ دونوں اماموں کے بندے تھے"۔ اہل کمال کی روش بھی ہے جو الفاظ کی سیرت وحقیقت سے آگاہ ہیں، وہ صرفِ محل سے ناواقف نہیں، لہٰذا اس وہم کی بنا پر کہ کسی کا صدیوں بعد از بندگان قلاں ہونا ممکن نہیں۔ عدم واقفیت کی علامت ہے، ہمعصر بھی از بندگان سے ہو سکتا ہے اور صدیوں بعد بھی، اس روایت کو نہ تاریخ رد کرتی ہے، نہ چشتی بزرگوں کے مسلک کے خلاف ہے، البتہ علمی کم مایگی سدِ راہ ہو سکتی ہے۔

لے انوار الفرید ص ۲۰ (مطبوعہ پاکستان)

روایت نمبر ۳ | قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس سرہ العزیز نے فرمایا ہے۔

"میں اجمیر شریف میں خواجہ بزرگ خواجہ معین الدین سنجری قدس اللہ سرہ العزیز کی خدمت میں حاضر تھا، راجہ پتھورا زندہ تھا، اور یہ کہا کرتا تھا کہ یہ درویش اگر یہاں سے چلا جائے تو کیا ہی اچھا ہو، خواجہ بزرگ نے یہ بات سنی اس وقت کچھ اور درویش بھی حاضر خدمت تھے، اور حالت سکر میں بیٹھے تھے، خواجہ بزرگ مراقب ہوئے، اور مراقبے ہی میں آپ نے یہ فرمایا "پتھورا را زندہ بمسلمانان دادیم (ہم نے پتھورا کو زندہ ہی مسلمانوں کے حوالے کر دیا) کچھ دنوں بعد ہی سلطان شمس الدین محمد شاہ پہنچا اور اس نے پتھورا کو زندہ گرفتار کر لیا، شہر کو برباد کر ڈالا۔"

(فوائد السالکین فارسی ص۱)

اجمیر کو سلطان محمد غوری نے ۵۸۸ھ ۱۱۹۲ء میں فتح کیا تھا، محمد غوری کا نام معز الدین محمد بن سام تھا، بعض تاریخوں میں شہاب الدین محمد غوری لکھا ہے اور بعض میں محمد شاہ غوری[1] لکھا ہے۔ اس بیان میں شمس الدین کتابت کی بھی غلطی ہو سکتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ شمس الدین بطور لقب فرمایا ہو کیونکہ اس کی بدولت آفتاب اسلام نے ہند کے دور افتادہ علاقے کو دین کی روشنی بخشی تھی اور یہ غلط ہے تو اسمار کی ایسی غلطیاں تاریخی کتابوں میں بھی ملتی ہیں، کاتب کے سہو سے نہ تو کسی روایت کو غیر مستند کہا جاتا ہے اور نہ کسی کتاب کو جعلی قرار دیا جا سکتا ہے۔ فوائد السالکین جب کبھی صحت و مقابلہ سے مزین ہو کر شائع ہو گی تو سطحی غلطیاں رفع ہو جائیں گی۔ یہ روایت بذاتہ معتبر و مستند ہے۔ یہ روایت سیر الاولیاء ص ۴۶-۴۷ میں بھی ہے۔

روایت نمبر ۴ | قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہ العزیز نے فرمایا:۔

"ایک دن خواجۂ بزرگ خواجہ معین الدین سنجری قدس اللہ سرہ العزیز

[1] شمس الدین مثل شہاب الدین بطور لقب فرمایا ہے

اور شیخ اوحد الدین کرمانیؒ اور شیخ شہاب الدین سہروردیؒ اور دعا گو ایک جگہ بیٹھے تھے، اولیائے ماضی کا ذکر خیر ہو رہا تھا، سلطان شمس الدین اعز اللہ برہانہ ہاتھ میں پیالہ لیے سامنے سے گزرا سب نے اسے دیکھا خواجہ بزرگ خواجہ معین الدین سنجریؒ نے دیکھتے ہی فرمایا کہ جب تک یہ لڑکا دہلی کا بادشاہ نہ ہوگا، مرے گا نہیں۔" (فوائد السالکین فارسی ص ۱۶)

خواجہ بزرگ خواجہ معین الدین سنجریؒ قدس اللہ سرہ العزیز کی اس پیشین گوئی سے اولیاء اللہ کی بصیرت باطنی کی تائید ہوتی ہے[1]۔ ایسے واقعات اکثر بزرگوں سے ظہور میں آتے رہتے ہیں۔ اتباع سنت اور مجاہدات کی بدولت اولیاء اللہ ایسے اوصاف سے متصف ہوتے ہیں۔ انکار کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے، امیر خورد کرمانیؒ نے حضرت محبوب الٰہیؒ سے متعلق متعدد ایسے واقعات نقل کیے ہیں۔ (سیر الاولیاء ص ۱۴۱-۱۴۲)

رہی یہ بات کہ سلطان شمس الدین کے نام کے ساتھ انار اللہ برہانہ ہے تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں، اسے اصطلاح اموات سے تعبیر کرنا صحیح نہیں غلط ہے، اعزازی کلمات کے وہ جملے جو بزرگوں کے ناموں کے ساتھ لکھے ملتے ہیں ان کا مدعا ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ ان ہی ناموں کے ساتھ ہو سکتے ہیں جو وفات پا چکے ہیں، بلکہ ان کے ناموں کے ساتھ بھی ہو سکتے ہیں جو بقید حیات ہوتے ہیں۔

ان اعزازی کلمات کی اصل یہ آیت کریمہ ہے،

رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ — راضی ہوا اللہ ان سے اور وہ راضی ہوئے اللہ سے۔ (توبہ: ۱۰۰)

یہ آیت کریمہ قرآن پاک میں کئی جگہ ہے، حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ کا ارشاد ہے

[1] اتقوا فراسۃ المومن فانہ ینظر بنور اللہ تعالیٰ (الحدیث) مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے نور سے دیکھتا ہے۔

کہ اس آیت کا نزول السابقون الاولون من المهاجرین والانصار سے متعلق ہے، جو بقیدِ حیات بھی تھے، اور وفات بھی پاچکے تھے، گویا کہ یہ مطلق ہے، وفات یافتہ حضرات کے ساتھ مقید نہیں ہے، یہی حال دیگر اعزازی کلمات کے حکموں کا ہے، خواجہ گیسو دراز بندہ نوازؒ کا ارشاد ہے:-

"صلوة اللہ علیہ ورحمۃ اللہ علیہ وقدس سرہٗ ورضی اللہ عنہ ورضوان اللہ علیہم، اگرچہ مختلف الفاظ ہیں، مگر ان کا مفہوم ایک ہی ہے، اور وہ ہے الصلوٰۃ من اللہ والرحمۃ۔" (جوامع الکلم ملفوظ ۴ شعبان ۸۰۲ھ)

متقدمین نے بلا امتیاز ان اعزازی کلمات کو ان کے لیے بھی استعمال کیا ہے، جو بقیدِ حیات تھے، اور ان کے لیے بھی جو وفات پاچکے تھے، وفات یافتہ حضرات کے ناموں کے ساتھ ان کا استعمال عام ہے مگر فی زمانہ ان بزرگوں کے ناموں کے ساتھ کم استعمال ہے، یا بالکل نہیں ہے جو بقیدِ حیات ہیں، مگر عہد قدیم میں رواج تھا، اس نقطہ نظر کی تائید میں صرف تین معتبر امثلہ پیش کی جاتی ہیں:-

(۱) حضرت محبوب الٰہیؒ کا ارشاد ہے کہ حضرت بابا صاحبؒ نے فرمایا کہ تو بدرالدین اسحاق علیہ الرحمہ بروید" (فوائد الفواد ص ۵۹)

(۲) اجودھن (پاکپتن) کے قاضی ابوالفضل عبداللہ نے حضرت بابا صاحبؒ کی حیاتِ طیبہ میں حضرت بابا صاحبؒ کا ذکر کیا تو کہا شیخ فریدالدین قدس اللہ سرہ العزیز"

(فوائد الفواد ص ۹۷)

(۳) حضرت محبوب الٰہیؒ کے بزرگ خلیفہ علامۃ الوریٰ مولانا فخرالدین زرادیؒ نے حضرت والا کی حیاتِ مبارکہ میں رسالہ اصول السماع تصنیف فرمایا تھا، حضرت کا نام نامی اس میں اس طرح لکھا ہے، کما قال شیخنا نظام الملۃ والدین قدس اللہ سرہ العزیز' (رسالہ اصول السماع قلمی ص ۱۶)

یہ مسئلہ بھی صاف ہو گیا، غلط فہمی اور شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہی، اب بے تکلف یہ تسلیم کیا جائے گا کہ یہ روایت اولیاء اللہ کے احوال کی اور ان کی بصیرت کی آئینہ دار اور سبق آموز ہے۔

روایت نمبر ۵ | قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہ العزیز نے فرمایا:-

"ایک دن میں اور قاضی حمید الدین ناگوریؒ دونوں شیخ علی سجزی قدس اللہ سرہ العزیز کی خانقاہ میں تھے، محفل سماع تھی، گانے والوں نے جب یہ شعر گایا:-

کشتگان خنجر تسلیم را ہر زماں از غیب جانے دیگر ست[1]

تو میں اور قاضی حمید الدین ناگوری اس شعر سے بہت ہی متکیف ہوئے۔ لہٰذا تین رات دن اس شعر سے متحیر و مدہوش رہے، پھر اپنے گھر چلے آئے اور گانے والوں سے یہی شعر گواتے رہے، تین رات دن اور بھی لگاتار اس شعر سے متحیر رہے کہ ہمیں اپنی بھی خبر نہ تھی، البتہ نماز بروقت پڑھ لیا کرتے تھے، اور پھر سماع میں محو و مشغول ہو جاتے تھے، اس طرح سات شبانہ روز محو حیرت رہے، گانے والے جب یہ شعر گاتے تو ایسی حالت و حیرت طاری ہو جاتی کہ اسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔" (فوائد السالکین فارسی ص)

اسی کے مماثل ایک روایت حضرت محبوب الٰہیؒ نے بھی بیان فرمائی ہے جس میں قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہ العزیز کی وفات حسرت آیات کا ذکر ہے، اور وہ یہ ہے:-

"حضرت محبوب الٰہیؒ نے بیان فرمایا کہ شیخ علی سجزیؒ کی خانقاہ میں محفل سماع تھی، اور شیخ الاسلام قطب العالم حضرت خواجہ قطب الدین بختیار

---

[1] یہ کلام خواجہ احمد جام زندہ پیلؒ کا ہے، اس کا مطلع ہے:-

منزل عشق از مکانے دیگر ست مرد ایں رہ را نشانے دیگر ست

اوشی قدس اللہ سرہ العزیز اس محفل سماع میں شریک تھے، گانے والے نے
جب یہ شعر گایا ؎

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را ہر زماں از غیب جانے دیگر است

تو شیخ الاسلام قطب العالم حضرت خواجہ قطب الدین نور اللہ مرقدہ اس
شعر سے بہت ہی متکیف ہوئے، جب وہاں سے گھر آئے تو متحیر و مدہوش
تھے اور فرماتے تھے یہی گائے جاؤ، گانے والے یہی شعر گاتے رہے، اور آپ
اسی طرح متحیر و مدہوش رہے، البتہ نماز بر وقت پڑھ لیا کرتے تھے، پھر یہی شعر
پڑھواتے، عجب کیفیت ہوتی، چار شبانہ روز یہی کیفیت رہی، پانچویں رات
کو آپ نے وصال فرمایا' (فوائد الفواد ص ۱۴۴)

یہ دو مختلف روایتیں ہیں، جو کیفیات کے اعتبار سے مماثل بھی ہیں، اور ان میں باہم مطابقت
بھی ہے، مگر یہ بدگمانی صحیح نہیں کہ کسی نے عمل تحریف سے فوائد الفواد کی روایت کو فوائد السالکین
میں شامل کر دیا ہے، کیونکہ یہ بدگمانی پیدا ہوتی ہے، یا تو علم مجلسی سے عدم واقفیت سے یا ذہن
کے صلاحیت مطابقت سے عاری ہونے کے باعث یا افتراپردازی کے جذبے کی بدولت،
ورنہ صورت حال روزمرہ کے حالات کے بالکل مطابق ہے

جن صاحبوں کو مجالس سماع میں شریک ہوتے رہنے کا اتفاق ہوا ہے، وہ جانتے ہیں کہ
ایک ہی جگہ کی مختلف مجالس میں بارہا ایک ہی غزل سننے میں آئی ہے جو سامعین کے ذوق کے
مطابق اور پُرکیف ہوتی ہے، اس صورت حال کے پیش نظر یہ ماننا ہوگا کہ قطب الاقطاب
حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہ العزیز کی مبارک طبیعت کو مذکورہ شعر سے
خصوصی مناسبت تھی، دو مجلسوں کا حال ہمارے علم میں ہے، بعض اور مجالس میں بھی اس شعر پر
ایسی ہی کیفیت ہوتی ہوگی، لہٰذا یہ قرین قیاس ہے کہ جب خانقاہ شیخ علی سجزی کی مجلس میں
پہلی بار یہ شعر سنا تو سات شبانہ روز عالم تحیر میں رہے اور متواتر سنتے رہے اور جب دوبارہ

وہیں کی مجلس میں یہ شعر سنا تو چہار شبانہ روز عالم تحیر میں رہے، اور پانچویں شب کو واصل بحق ہوئے[1] اس روایت میں سبق آموز نکتہ یہ ہے کہ یہ حضرات اس درجہ عاملِ شریعت اور نماز کے پابند تھے کہ عالم کیف وتحیر بھی انھیں عمل سے مانع نہ ہوتا تھا، وقت آتے ہی طبیعت خود بخود نماز کی طرف متوجہ ہو جاتی تھی، گویا کہ یہ وصف عین طبیعت بن گیا تھا اسی کی برکت سے تھا، جو کچھ تھا؟ آج اس کا تصور بھی مشکل ہے ؎

تھے تو آباء وہ تمھارے ہی مگر تم کیا ہو   ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو[2]

عملِ شریعت سے بیگانگی کا یہ خمیازہ ہے جو آج ہم بھگت رہے ہیں، آؤ قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہ العزیز کی مبارک زندگی سے سبق لیں۔ اسلام کی قدروں کو اپنائیں، اور عاملِ شریعت بن جائیں، تاکہ ہماری زندگی بھی نورِ ایمان سے تابناک ہو جائے اور بے عملی کی نحوست سے چھٹکارا پالیں، پھر تو سب ہی کچھ اپنا ہے ؎

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں   یہ جہاں چیز ہے کیا لوح وقلم تیرے ہیں[3]

دونوں روایتوں کا اپنا اپنا موقف ہے، اسی طرح انھیں سمجھنا چاہیے، جس طرح علم مجلسی کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے، یہ سمجھنا ہرگز صحیح نہیں کہ یہ روایت فوائد السالکین میں فوائد الفواد سے سرقہ کی گئی ہے ایسا سمجھنا کوتاہ اندیشی کی علامت ہے۔

روایت نمبر ۱۶ | قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہ العزیز نے فرمایا:۔

---

[1] حضرت خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۱۹ھ / ۱۹۰۱ء) فرماتے ہیں:۔
"دس ماہ کی مدت سے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی کی طبیعت پر یہ شعر غالب تھا (کشتگانِ خنجر تسلیم را الخ) اس حد تک کہ سات سات دن تک اس شعر پر آپ کو وجد رہتا تھا، جس مجلس میں اس شعر پر وصال ہوا۔ آپ پر چار دن مسلسل وجد طاری رہا (مقابیس المجالس ص ۳۸۸ شائع کردہ اسلامک بک فاؤنڈیشن لاہور، پاکستان)

[2] [3] جواب شکوہ اقبال

"یہ دعاگو خواجہ بزرگ خواجہ معین الدین حسن سنجری قدس اللہ سرہ العزیز کی خدمت میں حاضر تھا، اور کئی درویش حاضر خدمت تھے، اولیاء اللہ کا ذکر خیر ہو رہا تھا، اتنے میں ایک شخص آیا، قدم بوس ہوا، اور خواجۂ بزرگ سے بیعت ہونے کے لیے درخواست کی، آپ نے اسے بٹھایا اور فرمایا کہ جو میں کہوں وہ تم کروگے، تو میں تمھیں مرید کرلوں گا، اس نے کہا بیشک حکم کی تعمیل کروں گا۔ آپ نے فرمایا تم کلمہ اس طرح پڑھا کرتے ہو لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ، ایک بار اس طرح پڑھو، لا الہ الا اللہ چشتی رسول اللہ اس نے حکم کی تعمیل کی اور کلمہ اسی طرح پڑھ لیا، جس طرح آپ نے بتایا تھا، خواجۂ بزرگ نے اسے بیعت کرلیا، اور نعمت وخلعت سے نوازا، اور فرمایا، میں نے تمھاری عقیدت کا امتحان لینے کے لیے اس طرح کلمہ پڑھوایا تھا، ورنہ کلمہ وہی ہے، جو تم پڑھتے ہو، لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ میں تو خود کمترین بندگان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سے ایک ہوں یکے از کمترین بندگان محمد رسول علیہ السلام، صلی اللہ علیہ وسلم اور فرمایا کہ مرید کو اپنے پیر کی خدمت میں صادق اور راسخ العقیدہ ہی ہونا چاہیے۔"

(فوائد السالکین فارسی ص ۲۳)

یہ روایت بادی النظر میں عجیب سی لگتی ہے، اور ذہن فوری طور پر قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا، مگر یہ روایت خواجہ ابوبکر شبلیؒ متوفی ۳۳۴ھ/۹۴۵ سے منسوب اور فوائد الفواد (ص ۱۳۱، ۲۳۳) اور سیر الاولیا (ص ۳۳۰) اور مفتاح العاشقین (ص ۴) جوامع الکلم (ملفوظ ۸ شعبان ۸۰۲ھ) جیسی نہایت درجہ مستند اور ادب صوفیہ میں بے مثل کتب تصوف میں ملتی ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ ایسا ہی واقعہ خواجۂ بزرگؒ کی خدمت میں پیش آیا ہو، اور انھوں نے خواجہ ابوبکر شبلیؒ کی اتباع میں یہ روش اختیار کی ہو، اور اس کی افتاد طبع کے مطابق

اصلاح کے لیے یہی مناسب ہو ع کار پاکاں را قیاس از خود مگیر

جن کا علم محدود ہے، وہ کچھ بھی کہیں، وہ قابلِ قبول نہیں، خواجہ ابوبکر شبلی "کو اب تک ہزار سال سے زیادہ زمانہ گزر چکا ہے، ان عاملوں نے جو علم وافر رکھتے ہیں، اور رموز تصوف سے آگاہ ہیں، اور لفظ رسول کے لغوی معنی سے اور اس کے صرف محل سے واقف ہیں اور صرف محل سے متعلق امثلہ ان کے ذہن میں مستحضر ہیں انھوں نے اس پر نہ تو کلام کیا ہے، اور نہ کرتے ہیں۔ یہ روایت دراصل اتباع شیخ کی ترجمان ہے، اور اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

روایت نمبر ۷ | حضرت بابا صاحب فرید الملۃ والدین مسعود گنج شکر قدس اللہ سرہٗ العزیز بیان فرماتے ہیں :۔

"خانہ کعبہ کے مسافروں کا ذکر ہو رہا تھا، قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہ العزیز نے فرمایا، اللہ کے خاص بندے اپنے خانہ خراب ہی میں ہوتے ہیں، تو بیت اللہ کو حکم ہوتا ہے، کہ ان کے گرد طواف کرے، آپ یہ فرما ہی رہے تھے کہ آپ اور حاضرین مجلس سب ہی اٹھ کھڑے ہوئے اور عالم تحیر و شوق میں مستغرق ہو گئے اور ایسے مستغرق ہوئے کہ اپنی بھی خبر نہ رہی، دعا گو بھی عالم ذوق و شوق میں کھو گیا، پھر سب ہی اس طرح تکبیر یں کہنے لگے جس طرح طواف کے دوران کہتے ہیں، ہر ایک کے بدن سے تازہ تازہ خون بہنے لگے، جو قطرہ خون زمین پر گرتا نقش تکبیر بن جاتا، جب عالم ہوش میں آئے تو خانہ کعبہ کو روبرو دیکھا، ہم نے اس کا وہی ادب کیا، جو کیا جاتا ہے۔ چار بار اس کا طواف کیا، اور یہ ندائے غیبی سنی کہ اے عزیزو! ہم نے تمھارے حج کو تمھارے طواف کو اور تمھاری نماز کو قبول کیا بلکہ ان کے بھی حج کو طواف کو اور نماز کو قبول کیا، جو تمھارے نقش قدم پر چلتے ہیں اور چلیں گے"

قطب الاقطاب حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہٗ

العزیز نے پھر فرمایا کہ شیخ الاسلام خواجہ معین الدین حسن سجزی قدس اللہ سرہٗ
ہر سال اجمیر سے زیارت خانۂ کعبہ کو جایا کرتے تھے، جب ان کا کام کمالیت کو
پہنچ گیا، تو جو حاجی حج کو جاتے، وہ بتاتے تھے کہ ہم نے خواجہ صاحبؒ کو
طواف کرتے دیکھا تھا، حالانکہ آپ معتکف ہوتے تھے۔

پھر فرمایا کہ خواجہ بزرگؒ ہر شب کو خانۂ کعبہ کی زیارت کے لیے جاتے
تھے، رات بھر وہیں رہتے، اور صبح ہونے سے پہلے ہی آجاتے تھے، اور اپنے
جماعت خانہ میں نماز با جماعت پڑھتے تھے۔

آپ نے یہ بھی فرمایا کہ میں نے یہ حکایت خود خواجہ بزرگ کی زبانی سنی
ہے، اور انھوں نے حضرت شیخ عثمان ہرونی قدس اللہ سرہ العزیز سے سنی
تھی کہ جب حضرت خواجہ قطب الدین مودود چشتی رحمۃ اللہ علیہ کو زیارت خانہ
کعبہ کا اشتیاق دامنگیر ہوتا تو فرشتوں کو حکم ہوتا کہ خانۂ کعبہ کو چشت لے
جائیں اور خواجہ مودود چشتیؒ کے روبرو کردیں، فرشتے حکم کی تعمیل کرتے،
خواجہ موصوف اسے دیکھتے تو طواف کرتے، اور نماز پڑھتے جب فارغ ہوجاتے
تو فرشتے اسے واپس لے جاتے۔" (فوائد السالکین فارسی ص ۱۰-۱۵)

یہ جملہ بیانات اوصاف مشاہدہ، اور رموز طریقت کے جامع ہیں، تاوقتیکہ قلب و
دماغ اعمالِ صالحہ کی صیقل سے متجلی نہ ہوگئے ہوں، اُن کے انعکاس کے متحمل نہیں ہوسکتے،
یہ روحانیت کے ان اعلیٰ وارفع کیفیات کی لمعہ افگنی ہے کہ آلودۂ مادیت ومعصیت اذہان
اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے، ایسی ہی تجلیات کی پرتوافگنی سے فوائد السالکین کا پایۂ اعتبار
ادب صوفیہ میں بلند سے بلند تر ہے، ان میں سے بعض کا ذکر امیر خورد کرمانیؒ نے بھی کیا ہے
لکھتے ہیں:-

خواجہ معین الدین قدس اللہ... می فرمود   خواجہ بزرگ خواجہ معین الدینؒ...

مدتے گرد خانہ کعبہ طواف کردم فاما این زمان خانہ کعبہ گرد من طواف می کند۔ (سیر الاولیا، ص ۴۶)

... فرماتے تھے، میں نے مدتوں خانہ کعبہ کا طواف کیا ہے، اب خانہ کعبہ میرے گرد طواف کرتا ہے۔

امیر خورد کرمانی ؒ نے وہ حکایت بھی نقل کی ہے جو حضرت خواجہ قطب الدین مودود چشتی ؒ کے متعلق فوائد السالکین میں ہے، جس سے یہ حقیقت واضح ہے کہ فوائد السالکین اس باب میں سیر الاولیا کا ماخذ ہے، لکھتے ہیں :-

ہر وقت کہ خواجہ مودود چشتی ؒ را اشتیاق زیارت خانہ کعبہ غالب شدے فرشتگان را حکم شدے تا خانہ کعبہ را می آوردند در نظر خواجہ می داشتند، خواجہ طواف کردے و نمازے کہ آں جا آمدہ است بگزاردے، بعدہ باز خانہ کعبہ را می بردند۔" (سیر الاولیا، ص ۴۲)

جب کبھی خواجہ مودود چشتی ؒ کو خانہ کعبہ کا اشتیاق غالب ہوتا، اور بہت زیادہ ہوتا، تو فرشتوں کو حکم ہوتا تھا کہ وہ خانہ کعبہ کو لے آتے اور خواجہ مودود چشتی ؒ کے سامنے رکھتے تھے، خواجہ موصوف طواف کرتے، اور نماز پڑھتے جو کعبہ میں پڑھی جاتی ہے، اس کے بعد وہ خانہ کعبہ کو لے جاتے،

امیر خورد کرمانی ؒ کے بیانات کی روشنی میں کسی کو فوائد السالکین کے موقر بیانات سے انحراف کی گنجائش نہیں رہتی، امیر خورد کرمانی ؒ نے حضرت محبوب الٰہی ؒ سے متعلق یہ واقعہ بھی نقل کیا ہے :-

عزیزے حکایت کرد کہ از قصبۂ خود بقصد زیارت سلطان المشائخ روان گردیدیم اگر زمین میان

ایک عزیز نے بیان کیا ہے کہ میں اپنے قصبے سے حضرت محبوب الٰہی ؒ سے نیاز حاصل کرنے چلا جب قصبہ مینڈکی

قصبہ بوندی افتاد، در دل گشت
کہ این جا درویشے است کہ اورا
شیخ مومن گویند، باد ملاقات
کنم بر وے رفتم پرسید کجا خواہی رفت
گفتم، بخدمت سلطان المشائخ
گفت، سلطان المشائخ را سلام
من برسانی، و بگوئی ہر شب
جمعہ در کعبہ ملاقات می کنم چوں
من بخدمت سلطان المشائخ پیوستم
عرض داشت کردم در قصبۂ بوندی
درویشے است و این سخن گفتہ
شیخ منغص شدہ فرمود او درویشے
عزیز ست ولیکن زبان خود
بر خود ندارد۔

(سیر الاولیا، ص ۱۴۵، ۱۴۶)

پہنچا تو مجھے یاد آیا کہ یہاں بھی ایک
درویش ہیں جن کا نام شیخ مومن ہے
ان سے بھی ملتا چلوں، جب ان کی
خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے
دریافت کیا کہ تم کہاں جاؤ گے،
میں نے عرض کیا حضرت محبوب الٰہیؒ
کی خدمت میں حاضر ہوں گا، انھوں
نے کہا، ان سے میرا سلام کہنا اور
کہنا کہ میں ہر شب جمعہ کو کعبہ میں
آپ سے نیاز حاصل کرتا ہوں، جب
میں حضرت محبوب الٰہیؒ کی خدمت میں
حاضر ہوا تو میں نے عرض کیا کہ قصبہ بوندی
میں ایک درویش ہیں، انھوں نے سلام
کہا ہے اور یہ بھی کہا ہے ایسا سن کر شیخ
رنجیدہ ہوئے اور فرمایا کہ درویش تو
اچھا ہے مگر زبان قابو میں نہیں ہے۔

اس بیان سے واضح ہے کہ حضرت محبوب الٰہیؒ بھی خواجۂ بزرگ خواجہ معین الدین حسن سجزی قدس اللہ سرہ العزیز کی شکل زیارت خانۂ کعبہ سے مشرف ہوتے رہتے تھے، ایسے ہی واقعات اور بھی ہیں، جن سے واضح ہے کہ سیر الاولیا کا ماخذ فوائد السالکین ہے اس لیے فوائد السالکین کی روایات کو مبالغہ آمیز یا جعلی نہیں کہا جا سکتا، طیر و سیر اولیائے کاملین کا اختصاصی وصف ہے، اس کے باب میں مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے یہ کلیہ بیان

فرمایا ہے:-

چوں روح کامل می شود او را	جب روح کمال کو پہنچ جاتی ہے تو
قوتِ طیران حاصل می شود چہ در	اسے پرواز کی قوت حاصل ہو جاتی
عالمِ علوی، چہ در عالمِ سفلی، و	ہے، خواہ عالمِ سفلی میں پرواز کرے
جوارح نیز چوں متابع قلب شدہ	خواہ عالمِ علوی میں، اعضاء قلب کے
قلب متابع روح پس ہر جا کہ روح	تابع ہوتے ہیں اور قلب روح کے
طیران نماید، قلب و جوارح طیران	تابع ہوتا ہے۔ لہذا جہاں جہاں
نماید ــــــ"	روح پرواز کرتی ہے تو قلب اور
(خیر المجالس ص ۲۴)	اعضا بھی وہیں وہیں پرواز کرتے ہیں۔

یہ فوائد السالکین کی وہ روایتیں ہیں جنھیں کچھ نقادوں نے مبالغہ آمیز خلافِ فطرت اور چشتی بزرگوں کے عقائد و تعلیمات کے خلاف بتا کر فوائد السالکین کو جعلی بتایا ہے، مگر تقابلی مطالعے نے بتا دیا کہ یہ روایتیں اور ان کی مثل روایتیں فوائد الفواد، خیر المجالس، اور سیر الاولیا میں بھی ہیں، جنھیں وہ نہایت درجہ معتبر و مستند اور ادب صوفیہ میں بے مثل مانتے ہیں، لہذا یہ روایتیں فوائد السالکین کے جعلی ہونے کا سبب قرار نہیں پا سکتیں، اور جو شبہات وارد کیے ہیں، وہ بھی تمام تر بے اصل ہیں عدم واقفیت پر مبنی ہیں، اور اگر بالفرض محال یہی روایتیں فوائد السالکین کے جعلی ہونے کا سبب ہیں تو اُن بے مثل اور نہایت درجہ مستند اور معتبر کتابوں کے جعلی ہونے کا سبب کیوں نہیں بنا۔ جن کے اوراق کی زینت یہ روایتیں بھی ہیں۔

۱۴۔ وقت کا تقاضا | وقت کا تقاضا یہ ہے کہ فوائد السالکین کو صحت و مقابلہ سے آراستہ کر کے شائع کیا جائے یہ کام دیر طلب بھی ہے اور زر طلب بھی ہے، مگر کرنے کا ہے اگر اخلاص سے اور لگن سے کیا جائے تو مشکلات بھی سدِ راہ نہ رہیں گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ

عہد حاضر میں فوائد السالکین کے فارسی مطبوعہ نسخے کمیاب ہیں، البتہ غلط تراجم دستیاب ہو جاتے ہیں، جو ہرگز لائق اعتنا نہیں، وقت کا تقاضہ یہ بھی ہے کہ ہند و پاک کی صوبائی زبانوں میں اس کے بہترین تراجم شائع کیے جائیں، ان ہی مقاصد کے پیش نظر میں نے ہندوستان کے مشہور کتب خانوں (لائبریریوں) سے فوائد السالکین کے قدیم قلمی نسخوں کے متعلق جو معلومات فراہم کی ہیں، وہ پیش کرتا ہوں، ممکن ہے خدائے پاک کسی کو توفیق عنایت فرمائے اور وہ اس خدمت کو سرانجام دے، میرے لائق جو خدمت ہوگی اس سے مجھے بھی اجتناب نہ ہوگا۔ انشاء اللہ تعالیٰ

۱۳- فوائد السالکین کے قدیم قلمی نسخے

(۱) خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں دو نسخے ہیں، ایک سنہ ۱۰۹۶ھ / ۱۶۸۴ء کا مکتوبہ ہے، اور دوسرا بارہویں صدی ہجری کا ہے، یعنی گیارہ سو کچھ کا ہے۔

(۲) آندھرا پردیش گورنمنٹ اورینٹل مینوسکرپٹس لائبریری اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد میں دو نسخے ہیں ایک سنہ ۱۰۹۶ھ / ۱۶۸۴ء کا مکتوبہ ہے اور دوسرا سنہ ۱۲۳۰ھ / ۱۸۱۴ء کا۔

(۳) ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کلکتہ میں ایک نسخہ ہے جو سنہ ۱۱۲۰ھ / ۱۷۰۸ء کا مکتوبہ ہے۔

(۴) سالار جنگ میوزیم حیدرآباد میں ایک نسخہ ہے جو سنہ ۱۱۳۵ھ / ۱۸۱۹ء کا مکتوبہ ہے۔

(۵) رضا لائبریری رامپور میں تین نسخے ہیں، جن میں سنہ کتابت نہیں ہے۔

(۶) عربی فارسی انسٹی ٹیوٹ ٹونک (راجستھان) میں ایک نسخہ ہے، جس میں سنہ کتابت نہیں ہے۔

(۷) مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تین نسخے ہیں۔ ان میں سے ایک سنہ ۱۲۷۶ھ / ۱۸۵۹ء کا مکتوبہ ہے۔

(۸) دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ میں ایک نسخہ ہے، جس میں سنہ کتابت نہیں ہے۔

(۹) درگاہ شاہ پیر محمدؒ احمد آباد گجرات کے کتب خانے میں تین نسخے ہیں ان میں سے ایک سنہ ۱۰۸۰ھ / ۱۶۶۹ء کا مکتوبہ ہے دوسرا سنہ ۱۲۷۰ھ / ۱۸۵۴ء کا اور تیسرے پر سن کتابت نہیں ہے۔

اگر کوشش کی جائے تو ممکن ہے کہ ان سے بھی قدیم بعض نسخوں کا پتہ نشان مل جائے، بعض قدیم قلمی نسخے پنجاب یونیورسٹی لاہور (پاکستان) میں بھی ہیں، ابھی مجھے ان کے متعلق مفصل معلومات فراہم نہیں ہو سکی ہیں، میری یہ بھی درخواست ہے کہ اگر کسی صاحب کے علم میں یا تحویل میں فوائد السالکین کا کوئی قلمی نسخہ ہے تو مجھے مطلع فرما کر ممنون فرمائیں، میں ان کا شکر گزار ہوں گا۔

(بشکریۂ "معارف" اعظم گڑھ، مارچ۔اپریل سنہ ۱۹۸۰ء)

خوشخبری

سید والا تبار سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب مدظلہ، مدیر معارف اعظم گڑھ کے ارشاد و حکم سے راقم فوائد السالکین کو صحت و مقابلہ سے مزین کر کے ترجمہ سمیت شائع کرنے کی طرف متوجہ ہے۔ کچھ قلمی نسخوں کے عکس و فلم آچکے ہیں کچھ کے آنے والے ہیں۔ کام کیا جا رہا ہے۔ تکمیل کے بعد ان شاء اللہ اشاعت کے اسباب بھی مہیا ہو جائیں گے۔

—— اخلاق حسین دہلوی

اسرار الاولیا کا مطالعہ

۱۔ تعارف: اسرار الاولیا (فارسی نسخہ) مطبوعہ ۱۳۳۳ھ/۱۹۱۵ء (بار ششم) مطبوعہ نول کشور کانپور حجم ۱۴۹ صفحات سائز ۲۲×۱۸/۸ مسطرہ ۲۰ سطری قلم خفی اس کتاب میں حضرت بابا صاحبؒ کے ملفوظات ہیں جو بائیس (۲۲) فصلوں پر مشتمل ہیں، ہر فصل کا عنوان جداگانہ ہے، اس کے جامع مولانا بدرالدین اسحاقؒ ہیں، جو حضرت بابا صاحبؒ کے خلیفہ و داماد اور حضرت بابا صاحبؒ کی خدمت میں ہمہ وقت کے حاضر باش تھے۔

۲۔ اسرار الاولیا کی قدامت: عہد مغلیہ کے شہرۂ آفاق عالم، محدث اور مسلم الثبوت اہل قلم شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ (متوفی ۱۰۵۱ھ/۱۶۴۱ء) مولانا بدرالدین اسحاقؒ کے احوال میں لکھتے ہیں:

و وے را رسالہ ایست مسمّٰی اسرار الاولیا	ان کا ایک رسالہ ہے جس کا نام
کہ در وے ملفوظات گنجشکر را جمع کردہ	اسرار الاولیا ہے جس میں انھوں نے
در علم تصریف کتابے نظم کردہ است۔	حضرت بابا صاحبؒ کے ملفوظات جمع
(اخبار الاخیار مجتبائی ص ۶۷)	کیے ہیں، علم صرف میں ایک کتاب نظم کی ہے۔

مفتی غلام سرور لاہوری مرحوم نے مولانا بدرالدین اسحاقؒ کے ذکر میں لکھا ہے:

۱؎ انوار الفریدیہ ص ۱۴۱ مطبوعہ پاکستان میں لکھا ہے کہ دینی مدارس میں جو کتابیں نصاب میں داخل تھیں ان میں سے کئی کتابیں حضرت مولانا کی تصنیف تھیں، یہ بیان خلاف تحقیق غلط بلکہ افترا ہے — مولانا موصوف سے منسوب صرف دو ہی کتابیں ہیں جن کا ذکر قدما کی کتابوں میں ملتا ہے۔ (۱) اسرار الاولیا (۲) علم صرف میں منظوم رسالہ اور ان میں سے کسی کا نصاب تعلیم میں داخل ہونا ثابت نہیں۔ ۱۲

کتاب اسرارالاولیا از تصنیف وے است۔	کتاب اسرارالاولیا، اُن (مولانا بدرالدین
(خزینۃ الاصفیاء جلد اص ۲۹۰)	اسحاقؒ) کی تصنیف سے ہے۔

مفتی غلام سرور لاہوری مرحوم نے امیر خورد کرمانیؒ کے ذکر میں یہ بھی لکھا ہے :-

دریں خاندان دو کتاب بنام سیرالاولیا	اس خاندان میں سیرالاولیاء نام سے
معروف و مشہور است یکے تالیف	دو کتابیں معروف و مشہور ہیں ایک
مولانا بدرالدین اسحاقؒ کہ از ملفوظات	مولانا بدرالدین اسحاقؒ کی تالیف ہے،
خواجہ فریدالحق والدینؒ جمع آوردہ است	جس میں حضرت بابا صاحبؒ کے ملفوظات
دوم سیرالاولیاء تالیف سید محمد بن	جمع کیے ہیں دوسری سیرالاولیاء سید محمد بن
مبارک کرمانی رحمۃ اللہ علیہ	مبارک کرمانی رحمۃ اللہ علیہ کی تالیف ہے۔

(خزینۃ الاصفیاء جلد ا ص ۲۷۶ نولکشوری)

مفتی غلام سرور لاہوری مرحوم کے بیان سے معلومات میں یہ اضافہ ہوتا ہے کہ سیرالاولیاء نامی کوئی کتاب مولانا بدرالدین اسحاقؒ کی تالیف بھی ہے، جو حضرت بابا صاحبؒ کے ملفوظات پر مشتمل ہے۔ جو اس اسرارالاولیاء کے علاوہ ہے۔ جس کا ذکر انھوں نے مولانا بدرالدین اسحاقؒ کے احوال میں کیا ہے، مگر نہ تو مفتی غلام سرور لاہوری مرحوم ہی نے متذکرہ سیرالاولیا کا ذکر مولانا بدرالدین اسحاقؒ کے احوال میں کیا ہے، اور نہ کسی اور نے۔ ممکن ہے کہ مغالطہ میں ہوا ہو، یہ کتاب سیرالاولیا تالیف مولانا بدرالدین اسحاقؒ ہمارے مطالعے میں بھی نہیں آئی، اس لیے ہم اس کے متعلق اظہار خیال سے معذور ہیں۔

کتاب شمائل الاتقیاء و دلائل الاتقیاء، تالیف مولانا رکن الدین عماد دبیر کاشانیؒ کی فہرست ماخذات میں اسرارالمتحیرین نامی ایک کتاب ہے، جو حضرت بابا صاحبؒ ہی کے ملفوظات پر مشتمل ہے، جو نایاب ہے، مولف کا نام بھی نہیں لکھا ہے، ممکن ہے متذکرہ سیرالاولیاء سے مراد یہی کتاب ہو، تاہم فی الحال وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

حضرت غلام فرید چشتیؒ (المتوفی ۱۳۱۹ھ / 1901ء) جو عہد ماضی قریب کے ممتاز ترین مشائخ میں

تھے، جن کی عالمانہ اور درویشانہ شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے، ان کے ملفوظات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ علوم و فنون سے انھیں کمال آگاہی تھی، وہ فرماتے ہیں :-

" بدرالدین اسحاق قدس اللہ سرہ جو اسرار الاولیا کے جامع ہیں، ان کا ضبط تاریخ و الفاظ اس قدر ریختہ ہیں کہ جو کچھ الملفوظ شیخ شیوخؒ کی زبان درفشاں سے سنا اسی طرح لکھ دیا، اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔" (مقابیس المجالس ص ۶۵ ترجمہ)

متاخرین میں یہ ان جلیل القدر بزرگ کا بیان ہے، جو علم و فضل اور بصیرت باطنی سے مالامال تھے۔ اس بیان سے یہ مترشح ہے کہ موصوف کے زیر مطالعہ اسرار الاولیا کا کوئی مستند و معتبر نسخہ تھا جس کی صحت پر انھیں کامل بھروسہ تھا، شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کا بیان نقل کیا جا چکا ہے۔ وہ نہایت درجہ ثقہ اور باکمال بزرگ تھے، یقیناً ان کے پیش نظر بھی اسرار الاولیا کا کوئی قدیم و مستند نسخہ تھا، ممکن ہے کہ وہ قدامت کے جملہ اوصاف سے متصف ہو، تاہم شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ جیسے باکمال بزرگ سے متعلق اس بدگمانی کی ذرا بھی گنجائش نہیں ہے کہ وہ کسی ایسے نسخے کو مولانا بدرالدین اسحاقؒ سے منسوب فرماتے جو اصول تصوف اور تعلیمات اسلامی کے خلاف مضامین پر مشتمل ہوتا، وہ اصول تصوف سے بھی بہرہ کامل رکھتے تھے، اور تعلیمات اسلامی سے بھی اگر کم علمی اور بد احتیاطی کا شائبہ بھی پاتے تو بلا شبہ ان کی حق گوئی ہرگز اس کے اظہار میں تامل نہ کرتی۔

سات سو برس سے زیادہ زمانہ گزر چکا ہے ہزار ہا علما، مشائخ اور صوفیائے کرام گزرے ہیں، ان بزرگوں کے جو ملفوظات دستیاب ہوتے ہیں، ان سے واضح ہے کہ ان حضرات نے بھی اسرار الاولیا سے استفادہ کیا ہے، اور روگردانی نہیں فرمائی ہے، یہ بھی ہے کہ دستیاب شدہ کتب ملفوظات میں قدامت کے اعتبار سے جو فوقیت نسخہ اسرار الاولیا کو حاصل ہے وہ کسی اور کو

ـــہ مقابیس المجالس ص ۲۶۴ (ترجمہ) میں اسرار الاولیا اور راحت القلوب دونوں ہی کا ذکر ہے۔ اس کے حاشیے میں مترجم نے خواجہ موصوف کے مقابلے میں خیر المجالس اور جوامع الکلم کی بے صرفہ اور الحاقی عبارتیں نقل کر کے حضرت خواجہ غلام فریدؒ کے مبارک بیان کی نامعقول تردید کی ہے، جو نہایت درجہ غلط اور شرمناک ہے۔ ۱۲

حاصل نہیں، کتبِ ملفوظات کے جو قدیم ترین نسخے ہندوستان کے مشہور و معتبر کتب خانوں (لائبریریوں) میں محفوظ ہیں، ان میں سے قدیم نسخہ اسرار الاولیاء ہی کا ہے، جو ۱۰۰۸ھ (دس سو آٹھ ہجری) کا مکتوبہ ہے اور جو مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (انڈیا) کے ذخیرۂ مخطوطات کی زینت ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ہر اعتبار سے اسرار الاولیا کا قدیم و مستند ہونا اور مولانا بدر الدین اسحاقؒ کی تالیف ہونا ثابت ہے، حتیٰ کہ داخلی شواہد سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، البتہ عصری حالات کی اثر اندازی سے اور الحاق و تحریف سے مبرا ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس سے کسی قلمی کاوش کو مفر نہیں ہے، لہٰذا ضرورت ہے کہ صحت و مقابلہ سے آراستہ کر کے اسرار الاولیا کو منظرِ عام پر لایا جائے تاکہ مقتدرین معاشرہ کو اور دینی و اخلاقی اور صوفیانہ قدروں کو از سرِ نو رواج عام نصیب ہو اور طالبانِ حق کی تشنگی رفع ہو۔

۳۔ جوامع الکلم کا بیان خواجہ سید محمد حسینی گیسو دراز بندہ نوازؒ مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے خلفا میں نامور شخصیت گزرے ہیں، ان کے سوانح حیات سے واضح ہے کہ وہ مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ کی وفات ۷۵۷ھ (1356) کے بعد عتبات عالیات کی زیارت کرتے ہوئے دکن تشریف لے گئے تھے، گلبرگہ میں قیام فرما ہوئے اور وہیں ۸۲۵ھ (1421) میں انتقال ہوا، مزار پر انوار گلبرگہ ہی میں ہے اور مرجع خلائق ہے۔

اس سفر کے دوران خواجہ گیسو دراز بندہ نوازؒ حضرت بابا صاحبؒ کے مزار پُر انوار کی زیارت کو گئے تھے، جوامع الکلم کی ایک ژولیدہ عبارت یہ بتاتی ہے کہ قیام اجودھن (پاک پٹن) میں انھوں نے ایک مجموعۂ ملفوظات دیکھا تھا جسے بعض مولانا بدر الدین اسحاقؒ کا مرتبہ بتاتے تھے، اور بعض کو اس سے انکار تھا، جوامع الکلم کی مشمولہ عبارت یہ ہے:-

ملفوظے از آں شیخ فرید الدین در اجودھن	میں نے اجودھن میں شیخ فرید الدین
دیدم کہ آں را نسبت بہ مولانا بدر الدین	کا ایک ملفوظ دیکھا ہے، جسے مولانا بدر الدین
اسحاقؒ می کنند سر بسر ہمہ افترا است،	اسحاقؒ کے نام سے منسوب کرتے ہیں

می گویند کہ جمع کردہ مولانا بدرالدین	وہ تمام تر بہتان ہے، کہتے ہیں کہ مولانا
اسحاق نیست۔	بدرالدین اسحاقؒ کا جمع کیا ہوا
(جوامع الکلم ص ۱۳۴ ملفوظ ۲ رمضان ۸۰۲ھ)	نہیں ہے۔

اس بیان کا اسلوب حضرت خواجہ گیسو درازؒ کے دیگر بیانات سے مختلف، مشتبہ، مذبذب اور مبہم ہے، یہ نہیں کھلتا کہ سربسر ہمہ افترا کس سے متعلق ہے، ملفوظے سے متعلق ہے یا نسبت سے، اگر دونوں ہی سے ہے تو پھر می گویند جمع کردہ مولانا بدرالدین نیست کیا ہے؟ ماننا ہوگا کہ حشو ہے جس سے ابتدائی جملوں کا مفہوم مشتبہ اور مبہم ہوگیا ہے، اور یہ اسقام بتاتے ہیں کہ یہ جملے حضرت خواجہ گیسو درازؒ جیسے باکمال انشاپرداز کے نہیں ہو سکتے بلکہ کسی ایسے شخص کے نوشتہ ہیں جو انشا میں کامل دسترس نہیں رکھتا تھا، یہی کیفیت ان عبارتوں کی ہے جو سیر الاولیاء[1] اور خیر المجالس[2] میں الحاق کی گئی ہیں اور ایسے ہی اسقام سے الحاقی عبارتیں گرفت میں آتی ہیں، البتہ ذوقِ سلیم نظر دوربین اور ادب و انشا میں دسترس درکار ہوتی ہے۔

بہرحال اس مبہم و مشتبہ عبارت سے جو نکات برآمد ہوتے ہیں وہ یہ ہیں:—

(۱) ایک صدی کے اندر ہی اندر مولانا بدرالدین اسحاقؒ کے تالیف کردہ مجموعۂ ملفوظات کا ذکر مل جاتا ہے، اور یہ پتہ چلتا ہے کہ اس عہد کے خواندہ حضرات اس سے باخبر تھے کہ مولانا بدرالدین اسحاقؒ کا مرتبہ مجموعۂ ملفوظات بھی ہے۔ تاہم بقول غالب ؎

گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے بایں ہمہ　　ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

پھر خواہ اسرار الاولیاء کا صحیح نسخہ دستیاب ہو سکا تھا یا نہیں مگر اس کے وجود کی نشان دہی ہوتی ہے، جس سے معقولیت کے ساتھ انکار نہیں کیا جاسکتا۔

(۲) اس بیان سے یہ بھی علم میں آتا ہے کہ اجودھن (پاکپتن) میں مختلف الخیال دو گروہ تھے ایک اس کا قائل تھا کہ مولانا بدرالدین اسحاقؒ نے حضرت بابا صاحبؒ کا مجموعۂ ملفوظات تالیف کیا تھا، جو بقول مسخ شدہ صورت میں دستیاب ہو سکا تھا۔ دوسرا گروہ منکر تھا، جو

[1] سیر الاولیاء ص ۹۱ — [2] خیر المجالس ص ۵۲

کہنا تھا کہ جمع کردہ مولانا بدرالدین اسحاقؒ نیست یعنی متذکرہ مسخ شدہ نسخہ ملفوظات مولانا بدرالدین اسحاقؒ کا جمع کردہ نہیں ہے مگر اس سے انکار نہیں کہ انھوں حضرت باباصاحبؒ کے ملفوظات کا مجموعہ تالیف فرمایا تھا۔

(۳) امیر خورد کرمانیؒ کے بیان سے بھی یہ ثابت ہے کہ اجودھن (پاکپتن) میں ایک گروہ ایسا تھا جو مولانا بدرالدین اسحاقؒ سے عناد رکھتا تھا، اسی کی سازش سے شیخ بدرالدین سلیمانؒ اور مولانا بدرالدین اسحاقؒ کے درمیان کشیدگی ہوئی تھی اور مولانا بدرالدین اسحاقؒ نے جامع اجودھن میں سکونت اختیار کر لی تھی۔

شیخ بدرالدین سلیمانؒ حضرت باباصاحبؒ کے منجھلے صاحبزادے تھے، جو بھائیوں کے ایما سے اور بعض عقیدتمندوں کے مشورے سے حضرت باباصاحبؒ کے سجادہ نشین بنے تھے، مولانا بدرالدین اسحاقؒ ان کی خدمت بھی اسی طرح کرتے تھے جس طرح حضرت باباصاحبؒ کی کیا کرتے تھے، مگر حاسدوں کا وہ گروہ جو منصب خادمی یا بالفاظ دیگر قرب شیخ کا طالب تھا وہی مولانا بدرالدین اسحاقؒ کا مخالف تھا، اور اسی کی سازش سے ان بزرگوں کے درمیان اختلاف کی خلیج حائل ہوئی تھی، امیر خورد کرمانیؒ لکھتے ہیں:۔

حاسدان میان شیخ بدرالدین سلیمانؒ	حاسدوں نے شیخ بدرالدین سلیمانؒ
درمیان خدمت مولانا بدرالدین اسحاقؒ	اور مولانا بدرالدین اسحاقؒ کے درمیان
القائے عداوت کردند و خواستند کہ	کشیدگی کرادی تھی اور وہ یہ چاہتے تھے
منصب خادمی خود فرا گیرند خاطر مبارک	کہ خادمی (قرب شیخ) کا منصب وہ حاصل
خدمت مولانا بدرالدین اسحاقؒ بدیں	کرلیں۔ مولانا بدرالدین اسحاقؒ کی
سبب منغص شد ... خدمت مولانا	مبارک طبیعت ان حالات سے مکدر ہوئی
... در مسجد جمعہ آمد و بنشست۔	لہذا مولانا بدرالدین اسحاقؒ نے کنارہ
(سیر الاولیاء ص ۱۷۱ ج)	کشی اختیار کی اور جامع مسجد میں اقامت
	اختیار کر لی۔

اس کشیدگی کی تلخی مولانا بدرالدین اسحاقؒ کی وفات کے بعد بھی برقرار رہی محسوس ہوتی ہے کہ ناسازگار حالات سے مجبور ہو کر مولانا بدرالدین اسحاقؒ کی بیوہ جو حضرت باباصاحبؒ کی چھوٹی صاحبزادی تھیں گھربار چھوڑ کر دونوں یتیم بچوں سمیت دلّی چلی آئی تھیں، اور تاحیات وہ دلّی ہی میں رہیں، اور حضرت محبوب الٰہیؒ کی کفالت میں رہیں، اور ان کے بعد ان کے دونوں بچوں نے حضرت محبوب الٰہیؒ کی سرپرستی میں پرورش پائی اور پروان چڑھے، بلاشبہ محبوب الٰہیؒ حضرت باباصاحبؒ کے اصلی جانشین تھے، مگر فردِ خاندان یا محرم نہیں تھے، اس سے شدید کشیدگی اور کیا ہوگی کہ اللہ والوں میں صلہ رحمی کا فقدان نظر آنے لگے مع

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

(۴) قیام اجودھن (پاکپتن) میں جس مجموعۂ ملفوظات کا دیکھنا بتایا گیا ہے (ملفوظ ۲ از شیخ فریدالدینؒ) اس کے متعلق یہ بتانا تھا کہ نام اس کا کیا تھا، وہ نسخہ اسرار الاولیاء تھا یا کوئی اور مجموعہ تھا، کتنا حجم تھا، کب کا مکتوبہ تھا اور اس میں جو ملفوظ تھے، جنھیں حضرت باباصاحبؒ سے منسوب بتایا تھا وہ کیا تھے، کیسے تھے اور کیوں سرِبسر ہمہ افترا کی مد میں آتے تھے، خواہ وہ بے سروپا حکایات کا مجموعہ ہی سہی تاہم یہ بتانا ضروری تھا کہ وہ تھے کیا؟ جنھیں سربسر افترا کہا گیا ہے۔ مع دعویٰ بلا دلیل قبول خرد نہیں

یہ بھی حیرت انگیز ہے کہ اجودھن (پاکپتن) ہی میں ایسا مجموعہ ملفوظات حضرت باباصاحبؒ سے منسوب دکھانے کی جسارت کی جائے جو سربسر ہمہ افترا کی مد میں داخل ہو، جہاں حضرت باباصاحبؒ کی تعلیمات سے سبھی متاثر تھے، وہ کون ہو سکتا ہے جو ایسا انکار رفتہ مجموعۂ ملفوظات دکھا سکتا تھا۔

الغرض یہ بیان نہایت درجہ مبہم اور بغایت از کار رفتہ ہے۔ اس میں حضرت باباصاحبؒ کو ایک عامی کی شکل یاد کیا گیا ہے (ملفوظ ۱ از شیخ فریدالدینؒ) جو نظرِ عقیدت میں درست نہیں ہے، حضرت خواجہ گیسو درازؒ کے شیخ محترم مخدوم نصیرالدین چراغ دہلیؒ

تک نے بھی کبھی اس طرح یاد نہیں فرمایا ہے۔ ان کی مبارک زبان پر جب حضرت باباصاحبؒ کا نام نامی آیا ہے کمال ادب واحترام سے آیا ہے جو مشرقی تہذیب کا خاصہ ہے۔ آیندہ کا نقاد بتائے گا کہ یہ چیستان ہے کیا اور اس بیان کا ادب وانشا میں کیا مقام ہے، صدیاں گزر گئیں، اہل علم میں سے کوئی بھی اس عبارت سے متاثر نہیں، نہ اس کے سہارے کسی نے اسرار الاولیا کو ناقابل اعتبار قرار دیا ہے بلکہ معترف ہیں کہ ضبط الفاظ اس قدر ریختہ ہے کہ بعینہٖ حضرت باباصاحبؒ کا بیان معلوم ہوتا ہے۔ البتہ چودھویں صدی کے ربع آخر میں ایسے اشخاص وجود میں آئے جو ادب وانشا کی نزاکتوں سے ناآشنا ہیں۔ وہ اس عبارت کے سہارے اسرار الاولیا کو جعلی بتانے لگے ہیں۔

(۵) جس نسخہ ملفوظات کا ذکر متذکرہ عبارت میں ہے، اور جسے سرِبسر ہمہ افترا کی مد میں بتایا ہے وہ کیا تھا، اس کا آج بھی کسی کو علم نہیں ہے، مگر اسرار الاولیا کے دستیاب ہونے والے نسخے پر آج بھی سربسر ہمہ افترا کا اطلاق نہیں ہوتا، کیونکہ اسرار الاولیا کا متداول نسخہ اصولِ شریعت وطریقت کے بالکل مطابق ہے اور صحیفہ رشد وہدایت ہے، اور اس کی روایات پر جو اعتراضات کیے ہیں وہ سطحی اور ازکار رفتہ ہیں۔

متذکرہ بیان جسے خواجہ گیسو درازؒ سے منسوب کیا گیا ہے، اور جو فی الواقع ان کا نہیں ہے، اور جو نہایت درجہ مبہم، مشتبہ اور مذبذب ہے اور جس سے صحیح نقطۂ نظر واضح نہیں ہوتا، ہرگز قابلِ قبول نہیں ہے بلکہ اس کو حضرت خواجہ گیسو درازؒ سے منسوب بتانا کھلا افترا ہے۔ جب کبھی کوئی صاحب کمال جوامع الکلم پر لکھے گا تو پوست کندہ کیفیت سامنے آجائے گی۔

جوامع الکلم حضرت خواجہ گیسو درازؒ کا مجموعہ ملفوظات ہے جسے ان کے صاحبزادے سید محمد اکبر حسینیؒ نے مرتب فرمایا تھا، جو تمام تر دس ماہ کا مجموعۂ ملفوظات ہے[۱] (۱۸ رجب ۸۰۲ھ (1399) تا ۲۲ ربیع الثانی ۸۰۳ھ (1400)) اس پر یہ اعتراض بھی ہے کہ اس کے بعض بیانات سے

۱؎ مقابیس المجالس ۳۶۴-۳۶۵ ترجمہ

یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ گیسو درازؒ مائل بہ شیعیت تھے[1]، حالانکہ اس خیال کی تردید[2] جوامع الکلم کے دیگر بیانات سے ہو جاتی ہے، لیکن یہ واقعہ ہے اور افسوس ناک واقعہ ہے کہ جوامع الکلم میں متعدد ایسی روایتیں ہیں کہ شرم و حیا سے آج بھی کوئی مہذب باپ اپنے بیٹے کے سامنے بیان نہیں کر سکتا، کتنی ہی ایسی روایتیں ہیں جن سے بمشکل ہی کوئی اچھا نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے، کتنی ایسی ہیں جن سے متابین اور نکوکار اشخاص کی شخصیت مجروح نظر آتی ہے حتیٰ کہ خواجہ اقبالؒ تک بددیانتی سے ملوث نظر آتے ہیں، جو بچپن سے بڑھاپے تک محبوب الٰہیؒ کی خدمت میں رہے تھے، اور خادم خاص کے منصب پر فائز تھے۔ اس کے علاوہ حضرت محبوب الٰہیؒ کی ذات گرامی بھی ملوث دکھائی دیتی ہے[3]، یہ کیا ہے؟ اگر الحاق و تصرف نہیں ہے، اسی طرح ملفوظات کے متعلق بھی جو کچھ ہے وہ بھی الحاق و تصرف ہی ہے۔ اور وہ حضرت خواجہ گیسو درازؒ کا بیان نہیں ہے۔

۴۔ تاریخی اندراج: کتب دینیات ہوں یا کتب تصوف، ان میں تاریخی اندراج کی نہ کچھ اہمیت تھی اور نہ عہد قدیم میں اس کا رواج و اہتمام تھا، چنانچہ متعدد کتابیں اس وصف سے معرا ملتی ہیں، غالباً اسرار الاولیاء پہلا مجموعۂ ملفوظات ہے جس کے آغاز میں ایک تاریخی اندراج ہے جو غلط اور مجروح ہے۔ غلطی کا سبب کاتبوں اور ناقلوں کا سہو بھی ہو سکتا ہے، ورنہ تحریف و الحاق کرنے والوں کی کارستانی ہے۔

[1] مجلس منعقدہ ۵ رمضان ۸۰۳ھ مجلس منعقدہ ۱۰ رمضان ۸۰۳ھ جوامع الکلم مطبوعہ کانپور ۱۳۵۶ھ۔

[2] آغاز ہی میں ہے، "افضل صحابہ ابوبکرؓ ثم عمرؓ ثم عثمانؓ، ثم علیؓ"

[3] جوامع الکلم مجلس منعقدہ رجب ۸-۲۸ شعبان ۹-۱۲-۱۹-۲۴-۲۵-۲۶، ۲۸، ۳۰، رمضان ۱، ۳، ۵، ۱۲، ۲۴-۲ شوال ۳۰۰۰۰ [4] اس مضمون کے تحریر کے دوران اتفاق سے گلبرگہ شریف کے معزز صحافی عبدالحکیم صاحب شاکر (مدیر روزنامہ اخبار "سلامتی" گلبرگہ شریف کرناٹک) ملاقات کو تشریف لائے دوران گفتگو میں جوامع الکلم کا ذکر آیا تو انھوں نے بتایا کہ جب کتاب جوامع الکلم گلبرگہ شریف سے شائع ہوئی تو ہنگامہ ہوا اور اس کے خلاف بہت کچھ کہا گیا، اور یہ نقطۂ نظر پایا کہ زمانۂ قدیم میں شیعہ حکومت کے زمانے میں گلبرگہ شریف پر متعین کسی شیعہ صوبہ دار کے ایما سے یہ الحاق و تصرف عمل میں آیا تھا اور فحش و مکروہ بیانات شامل کیے گئے تھے۔ یہ حرکت کسی شیعہ کی ہو یا کسی سنی کی مگر حضرت خواجہ گیسو درازؒ کی ذات گرامی اس لغو بیانی سے مبرا ہے۔ (اخلاقی)

نقاد ہو یا محقق یا سوانح نگار تاریخی اندراجات سے کام لینے سے پہلے اس کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ تاریخی اندراجات کو خوب اچھی طرح کسوٹی پر کس لے۔ اگر صحیح ہیں تو فہو المراد ورنہ ان کو بے تکلف مسترد قرار دے اور تحقیق سے صحیح تاریخ تعین کی کوشش کرے اور ہرگز غلط تاریخی اندراج کو محور نہ بنائے ورنہ کیا دھرا سب اکارت جائے گا۔ سنین کے اندراجات میں اکثر غلطیاں ہوئی ہیں خواہ نقل و کتابت ہی اس کا سبب ہو، تاریخ فرشتہ نہایت متداول تاریخی کتاب ہے مگر تاریخی غلطیوں سے مبرا نہیں، طبقات ناصری اور تاریخ فیروز شاہی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں، مگر آج تک کسی دانشور نے غلط تاریخی اندراج کو صحیح اور معتبر قرار دے کر محور نہیں بنایا ہے، اور مندرجات کو غلط قرار نہیں دیا ہے یہ انسانی لغزش ہے، اسے نظر انداز کرنا ہی ہوتا ہے۔

اسرار الاولیا کی پہلی فصل کے آغاز میں ایک تاریخی اندراج ہے جو غلط ہے بلکہ محرف ہے اس کے علاوہ اس میں اور کہیں کوئی تاریخی اندراج نہیں ہے، وہ غلط اندراج یہ ہے بس

"دوشنبہ ہژدہم شعبان سنہ ۶۳۱ھ 1233 احدی و ثلثین و ستمائیہ" (اسرار الاولیا ص ۲)

یعنی پیر کا دن، شب برات کے مہینے کی اٹھارہویں تاریخ ۶۳۱ھ 1233۔ اس تاریخی اندراج کو تقویم کی کسوٹی پر کس کر دیکھنا چاہیے کہ صحیح ہے یا نہیں، اگر صحیح ہے تو فہو المراد ہے اگر غلط ہے تو داخلی شواہد سے کام لے کر صحیح تاریخی اندراج کے استقرار کی کوشش کرنی چاہیے۔

تقویم بتاتی ہے کہ ۱۸ شعبان ۶۳۱ھ 1233 کو دوشنبہ نہیں جمعہ ہے، تقویم میں ایک دن کا فرق تو ہو سکتا ہے، مگر بالعموم اس سے زیادہ نہیں ہوتا[1]، تقویم کے اعتبار سے ۲۹ کو چاند نظر آ سکتا تھا، مگر کہیں مطلع صاف تھا اور کہیں نہ تھا، لہٰذا کہیں چاند نظر آیا اور کہیں نظر نہیں آیا۔ جہاں نظر آ گیا وہاں تقویم سے مطابقت برقرار رہی اور جہاں نظر نہیں آیا وہاں ایک دن کا فرق پڑ گیا، ان ہی وجوہ کی بنا پر دو مختلف مقامات پر بعض اوقات دو مختلف دنوں میں

[1] مرزا غالب لکھتے ہیں کہ آج بحساب جنتری کے ۲۷ اور از روئے رویت ۲۶ رجب کی ہے (اردوئے معلیٰ خط بنام نواب میر ابراہیم علی خاں بہادر) گویا کہ یہ صورت حال کثیر الوقوع ہے۔

عیدالفطر منائی جاتی رہی ہے اگر مذکورہ بیان میں دن تاریخ اور مہینے کو صحیح مان لیا جائے جو صحیح بھی ہے تو داخلی شواہد بتاتے ہیں کہ ۶۳۱ھ (1233) غلط ہے، ۶۵۴ھ (1256) ہونا چاہیے جو کاتب و ناقل سے سہو کی بنا پر یا تحریفی کارستانی کی بدولت غلط کر دیا گیا ہے یہ بھی ہے کہ اسرار الاولیا کے مطبوعہ نسخے میں نقل و کتابت کی بکثرت غلطیاں ہیں، جن کی نشاندہی بآسانی کی جاسکتی ہے، حیرت ہے کہ مطبع نولکشور کانپور سے نسخہ اسرار الاولیا اس قدر غلط کیسے شائع ہو گیا ہے۔

داخلی شواہد | داخلی شواہد سے کام لیا جائے تو یہ حقیقت مخفی نہیں رہتی کہ اسرار الاولیاء کی تدوین و تالیف کا تعلق کس عہد سے ہے، داخلی شواہد میں سے بعض شواہد یہ ہیں:-

(۱) امیر خورد کرمانی رح کا بیان ہے دیگر تذکرہ نویس بھی اس سے متفق ہیں کہ مولانا بدرالدین اسحاق رح جب دہلی سے بخارا کے لیے روانہ ہوئے اور اجودھن (پاکپتن) پہنچے تو انھوں نے حضرت بابا صاحب رح کی خدمت میں حاضری کی سعادت حاصل کی تھی، (سیر الاولیاء ص ۱۷۰ ح ۲)

(۲) حضرت بابا صاحب رح آخری چوتھائی مدت حیات میں اجودھن (پاکپتن) میں سکونت پذیر تھے، قیام اجودھن (پاکپتن) کی مدت امیر خورد کرمانی رح نے اٹھارہ (۱۸) یا چوبیس (۲۴) بتائی ہے (سیر الاولیاء ص ۳۰ ح) گویا کہ یقینی طور پر وہ بھی نہیں بتا سکے ہیں، علی بن محمود جاندار شاہ نے ستائیس (۲۷) سال بتائی ہے (درر نظامی ص ۲۸، ترجمہ) اس اعتبار سے اجودھن (پاکپتن) میں قیام کا آغاز ۶۵۲ھ (1254) یا ۶۴۶ھ (1248) یا ۶۲۳ھ (1225) سے ہوتا ہے، لہذا جو مجموعۂ ملفوظات حضرت بابا صاحب رح کی خدمت میں رہتے ہوئے اور دوران قیام اجودھن (پاکپتن) میں مرتب ہوتا ہے، وہ ۶۲۳ھ (1225) سے پہلے ہرگز مرتب نہیں ہو سکتا، سبب کچھ بھی ہو مگر یہ تاریخی اندراج ۶۳۱ھ (1233) قطعاً غلط ہے۔ اور تحقیقی و تنقیدی نقطۂ نظر سے ہرگز اسے مجوز نہیں بنایا جا سکتا۔

(۳) ۶۳۳ھ (1235) میں حضرت بابا صاحب رح کا قیام بالاتفاق ہانسی میں تھا (سیر الاولیاء ص ۹۴ ح) قرین قیاس یہ ہے کہ ۶۳۱ھ (1233) میں بھی ہانسی ہی میں ہوگا لیکن اگر ہانسی میں قیام نہ ہو تو نہ سہی تاہم اجودھن (پاکپتن) میں قیام ہرگز نہ تھا۔ واقعات شاہد ہیں کہ حضرت

بابا صاحبؒ نے ۶۳۳ھ / 1236 سے کہیں بعد اجودھن (پاکپتن) میں سکونت اختیار کی تھی۔ لہذا جو مجموعہ ملفوظات اجودھن (پاکپتن) میں مرتب ہوا ہے وہ ۶۳۱ھ / 1233 میں مرتب نہیں ہوا ہے بلکہ اس کے کہیں بعد ہوا ہے اور اسرار الاولیاء میں مندرج ۶۳۱ھ / 1233 محرف اور قطعاً غلط ہے۔

(۴) جب خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ اسرار الاولیاء کا جائزہ لیا جاتا ہے اور مطالعہ کیا جاتا ہے، تو زیادہ نہیں تو دو نکتے ایسے ضرور ملتے ہیں جن کی مدد سے اسرار الاولیا کے عہد تدوین کا تعین بآسانی کیا جا سکتا ہے۔

(ا) اسرار الاولیاء کی آخری اور بائیسویں فصل کے اختتام پر یہ عبارت ملتی ہے :-

پس این بود کہ از اسرار الٰہی و الفاظ دربار شیخ الاسلام در مدت دوازدہ سال شنیدہ است۔ دریں مجموعہ نوشتہ آمد (اسرار الاولیا ص ۹۴)

گویا کہ یہ مجموعہ ملفوظات اسرار الاولیاء بارہ سالہ شغف و انہماک کا ثمرہ ہے جو مرتب کرنے والے کے فطری ذوق و شوق کا آئینہ دار ہے۔

(ب) اسرار الاولیا کے مطالعہ سے یہ واضح ہے کہ پندرہویں فصل سے آخر تک آٹھ فصلوں کے شرکا میں حضرت محبوب الٰہیؒ بھی ہیں جس سے یہ ثابت ہے کہ اس بارہ سالہ مدت میں وہ زمانہ بھی شامل ہے کہ جب حضرت محبوب الٰہیؒ اجودھن (پاکپتن) میں حضرت بابا صاحبؒ کی خدمت میں تھے۔

امیر خورد کرمانیؒ نے حضرت محبوب الٰہیؒ کی خود نوشت یادداشت سے نقل کیا ہے کہ رمضان المبارک ۶۶۹ھ / 1270 میں حضرت بابا صاحبؒ نے حضرت محبوب الٰہیؒ کو خلافت نامہ عنایت فرمایا تھا۔ (سیر الاولیا ص ۱۱۶ ج) اور خواجہ امیر حسن علاء سجزیؒ نے حضرت محبوب الٰہیؒ کی زبانی یہ بھی نقل کیا ہے کہ حضرت بابا صاحبؒ نے محبوب الٰہیؒ کو شوال کی کسی تاریخ کو اجودھن (پاکپتن) سے دہلی بھیج دیا تھا، اور محرم کی پانچویں کو حضرت بابا صاحبؒ واصل بحق ہوئے تھے (فوائد الفواد ص ۱۵۲) لہذا اگر ۶۶۹ھ / 1270 کو بارہواں سال مان لیا جائے جو قرین قیاس ہے بلکہ صحیح ہے تو اسرار الاولیاء کی تدوین کا آغاز ۶۵۶ھ / 1258 میں قرار پاتا ہے جو تقویم کے اعتبار سے صحیح ہے بلکہ

ہر اعتبار سے صحیح ہے، اور واقعات کے مطابق بھی ہے۔

(۵) تقویم یہ بھی بتاتی ہے کہ ایک دن کا فرق ہے، جو ہو سکتا ہے تقویم میں ۸ ارشعبان ۶۵۶ھ (1258ء) کو یکشنبہ (اتوار) ہے، اور جمادی الآخر کا مہینہ ۲۹ دن کا ہے، غالباً ۲۹ کو اجودھن (پاکپتن) میں مطلع صاف نہ تھا، اس لیے جمادی الآخر کو تیس دن کا مہینہ مان لیا ہے، جیسا کہ ہوتا رہتا ہے۔ اس اعتبار سے ۸ ارشعبان ۶۵۶ھ (1258ء) کو دوشنبہ ہی ہے اور یہی اسرار الاولیاء کے آغاز کی صحیح تاریخ ہے۔

قلمی کتابوں میں جو غلطیاں ملتی ہیں انھیں اسی طرح سلجھانا ہوتا ہے۔ نقاد ہو یا محقق تاوقتیکہ اس کی کارگزاری میں اخلاص و خونِ جگر کی چاشنی نہ ہوگی، اس کی کارکردگی مقبولیت حاصل نہ کریگی۔ ہر حال میں کامل احتیاط سے حقِ تنقید ادا کرنا چاہیے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اسرار الاولیاء کی پہلی فصل کے آغاز میں جو تاریخی اندراج ہے اس کی وجوہ کچھ بھی ہوں، مگر وہ غلط ہے، اس لیے پہلے اس کی صحت کی جانب متوجہ ہونا ہوگا، جب صحیح حل مل جائے تو قدم آگے بڑھانا ہوگا، ورنہ غلط اندراج کو کسی حالت میں بھی اپنایا نہیں جا سکتا، لہٰذا تقویم کی مطابقت سے اور داخلی شواہد سے جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے، اسے صحیح تسلیم کرنا ہوگا۔ یہ بھی مناسب ہے کہ قدیم قلمی نسخوں کے مطالعہ سے بھی استفادہ کیا جائے۔

(۵) **اسرار الاولیا کا عہدِ تدوین:** تقویم کی مطابقت سے اور داخلی شواہد سے یہ ثابت ہے کہ اسرار الاولیاء کا عہدِ تدوین ۶۵۶ھ (1258ء) تا ۶۶۹ھ (1270ء) ہے اور یہ صحیح ہے، اس عہدِ تدوین کے اعتبار سے حضرت بابا صاحبؒ کی مجالس میں حضرت محبوب الٰہیؒ کی اور بعض مجالس میں مولانا بدر الدین ہانسویؒ کی شرکت بھی صحیح قرار پاتی ہے اور شیخ نجیب الدین متوکلؒ کی وفات کا ذکر بھی برمحل رہتا ہے، ان کے علاوہ دیگر تاریخی واقعات بھی برمحل قرار پاتے ہیں، اور وہ خلفشار رفع ہو جاتا ہے، جو غلط تاریخی اندراج کی بنا پر لاحق ہوتا ہے، لہٰذا عہدِ تدوین ۶۵۶ھ (1258ء) تا ۶۶۹ھ (1270ء) کو صحیح تسلیم کر کے اسرار الاولیا کا جائزہ لینا چاہیے، یقین ہے کہ پھر کوئی الجھن درپیش نہ ہوگی۔

۶۔ **امتیازی خصوصیات** | اسرار الاولیاء میں بعض امتیازی خصوصیات ہیں جو اس سے پہلے کے ملفوظات کے مجموعوں میں یا تو ہیں نہیں یا اگر ہیں تو شاذ و نادر ہی ہیں، اس اعتبار سے اسرار الاولیاء امتیازی و منفرد حیثیت کی مالک ہے، ان میں سے بعض کا ذکر ذیل میں زیر قلم آتا ہے۔

۷۔ **استفسار و مکالمہ** | مولانا بدرالدین اسحاق کی پہلی حاضری کا واقعہ شاہد ہے کہ حضرت باباصاحب[1] کی مبارک نظر طالبوں اور حاضر خدمت ہونے والوں کے قلوب پر بھی رہتی تھی، جو بھی سوال ان کے دل میں ابھرتا، وہ بصیرت باطنی سے اُسے معلوم کر لیتے اور تقریر ہی میں اسے حل فرما دیتے تھے عموماً کسی کو دریافت کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی تھی، اگر کیفیات سے مغلوب ہو کر کسی کی زبان پر کچھ آ گیا ہے تو وہ مستثنیات میں سے ہے۔ ایسی مثالیں بھی اسرار الاولیاء میں خال خال مل جاتی ہیں، اس کو مکالمہ سے تعبیر کر لیا جائے یا استفسار سے، درحقیقت وہ بے مغلوبیت کا تاثر، ورنہ دوران تقریر میں مداخلت و استفسار خوبی نہیں بلکہ معیوب ہے جو بے ادبی کے مصداق بھی ہو سکتا ہے، بہرحال ایسی مثالیں متقدمین کی ملفوظات کے بالمقابل امتیازی نوعیت کی حامل ہیں جس کی اتباع کے نقوش فوائد الفواد وغیرہ بعد کی کتب ملفوظات میں ملتے ہیں گویا کہ اسرار الاولیاء نقش اول ہے، اور فوائد الفواد نقش ثانی ہے۔ اور وہ مثالیں یہ ہیں:-

(أ) ہمیں کہ شیخ الاسلام ایں بیت بہ زبان راند عزیزے از اہل صفہ ....
روئے بہ زمیں آورد و عرض داشت کرد۔ الخ (اسرار الاولیاء فصل سوم ص ۱۶)

(ب) آں گاہ عزیزے از اہل صفہ حاضر بود، سر بہ زمیں آورد و عرض کرد و گفت الخ (ایضاً ص۱۸)

(ج) ازاں میان عزیزے حاضر بود عرض داشت کرد الخ (اسرار الاولیاء فصل ۳۴ ص ۴۲)

ان مثالوں سے یہ واضح ہے کہ اسرار الاولیاء میں استفسار و مکالمہ تو ہے، مگر بقدر قلیل ہے۔ تاہم اس سے اسرار الاولیاء کی اہمیت اور اس کی امتیازی نوعیت واضح ہے۔

۸۔ **فصول** | اسرار الاولیاء کئی فصلوں میں منقسم ہے، ہر فصل کسی عنوان سے متعلق ہے جو ہر فصل کے آغاز میں تحریر ہے، عنوان سے متعلق معلومات اس فصل میں فراہم کی ہیں خواہ ان معلومات کا تعلق

---

[1] سیر الاولیاء ص ۷۰ ایچ

مختلف بیانات ہی سے کیوں نہ ہو" تاہم اس سے یہ سہولت ہے کہ کسی بات کو پوری کتاب میں تلاش کرنے کی زحمت سے دوچار نہیں ہونا پڑتا بلکہ کسی ایک عنوان کے تحت تلاش کر لینا کافی ہوتا ہے، تلاش میں نہ تو وقت ضائع ہوتا ہے اور نہ تکلیف گوارا کرنی پڑتی ہے، بلاشبہ یہ خوبی لائق تحسین ہے، جو اس سے پیشتر کی کتب ملفوظات میں نہیں ہے، علی ابن محمود جاندار نے درر نظامی میں اسرار الاولیا ہی کی اتباع کی ہے، اس لیے اسرار الاولیا نقش اول ہے، اور درر نظامی نقش ثانی ہے، مگر فوائد الفواد اور خیر المجالس میں یہ خوبی نایاب ہے۔

بعض فصلوں کے آغاز میں بعض ممتاز ترین شرکا کے اسمائے گرامی مندرج ہیں جن سے مجالس کی نوعیت و اہمیت واضح ہے آخر میں اختتام کی نوعیت بھی واضح کی ہے، درر نظامی میں ان دونوں اوصاف کا فقدان ہے۔

۹۔ عربی فارسی ہندی مرکبات | اسرار الاولیا میں کئی مقامات ایسے ہیں جن سے ہندی فارسی اور ہندی عربی مرکبات کے استعمال و رواج کا پتہ چلتا ہے اور لسانی اتحاد کی نشان دہی ہوتی ہے، گویا کہ یہ تخم ریزی ہے اردو زبان کے لیے جو پھلی پھولی اور پروان چڑھی، جو آج گوناگوں موانعات کے باوجود ہند و پاک کی شائستہ ترین زبان ہے بعض مثالیں یہ ہیں:-

(۱) اورا بھیا غریب گفتندے۔	اسرار الاولیا پہلی	ص ۴
(ب) فرید اجودھنی	" دوسری	ص ۱۴
(ج) او را در دیش بدہی گفتندے۔	" تیرہویں	ص ۷۰
(د) خربزہ ہندی	" "	ص ۷۱

اس روش کی اتباع کمالیت کے ساتھ صاحب سیر الاولیا امیر خورد کرمانیؒ نے کی ہے، اس اعتبار سے اسرار الاولیا نقش اول اور سیر الاولیا نقش ثانی ہے، خیر المجالس میں اس اتباع کے گہرے نقوش ملتے ہیں۔

۱۰۔ تبلیغی کارنامہ | اسرار الاولیا کی ایک امتیازی خوبی یہ ہے کہ اس میں ایک تبلیغی کارنامہ کا

ذکر ہے، جو راحت المحبین میں بھی ہے، مگر فوائد الفواد اور خیر المجالس جیسی معیاری کتب ملفوظات میں نہیں ہے، اس اعتبار سے اسرار الاولیاء اولین اور منفرد اوصاف کی مالک ہے، اور وہ واقعہ یہ ہے کہ خواجہ قطب الدینؒ جس سے مراد خواجہ قطب الدین مودود چشتیؒ ہیں ان کی مجلس میں حاضرین مجلس میں سے کسی نے دریافت کیا کہ کوئی کیسے جانے کہ وہ کامل ہو گیا ہے اور اس نے سلوک کی منازل طے کر لی ہے، آپ نے فرمایا کہ یہ شخص کسی مردے پر دم کر دے، اگر وہ بحکم الٰہی زندہ ہو جائے[1]، تو یہ علامت اس کی کمالیت کی ہے ؂

فیض روح القدس ار باز مدد فرماید دیگران ہم بکنند آنچہ مسیحا می کرد

ابھی یہ گفتگو ختم ہونے نہ پائی تھی کہ ایک بڑھیا روتی دھوتی حضرت خواجہ قطب الدین چشتیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ میرا ایک ہی لڑکا ہے، بادشاہ نے بے گناہ اسے سولی پر چڑھا دیا ہے، آپ یہ سنتے ہی عصا ہاتھ میں لے کر اس کے ہمراہ ہو لیے، موقع واردات پر پہنچے، لڑکے کو سولی پر چڑھایا جا چکا تھا، آثار زندگی باقی نہ تھے، آپ نے دیکھا اور بارگاہِ الٰہی میں التجا کی، خداوندا! اگر بادشاہ نے اُسے بے جرم و خطا سولی پر چڑھوایا ہے تو آپ اسے زندہ فرما دیں اپنے یہ فرمایا ہی تھا کہ وہ لڑکا زندہ ہو گیا، مولانا رومؒ نے فرمایا ہے ؂

اولیا را ہست قدرت از الٰہ تیر جستہ باز گردانند ز راہ

اس عمل کرامت کی برکت سے ہزاروں غیر مسلم جن کا تعلق کسی طرح ہندوستان سے تھا مسلمان ہو گئے اور صحیح راہ عمل اختیار کر لی تھی، لکھا ہے :-

آں روز ہزار در ہزار ہندو مسلمان شدند، (اسرار الاولیاء ص ۸۹)

ہندو سے مراد بدھسٹ بھی ہو سکتے ہیں جو چشت، خراسان اور بت بامیان کے علاقہ

---

[1] امیر خورد کرمانیؒ نے حضرت محبوب الٰہیؒ کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ تصور عوام در نفس ایشاں موثر آید۔ اولیاء را آں تصور در نفس غیر موثر آید..... اگر صاحب کرامتے تصور کند در نفس غیرے آں تصور حاصل می شود تا اگر میت شخصے تصور کند آں شخص بمیرد، و اگر در بدن شخصے تصور کند در حال آں شخص حاضر شود۔ (سیر الاولیاء ص ۳۵۱ پ ۲)

آئینہ ملفوظات

میں آباد تھے اور ہندو بھی جو عہد غزنوی سے غزنی اور اس کے گردونواح میں آباد تھے اور کھلم کھلا اپنے ٹھاکروں کی پوجا پاٹ کیا کرتے تھے۱ اور وہ گبر و ترسا نہ تھے،

۱۱- استادِ محترم | اسرار الاولیا ہی سے ہماری معلومات میں یہ اضافہ ہوتا ہے کہ حضرت باباصاحبؒ کے استادِ محترم کا نام نامی مولانا بہاؤالدین بخاریؒ تھا۔ آپ نے فرمایا :-

"اے درویش وقتے از زبان استاد خود شنیدم مولانا بہاؤالدین بخاری رحمۃ اللہ علیہ کہ وقتے خواجہ تمیم انصاری رحمۃ اللہ علیہ بر دست حبشیان گرفتار شدہ بود" (اسرار الاولیا ص ۱۳۰)

ایک دفعہ یہ بھی ذکر فرمایا :-

اے درویش از شیخ بہاء الدین بخاریؒ کہ یکے از واصلان حق بود ایں قطعہ از و یاد دارم اما از شوق گفتہ بود۔

من اول روز چوں در تو بدیدم شیفتہ گشتم	ندانستم تو بودے یا کہ بود است ایں کہ من دیدم
چناں در روئے جاناں شدم من شیفتہ و والہ	کہ من از خود شدم بیروں ترا در جان و تن دیدم

الغرض ان امتیازات سے اسرار الاولیا کی انفرادیت واضح ہے، اسرار الاولیا کے مطالعہ سے معلومات میں وہ اضافہ ہوتا ہے جو دیگر کتب ملفوظات کے مطالعہ سے نہیں ہوتا۔

۱۲- اسرار الاولیا کی ضخامت | اسرار الاولیا کے فارسی نسخے کا حجم ۱۴۴ صفحات ہے، مولانا بدرالدین اسحاقؒ نے یہ بھی وضاحت فرمائی ہے کہ انھوں نے یہ صحیفۂ رشد و ہدایت بارہ سال میں مرتب فرمایا ہے۔ اس بیان کے صحیح ہونے میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں، حضرت محبوب الٰہیؒ کا ارشاد ہے :-

مولانا بدرالدین اسحاقؒ چناں خادمی	مولانا بدرالدین اسحاقؒ حضرت باباصاحبؒ
شیخ شیوخ العالم قدس اللہ سرہ العزیز	کی خدمت ایسی کرتے تھے جو دس آدمی
کردے کہ از دہ تن چناں خدمت نیاید	بھی نہیں کر سکتے تھے (اس مشغولی کے باوجود)
باآں ہم مستغرق و مشغول حق بودے تا بحدے	نہایت مستغرق اور یادِ حق میں محو رہتے
کہ بخدمت شیخ شیوخ العالم نشستہ	تھے حتیٰ کہ جب حضرت باباصاحبؒ

---

۱ کیفیہ		آئینہ ملفوظات

مستغرق حق تعالیٰ بودے کہ از خود خبر نہ داشتے۔	کی خدمت میں بیٹھے ہوتے تو بھی ہمہ تن یاد الٰہی
(سیر الاولیاء ص ۱۷۷، ج)	میں محو رہتے تھے اور انھیں اپنا بھی ہوش نہ رہتا تھا۔

حضرت محبوب الٰہیؒ نے یہ بھی فرمایا ہے:-

وقتے مولانا بدرالدین اسحاقؒ کہ تعویذ	ایک دفعہ مولانا بدرالدین اسحاقؒ موجود
او نوشتے حاضر نہ بود، خلقے بجہت	نہ تھے جو حضرت باباصاحبؒ کے حکم سے
تعویذ بروں آمدہ بودند مرا اشارت	تعویذ لکھا کرتے تھے، تعویذ لینے والے
کرد کہ تو بنویس من تعویذ نوشتم تا خلق	آئے ہوئے تھے، حضرت باباصاحبؒ نے
انبوہ شد کتابت من بسیار شد و مزاحمت	مجھ سے فرمایا تم لکھو، میں نے تعویذ لکھے تعویذ
خلق بیشتر شد، دریں میان شیخ روئے	لینے والے بہت ہی آ جمع ہوئے، مجھے
سوئے من کرد و فرمود کہ ملول شدی	بہت ہی لکھنا پڑا، مخلوق کے ہجوم سے
من گفتم وقت شیخ عامر است۔	کام میں رکاوٹ بھی ہوتی تھی حضرت
(فوائد الفواد ص ۲۰۰)	باباصاحبؒ نے میری طرف رخ کیا اور
	فرمایا کیا تھک گئے، میں نے عرض
	کیا آپ پر سب کچھ روشن ہے۔

حضرت محبوب الٰہیؒ کے بیان سے واضح ہے کہ مولانا بدرالدین اسحاقؒ کو بھی ہجوم خلائق سے دوچار رہنا پڑتا تھا جس میں خاصا وقت صرف ہوتا تھا، اس انہماک اور مشغولیت کے باوجود دیگر امور بھی ان کے سپرد تھے، مہانوں کی تواضع و خدمت، لنگر خانے کا انتظام و اہتمام بھی ان ہی کے سپرد تھا، حتیٰ کہ لنگر خانے کے لیے جنگل سے لکڑیاں بھی لاتے تھے، (سیر الاولیاء ص ۱۷۷) پھر جو شخص اس قدر منہمک اور مشغول بکار ہو اور جس کے لیے حضرت باباصاحبؒ کی خدمت مقدم ہو اور خدمت بھی ایسی کہ اس سے دس آدمی بھی عہدہ برآنہ ہوسکیں اور ہمہ وقت مشغول بھی رہتا ہو، اس سے کتنی ضخیم کتاب کی تدوین متوقع ہوسکتی ہے، لہٰذا جو کچھ بھی کیا

وہ ان ہی کا کام تھا، جو انھوں نے کیا دوسرا کوئی عہدہ برآنہ ہو سکتا تھا۔

واقعات شاہد ہیں کہ یہ مجموعۂ ملفوظات اسرار الاولیا، مولانا بدر الدین اسحاقؒ ہی کے رشحاتِ قلم کا ثمرہ ہے جو دست بردِ زمانہ سے ہم تک محفوظ نہیں پہنچا ہے، لیکن جو کچھ ہے عقیدت مندوں کے لیے سرمۂ چشم اور سالکانِ راہِ سلوک کے لیے خضرِ راہ ہے۔

۱۳۔ کتابوں کے حوالے | حضرت باباصاحبؒ کا مطالعہ وسیع اور حافظہ نہایت قوی تھا آپ کو یہ یاد رہتا تھا کہ کس مضمون کا ماخذ کیا ہے، لہٰذا آپ گاہ بگاہ طالبوں کی رہنمائی کے پیشِ نظر جزوی یا کلی طور پر ماخذات کا ذکر بھی فرماتے رہتے تھے، یہ روش ملفوظات میں عام ہے، عموماً ہر مجموعۂ ملفوظات میں ملتی ہے، اسرار الاولیا میں متعدد ماخذات کا ذکر ہے مثلاً:۔

(۱) قاضی حمید الدین ناگوری رحمۃ اللہ علیہ در تواریخ خود نبشتہ است (ص ۴-۱۳)

(۲) خواجہ معین الدین سنجریؒ جائے نبشتہ است (ص ۵) (۳) در زاد المحبین نبشتہ دیدہ ام (ص ۸) (۴) خواجہ امام محمد طاہر غزالی در تواریخ خود نبشتہ است (ص ۱۲) (۵) در آثار الاولیاء نبشتہ دیدہ ام (ص ۱۵) (۶) شیخ الاسلام شہاب الدین قدس اللہ سرہ العزیز فرمودہ است (ص ۴۷) (۷) در سلوک نبشتہ دیدہ ام (ص ۴-۳۰) (سلوک سے مراد غالباً کتاب سلوک الاولیاء ہے) (۸) در عہد خواجہ جنید بغدادی قدس اللہ روحہ دیدہ ام (ص ۴۷-۴۸) (۹) در اسرار العارفین نبشتہ دیدہ ام (ص ۵۰) (۱۰) در کتاب محبت نبشتہ دیدہ ام (ص ۵۱-۵۳)

(۱۱) در حجۃ العارفین آمدہ است (ص ۵۲) (۱۲) خواجہ عبداللہ سہیل تستری رحمۃ اللہ علیہ جائے نبشتہ است (ص ۶۶) (۱۳) در سلوک الاولیاء نبشتہ دیدہ ام (ص ۶۷) (۱۴) از زبانِ شیخ اوحد الدین کرمانیؒ شنیدہ ام (ص ۶۹) (۱۵) شنیدم از زبانِ خواجہ قطب الدین بختیار اوشیؒ قدس اللہ سرہ العزیز (ص ۷۳)

تلاش و تفحص سے کچھ حوالے اور بھی ملتے ہیں، ماخذات کی یہ تعداد نہایت قلیل ہے، آٹھ سات کتابوں کے نام ہیں، دیگر حوالہ جات کا تعلق ذاتی معلومات اور ذاتی مطالعہ سے ہے،

حوالہ جات کا یہی عالم دیگر کتب ملفوظات میں ہے، خیرالمجالس میں اکتیس[۳۱] تو مستقل کتابوں کے نام ہیں اور متعدد حوالے ذاتی معلومات پر مبنی ہیں خیرالمجالس میں مآخذات کا ذکر کچھ اس طرح ہے:۔

(۱) درکشاف نوشتہ است (ص ۸۲) (۲) درکتابے نوشتہ است (ص ۴۹) (۳) حجۃ الاسلام غزالی حکایت بزرگے نوشتہ است (ص ۹۵) (۴) عین القضاۃ درکتاب خود نوشتہ است (ص ۹۷) (۵) قول بزرگے فرمودند (۱۵۵) درعوارف است (ص ۱۵۵) (۷) از بزرگے روایت فرمودند (ص ۱۵۴) (۸) دررسالہ نبشتہ دیدہ ام (ص ۲۳۵) (۹) درفلاں کتاب نوشتہ است (ص ۲۳۹) (۱۰) درکتابے دیدہ ام (ص ۲۵۷)۔

متقدمین کی اکثر وبیشتر کتابیں نایاب وناپید ہیں بعض کا پتہ نشان کشف الظنون (چلپی) کی سی کتب حوالہ جات سے مل سکتا ہے، لیکن کتب حوالہ جات بھی جزو کل پر حاوی نہیں ہوتیں حال ہی میں پنجاب یونیورسٹی لاہور (پاکستان) سے "تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند" نام سے کئی جلدیں شائع ہوئی ہیں لیکن متعدد کتابوں کا ذکر رہ گیا ہے، جن کی طرف ماہنامہ معارف اعظم گڑھ (جنوری وفروری ۱۹۸۰ء) میں توجہ دلائی ہے، اس کا مدعا یہ ہے کہ اگر بعض کتابوں کا ذکر نہیں ملتا تو یہ بدگمانی نہیں کی جاسکتی کہ یہ کتابیں جعلی وفرضی ہیں، اولیاء اللہ سے متعلق کتابوں کے باب میں تو یہ بدگمانی نہایت درجہ مکروہ ہے۔ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ۔ بدگمانی کا مرتکب وہی ہوگا جو علمی قدروں سے نابلد ہوگا۔

الغرض اسرارالاولیا میں ماخذات کے جو حوالے ملتے ہیں وہ خیرالمجالس کے حوالوں سے زیادہ وسیع اور معتبر انداز میں ملتے ہیں، اُن کے بارے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں تقریر وبیان میں حوالہ جات کی یہی روش رہی ہے، جو آج بھی ہے۔

۴۔ اسفار ومشاہدات کتب ملفوظات کا مطالعہ شاہد ہے کہ اولیاء اللہ کا یہ کلی معمول رہا ہے کہ وہ ملفوظات میں برمحل اپنے اسفار ومشاہدات کا ذکر فرماتے رہے ہیں حضرت محبوب الٰہیؒ

کے اسفار نہایت قلیل ہیں، بدایوں سے دہلی اور دہلی سے اجودھن (پاکپتن)، مگر آپ نے ان مختصر اسفار و مشاہدات کا بھی ذکر خیر فرمایا ہے جو فوائد الفواد اور سیر الاولیاء کے اوراق کی زینت ہے، یہ صورتِ حال اس پر دلالت کرتی ہے کہ یہ بھی حضرت بابا صاحبؒ کے اسفار و مشاہدات کی اور دیگر مشائخ عظام ہی کی اتباع ہے۔

حضرت بابا صاحبؒ کے اسفار و مشاہدات کا ذکر اسرار الاولیاء میں بھی ہے، اور راحت القلوب میں بھی ہے، ممکن ہے کہ حضرت بابا صاحبؒ کے ملفوظات کے ان مجموعات میں بھی ہو جو اب نایاب ہیں فوائد الفواد میں بیشک حضرت بابا صاحبؒ کے ان سفروں اور مشاہدوں کے ذکر کو دہرایا نہیں گیا ہے جن کا تعلق دیگر ممالک سے ہے، فوائد الفواد نہ تو حضرت بابا صاحبؒ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے نہ حضرت بابا صاحبؒ کی سوانح حیات ہے، نہ وہ کوئی انسائیکلوپیڈیا ہی ہے کہ اس میں وہ کچھ ہوتا جو عمومی کتابوں میں نہیں ہوا کرتا، البتہ وہ صحیفۂ رشد و ہدایت ہے طالبانِ سلوک کے لیے، مگر کیا اس میں سلوک سے متعلق سب ہی کچھ ہے، پھر اگر حضرت بابا صاحبؒ کے اسفار و مشاہدات کا ذکر نہیں ہے تو وہ نفیِ اسفار کی دلیل کیسے ہو سکتی ہے، لزوم مالا یلزم بے معنی سی بات ہے۔

حضرت بابا صاحبؒ کے جن سفروں کا ذکر اسرار الاولیاء کے اوراق کی زینت ہے وہ یہ ہیں:-

ملک بالا[1] (مقام سیوستان) بغداد، غزنی، طرف شام، بدخشاں، سیوستان، بدایوں، لاہور۔

ان کے علاوہ بھی دیگر معتبر ماخذات میں دیگر سفروں کا ذکر ملتا ہے، مثلاً اجمیر، دہلی، ہانسی، ملتان، اچ، فرید کوٹ، علاقہ سہارنپور، مارہرہ، بخارا، اور قندھار.......

عہدِ وسطیٰ میں سیاحت مشائخ عظام کا خصوصی مشغلہ تھا، خواجہ عثمان ہرونی، خواجہ بزرگ خواجہ معین الدین حسن سجزیؒ، خواجہ قطب الدین بختیار اوشیؒ، قاضی حمید الدین ناگوریؒ،

---

[1] فوائد الفواد ص ۱۹۴ کی عبارت سے مفہوم ہوتا ہے کہ ملک بالا سے بلخ و کاشان وغیرہ علاقہ جات مراد ہیں۔

شیخ جلال الدین تبریزیؒ، شیخ بہاءالدین زکریا ملتانیؒ، شیخ سعدی شیرازیؒ متواتر حرکت میں رہے ہیں اور اس پُرآشوب زمانے میں بھی عزلت گزیں نہ ہوئے جب قدم قدم پر خطرہ لاحق تھا، اس باب میں حضرت باباصاحبؒ بھی ان ہی بزرگوں کے ہم ردیف رہے، اور سیر و سیاحت کے فوائد سے مستفید ہوئے۔

۱۵۔ تاریخی وقائع ہر کتاب کا ایک موضوع اور ایک نصب العین ہوتا ہے، اور وہ اس علم فن سے متعلق ہوتا ہے۔ جس سے متعلق وہ کتاب ہوتی ہے، اگر ضمناً دیگر علوم و فنون سے متعلق کچھ شامل ہو جائے اور وہ مربوط بھی ہو جائے تو کچھ مضائقہ نہیں، ایسا خال خال ہی ہوتا ہے، ورنہ ہر کتاب اپنے فن سے متعلق رہتی ہے، فلسفہ، منطق، ریاضی، سائنس، دینیات، تصوف، ان علوم سے متعلق جو کتابیں ہوں گی، ان میں تاریخی وقائع کی تلاش بے سود اور لاحاصل ہے، کتب ملفوظات کی نوعیت بھی یہی ہے کہ اذہان دنیا کی زرق برق و بھڑک بھڑک میں مبتلا نہ ہوں اور بس، چنانچہ فوائد الفواد اور خیر المجالس میں ان کے عہد تالیف کی تاریخی وقائع نہیں ملتے، لیکن تعجب یہ روزگار رہے کہ اسرار الاولیاء میں اس عہد کے مختصر سے دو تاریخی وقائع ملتے ہیں :۔

(۱) سلطان ناصر الدین محمود کا سفر ملتان ($\frac{۶۵۵ھ}{1257}$) ص ۴۲، اُچ پر مغلوں کی یورش اور والی ملتان شیر خاں کا مارا جانا ($\frac{۶۶۲ھ}{1263}$) ص ۶۹ –

اس اعتبار سے بھی اسرار الاولیاء کو دیگر کتب ملفوظات پر فوقیت ہے -

۱۶۔ داخلی کیفیات اسرار الاولیاء اگرچہ دستبرد زمانہ سے محفوظ نہیں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وہ حضرت باباصاحبؒ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے، صدہا سال گزر جانے کے باوجود بھی ان میں وہ کیفیت اور دل آویزی ہے جو بیان میں سما نہیں سکتی، بار بار پڑھنے سے کیفیت میں متواتر اضافہ ہوتا رہتا ہے، ذرا بھی کمی نہیں آتی، پڑھنے والا نئی سے نئی کیفیت سے لطف اندوز ہوتا رہتا ہے، کبھی کسی بیان سے اور کبھی کسی بیان سے پڑھنے والے پر یکا یک کچھ ایسی کیفیت طاری ہوتی رہتی ہے کہ وہ اپنے کو ہر بار کسی اور ہی عالم میں پاتا ہے اور محسوس کرتا ہے، کیف و ذوق سے طبیعت ایسی متکیف رہتی ہے کہ گویا وہ نغمہ الست میں کھو سا گیا ہے اور کوثر و تسنیم کی موجوں سے کھیلنے لگا ہے،

کیف وسرور کے عالم میں مدہوش و بے خبر ہے، اور اسی عالم میں رہنا چاہتا ہے، کبھی عالم سرور وبیخودی میں گنگنانے لگتا ہے ؎

تو جو آ کیش محبت میں کہ سب کچھ ہے روا   حسرت حسرتِ بادۂ وہ مزا مسیر نہ کھینچ

ضرورت حاضرہ کے پیشِ نظر میں نے اسرار الاولیا کا از سرِ نو مطالعہ کیا، کیا بتاؤں میں نے کیا پایا۔ کئی مقام ایسے آئے کہ روح میں اہتزاز پیدا ہو گیا، جی بھر آیا، آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے، حسرت وحیرت طاری ہو گئی، دل دنیا سے بیزار کچھ اور ہی چاہنے لگا، سب سے حیرت انگیز یہ ہے کہ یہ بھی پتہ نہ چلا کہ یہ کیف وسرور [illegible] مستی وبیخودی کس لفظ کس جملے یا کس عبارت سے حاصل ہوئی ہے، کہہ لیجیے کہ تدریجی طور سے جو کیفیت فراہم ہوتی رہی ہے جب پیمانہ لبریز ہو گیا تو چھلک پڑا ہے۔

بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسرار الاولیا از اول تا آخر کیف ومستی، شریعت وطریقت ادب وزبان، نور وعرفان اور صداقت ودلربائی کا بے مثال مرقع ہے، دیرینہ روزی کے اثرات سے متاثر ہونے کے باوجود تاثیر کا نشتر رگِ جان میں پیوست ہوتا ہی چلا جاتا ہے، اگرچہ وہ زبانِ حال سے عقیدتمندوں کی سرد مہری اور بے اعتنائی کی نوحہ خوان بھی ہے کہ وہ صحت ومقابلہ سے مزین ہو کر منظر عام پر نہ آسکی، جس کی اشد ضرورت ہے۔

عرفاء کاملین میں رشد وہدایت کو بڑی اہمیت ہے اور وہ اس باب میں ضعیف سے ضعیف بلکہ غریب ومنقطع اور معلل حدیث کو بھی روا رکھتے ہیں، اور اس سے کام لینے میں تکلف نہیں برتتے۔ وہ طبیب روحانی ہوتے ہیں، حاذق اطباء سے بھی اس باب میں ان کا مقام بلند ہے، وہ دل کی نبض پر انگلی رکھتے ہیں، اور تشخیص وتجویز کرتے ہیں، اور تدبیر فرماتے ہیں، جس طرح حاذق اطباء کو ان ادویہ سے کام لینے کا استحقاق ہے جو عام حالات میں شرعاً ممنوع اور حرام وناروا ہیں، اسی طرح عرفا کاملین بھی بوقت ضرورت ان تدابیر کو اپنا لیتے ہیں، جنھیں علمائے شریعت وقیع نہیں جانتے اور جن سے اجتناب برتتے ہیں۔

خوارق عادات اور محیر العقول نقلیں اور تمثیلیں بالطبع انسان کو مرغوب ہیں، عرفائے کاملین

نے اس سے بھی کام لیا ہے، انوار سہیلی، کلیلہ و منہ، پنج تنترا، منطق الطیر اور مثنوی معنوی تمثیلی بیان کے شاہکار ہیں جن کی حکایتوں اور تمثیلوں سے اہم اخلاقی نتائج برآمد ہوتے ہیں، جن سے دل و دماغ کی کایا پلٹ جاتی ہے، حیرت انگیزی کا وصف دلوں کو موہ لیتا ہے اور آمادۂ عمل بنا دیتا ہے ——
اسرار الاولیاء بھی اس وصف سے خالی نہیں، اگر اس کو اسرار التحیرین سے تعبیر کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا، اور اسرار الاولیاء ہی کیا عہد وسطیٰ کا جملہ ادب مشرقی ہو یا مغربی اس وصف سے مالا مال ہے، اگر اسرار الاولیاء میں یہ وصف نہ ہوتا تو نگاہ تحقیق میں یہ اس کا وصف نہ ہوتا سقم ہوتا۔

یہ صحیح نہیں کہ محیر العقول واقعات سے ناممکنات کے یقین کا نقش جمانا مقصود ہوتا ہے، بلکہ مقصود ہوتا ہے اس کا اثر و نتیجہ[1]، اور در اصل اسلوب کی جاذبیت اور کشش مراد ہوتی ہے، بہر نوع دیرینہ روزی کے اثرات سے متاثر اور دستبرد زمانہ کے اثرات سے دوچار رہنے کے باوجود مجموعۂ ملفوظات اسرار الاولیاء خوبیوں سے مالا مال اور لائق مطالعہ و استفادہ ہے، البتہ ضرورت ہے کہ صحت و مقابلہ سے آراستہ کر کے اسے منظر عام پر لایا جائے تاکہ معاشرے میں ایمانی تنوع رونما ہو اور حقیقی راہنمائی حاصل ہو سکے۔

۱۷۔ اسلوب بیان: اسرار الاولیاء کا اسلوب بیان اگرچہ سادہ، سلیس اور عام فہم ہے مگر نہ ایسا سادہ و سپاٹ اور بے آب و رنگ کہ مطالعہ سے امتلائے ادبی پیدا ہو اور نہ ایسا رنگین و دقیق اور مسجع و مقفیٰ کہ اس پر مصنوعی ہونے کا اطلاق ہو سکے، اور جس سے خاص و عام لطف اندوز نہ ہو سکیں، اسرار الاولیاء بلکہ جملہ ملفوظات کے مجموعات کا یہ عمومی وصف ہے کہ ہر طبقہ کا فارسی داں مفہوم و مضمون کو بآسانی سمجھ سکتا ہے، اور اپنی استعداد کے مطابق استفادہ کر لیتا ہے، تصوف کے دقیق اور نازک مسائل کو اس خوبی سے بیان کرنا زبان دانی کا اور اسلوب بیان کا ایسا وصف ہے جو ہر تعریف و توصیف سے بالاتر ہے۔

اس وصف کا تعلق جامع سے بھی ہے، اور صاحب ملفوظ سے بھی، جامع کتنے ہی فاضل سہی

[1] ماہنامہ "معارف" اعظم گڑھ ۱۹۶۹ء ص ۱۰۷۔

لیکن راہِ سلوک میں وہ مبتدی ہوتے ہیں، اگر شیخ کا اسلوب کمالیت سے مالامال نہ ہو تو وہ یقیناً عہدہ برآ نہ ہوں۔ گویا کہ اسرار الاولیاء کا اسلوب دراصل پرتو ہے حضرت بابا صاحبؒ کے اسلوب کا، حضرت محبوبِ الٰہیؒ کا ارشاد ہے:-

بارہا در ذوقِ بیاں ایشاں مردم چناں	اکثر ایسا ہوا ہے کہ سامعین آپ کے
فرد می شد کہ تمنا بردہ شدے اگر ہمیں	(حضرت بابا صاحبؒ کے) بیان کے کیف
زماں مردم ہمیر دنیکو باشد۔	میں کھو سے گئے ہیں اور آرزو کرنے
(فوائد الفواد ص ۵۰)	لگے ہیں کہ اسی کیف میں مرجائیں تو اچھا ہے۔

حضرت خواجہ غلام فرید چشتیؒ (متوفی ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء) کا ارشاد ہے:-

"شیخ بدرالدین اسحاق قدس اللہ سرہٗ جو اسرار الاولیاء کے جامع ہیں اُنکا ضبطِ تاریخ و الفاظ اس قدر پختہ ہے کہ جو کچھ انھوں نے شیخ شیوخ کی زبان، درفشاں سے سنا اسی طرح لکھ دیا، اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں" (مقابیس المجالس ص ۳۶۵-۳۶۶ ترجمہ)

یہ ان بزرگ کا بیان ہے جو علم و فضل اور بصیرت باطنی سے مالامال اور درویشانہ و عالمانہ شخصیت کے جامع تھے، ان کے بیان کے بعد اسرار الاولیاء کے اسلوب بیان سے متعلق لب کشائی کی گنجائش نہیں رہتی، گویا کہ اسرار الاولیا کا اسلوب بیان ہر اعتبار سے جامع اور بے مثل ہے۔

۱۸۔ نفسِ مضمون: اسرار الاولیاء، جن جواہر پاروں کا خزینہ ہے، ان میں سے معدودے چند پیش کیے جاتے ہیں تاکہ نفس مضمون سے آگاہی حاصل ہو سکے اور اسرار الاولیاء کی اہمیت واضح ہو جائے، فرمایا ہے:-

(۱) اے درویش جو بادہ محبت سے سرشار ہے وہی عرفاء کے کلام کا قدردان ہے۔ وہی جانتا اور سمجھتا ہے۔ (۵)

(۲) اے درویش! کلام معرفت کی قدر و منزلت سے وہی آگاہ ہے، جس کے دل میں انوارِ عشق اور اسرار دوست نے گھر کر لیا ہے۔ (۵)

ورنہ حقیقت یہ ہے کہ

اے کہ آگاہ نہ عالم درویشاں را تو چہ دانی کہ چہ سودا و سراست ایشاں را

(۳) اے درویش فقرا اہل عشق ہیں اور علماء اہل عقل .... اور درویشوں کا عشق علماء کی عقل پر غالب ہے۔

(۴) اے درویش مردانِ خدا نے یہی کیا ہے کہ وہ جب کسی عاجز و درماندہ اور محتاج کے پاس سے گزرے اسی کو نعمت دارین سے مالا مال کر دیا ہے۔ (۶)

یہ فیض رسانی انسانی ہمدردی کے وصف کا ثمرہ ہے، جواب ناپید ہے

(۵) اے درویش جس دل میں محبت گھر کر لیتی ہے، اس میں محبوب کے سوا اور کسی شے کے سمانے کی گنجائش نہیں رہتی ....

وصالِ محبوب سے باریاب وہی ہوتا ہے، جو دوئی کے عیب سے محفوظ و مبرا ہوتا ہے (۱۸۰۷) پھر شرک و کفر کی گنجائش کہاں، عیب جوئی اور خوردہ گیری کا گزر کہاں؟

(۶) اے درویش عشق و محبت کی آگ درویش ہی کے دل میں سلگتی ہے، اس کی جلوہ آرائی کے لیے اور کوئی محل و مقام نہیں ہے۔ (۷)

سماع سے یہ آگ بھڑک اٹھتی ہے، حضرت باباصاحبؒ کا ارشاد ہے" السماع یحرک قلوب المستمعین ویوقد نار الشوق فی صدور المشتاقین۔ [1] (سیر الاولیاء ص ۴۹۲)

(۷) اے درویش اس عالم آب و گل سے جو کوئی ایمان سلامت لے گیا، یقین جانو اس نے بڑا کام کیا، پالا مار لیا۔

سلامتی ایمان کا تو یہاں احساس تک نہیں، اللہ ہی انجام بخیر فرمائیں تو فرمائیں۔

(۸) جب کسی درویش پر کیفیت طاری ہوتی ہے، تو از عرش تا فرش بلکہ تحت الثریٰ تک کوئی شے اس سے چھپی نہیں رہتی۔

---

[1] سماع۔ سننے والوں کے دلوں کو حرکت میں لاتا ہے اور مشتاقوں کے دل میں شوق کی آگ کو بھڑکا دیتا ہے۔

یہ کیفیت فضل الٰہی پر منحصر ہے، یہ بڑا نازک مرحلہ ہے، اچھے اچھوں کے قدم ڈگمگا گئے ہیں۔ عالم تحیر میں بسا اوقات اسی کیف سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

(۹) دنیا طلبی مسلمانوں کو راس نہیں، مسلمانوں میں جو بھی طالب دنیا ہوگا۔ وہ محروم ہی رہے گا، دنیا پاس بھی نہ پھٹکے گی۔

بڑے گر کی بات ہے، معاشرے کے نقص کی نشان دہی ہے، طلب دنیا کیا ہے، حق سے بے خبری اور روگردانی ہے۔

چیست دنیا از خدا غافل بودن

(۱۰) اے درویش دنیا میں کوئی شے صدقے سے بہتر اور سخاوت سے افضل نہیں ہے، جس نے بھی کچھ پایا ہے سخاوت ہی کی بدولت پایا ہے۔

ایثار و قربانی کی ترغیب و تحریص ہے، درویش اسی پر عامل ہوتے ہیں۔ سعدی علیہ الرحمہ کا ارشاد ہے ؎

نیم نانے گر خورد مرد خدا بذل درویشان کند نیمے دگر

درویشی میں حاتم کا سا دل درکار ہے، قارون کی سی تنگ دلی مطلوب نہیں، آج کے درویش کیا طمع زر اور حب جاہ میں مبتلا نہیں ہیں؟

(۱۱) نزول رحمت کے تین وقت ہیں:-

(ا) سماع کے دوران اہل سماع پر، اور ان کے یار و انصار پر نزول رحمت ہوتا ہے۔

(ب) اولیاء اللہ کے ذکر کے دوران ذاکر پر اور شرکائے محفل پر نزول رحمت ہوتا ہے۔

(ج) اہل دل جب انوار و تجلیات کے عالم میں مستغرق ہوتے ہیں تو ان پر نزول رحمت ہوتا ہے۔

سماع فی نفسہ مباح ہے، اس کی حرمت نص قطعی سے ثابت نہیں، جو سماع صوفیہ کرام کے ہاں مروج تھا، وہ اب نایاب ہے، قوالی جس کا رواج آج کل ہے، وہ سماع نہیں، سماع کی مسخ شدہ شکل ہے، موجودہ قوالی کو سماع سے تعبیر کرنا اور اس کے پردے میں سماع کو حرام بتانا

صحیح نہیں ہے، اسی طرح مروجہ قوالی کو سماع سے تعبیر کرنا اور اس کے پردے میں قوالی کو حلال جاننا بھی صحیح نہیں ہے ؎

جن کو نہیں شعور زلیست ان کو یہ کہنا ہے روا حسن بلائے چشم ہے نغمہ وبالِ گوش ہے

(۱۲) اے درویش یادِ الٰہی میں ہمیشہ مشغول رہنا چاہیے، بمصداق دل بیار دست بکار، ہر ہر کام اللہ کی رضامندی کے مطابق ہونا چاہیے، دیکھنا پھر تم کیسی کیسی نعمتوں سے نوازے جاتے ہو۔

خداوندِ عالم عمل صالح کی توفیق عنایت فرمائیں، یہی خلاصہ ہے، اسلامی تعلیمات کا۔

(۱۳) اے درویش مولیٰ اور بندے میں جو دوری ہے اور درمیان میں جو پردے حائل ہیں، وہ آلائش دل کے سبب سے ہیں، دل دنیا کی دھندوں میں الجھا ہوا ہے اگر آلائش دل دور ہو جاتے تو جو پردے حائل ہیں اٹھ جائیں گے، دصفائے قلب اور مقام مشاہدہ حاصل ہو جائے گا، جو بہت بڑی نعمت ہے، توبۃ النصوح سے یہ پردے مرتفع ہو سکتے ہیں۔

توبۃ النصوح کی تلقین اور خدارسی کی تعلیم ہے، جو انسانیت کا اعلیٰ وصف ہے، خدائے پاک توفیق نصیب فرمائے۔

(۱۴) جب صبح ہوتی ہے تو جسم انسانی کے ساتوں حصے زبان سے پناہ مانگتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ اے زبان اگر تو نے اپنے کو قابو میں رکھا تو ہم ہلاکت سے محفوظ رہیں گے، ورنہ تباہ وبرباد ہو جائیں گے، اے زبان ہمارے حال پر رحم کر اور اپنے کو قابو میں رکھ تاکہ ہم ہلاکت سے محفوظ رہیں۔

ہفت اندام (۱) سر (۲) سینہ (۳) پیٹھ (۴، ۵) دونوں ہاتھ (۶، ۷) دونوں پیر۔ بعض نے دل و دماغ، کلیجہ، تلی، پھیپھڑا، پتہ، معدہ یا گردہ قرار دیے ہیں لیکن ان کا تعلق دراصل علم طب سے ہے، عمومی طور پر ہفت اندام سے مراد پہلے ہی سات عضو انسانی ہیں۔

خواجہ حالیؔ کی زبان گویا کا ماخذ یہی حکایت ہے، دیکھیے اہل کمال برادران وطن کی ضیافت کے لیے کہاں کہاں سے خوشہ چینی کرتے اور دستر خوان سجاتے ہیں ؎

تمتع زہر گوشۂ یافتم زہر خرمنے خوشۂ یافتم

(۱۵) زبان کی آفت سے محفوظ رہنے کی ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ جو کوئی اس آفت سے محفوظ رہنا چاہے، وہ تازہ دم وضو کرے، دو رکعت نماز نفل پڑھے، پھر قبلہ رو بیٹھ کر جناب باری میں عرض کرے الٰہ العٰلمین! میری زبان کو یاوہ گوئی سے محفوظ رہنے کی توفیق نصیب فرمایئے اور یہ وصف عنایت فرمایئے کہ ذکر الٰہی کے سوا کوئی ذکر زبان پہ نہ آئے اور ان باتوں سے میری زبان کو اپنی پناہ میں رکھیے جو آپ کے رضا کے خلاف ہیں (۲۳)

سچ یہ کیا ہے، یہ معاشرے ہی کی عکاسی ہے، غیبت و بدگوئی کی بدولت جنگ و پیکار کا جو بازار گرم تھا یہ اسی کا سد باب ہے، اسرار الاولیاء میں قدم قدم پر سماجی اور تہذیبی زندگی کا نہ صرف سراغ ملتا ہے، بلکہ سماجی خرابیوں کی اصلاح کی تدابیر بھی ملتی ہیں، مگر دیکھنے کے لیے دیدۂ بینا درکار ہے ؎

بے بصیرت بیہ راز کیا جانے

(۱۶) اے درویش نکوکاری کا راز سربستہ یہی ہے کہ انسان اپنی نفسانی خواہشات کو قابو میں رکھے، طبیعت کے تقاضوں سے کنارہ کش رہے، اور دنیاوی لذتوں میں مبتلا نہ ہو۔

یہ بھی وہی ہے، جس سے معاشرہ مسموم تھا، آج بھی جن کے ایٹی کیٹ (Etiquette) دنیاوی مشاغل میں جن سے انھیں دم بھر کو مہلت نہیں ملتی، ان کا ذکر کیا، ان کا تصوف اور ان کی شریعت تو خواہشات ہی خواہشات ہیں۔

(۱۷) اے درویش سعادت کی نعمت جس کسی نے پائی ہے خدمت خلق ہی سے

پائی ہے، دین و دنیا کی فلاح و بہبود مشائخ کی خدمت میں ہے، (٢٧)

؎ ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد ــــــــــ بلاشبہ مشائخ کی خدمت بڑی سعادت

ہے۔ ؏ طریقت بجز خدمت خلق نیست

مگر اب مشائخ ہیں کہاں جو ان کی خدمت سے دین و دنیا کی نعمتوں سے بہرہ مند ہو سکیں،
علامہ اقبال بتا گئے ہیں ؎

میراث میں آئی ہے انھیں مسند ارشاد 	زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

(١٨) صوفی وہ ہے جو دنیاوی آلائشوں سے پاک و صاف ہے، جس کا آئینۂ دل مکدر یا زنگ آلود ہے، وہ صوفی نہیں۔

(١٩) صوفی وہ ہے جس کا آئینۂ دل صاف و شفاف ہو، حتیٰ کہ ہر شے اس میں منعکس ہو جائے، کچھ بھی پوشیدہ نہ رہے۔

(٢٠) تصوف سے مراد خدا کی دوستی ہے، نور وحدت کے سوا دل میں اور کچھ بھی نہ ہو۔
یہی صفائے باطن ہے، گو لفظ مختلف ہیں، مگر مفہوم واحد ہے، اللہ ہی کی دوستی و محبت سے قلب آئینہ ہو جاتا ہے، حدیث مبارکہ ہے کہ اللہ کے ذکر سے، قرآن کی تلاوت سے، اور موت کی یاد سے آئینۂ دل کا زنگ چھوٹ جاتا ہے، اور دل آئینہ بن جاتا ہے۔

(٢١) حیات علم میں ہے، راحت معرفت میں ہے، شوق محبت میں ہے اور ذوق یاد میں ہے۔ (٥٥)
علم و معرفت اور محبت و یاد سے مراد علم الٰہی، محبت الٰہی اور یاد الٰہی ہے اور یہ کیفیات سے متعلق کلام ہے۔

(٢٢) کوئی عبادت تلاوت قرآن سے بہتر نہیں، اس سے غفلت روا نہیں۔ (٢١)
اولیاء اللہ تلاوت کلام پاک میں اکثر محو رہتے تھے، اور رات دن میں کئی کئی قرآن پاک ختم کر لیا کرتے تھے۔

(٢٣) قرآن پاک کی تلاوت کے دوران حضوری اور مشاہدے کی نعمت نصیب

ہوتی ہے، اور عالمِ بالا کے راز بھی تلاوت کرنے والے پر منکشف ہوتے رہتے ہیں (۲۱)

اللہ پاک قرآنِ پاک کی تلاوت کی سعادت نصیب فرمائیں، اور ایسی توفیق عنایت فرمائیں کہ حقِ تلاوت ادا ہو جائے تو پھر سب ہی کچھ ہے۔

(۲۴) بھوک کیا ہے، ابرِ رحمت ہے، جس سے رحمت ہی رحمت برستی ہے۔

حضرت بابا صاحبؒ نے حضرت محبوبِ الٰہیؒ کو نصیحت فرمائی تھی "روزہ داشتن نیمے راہ است و اعمالِ دیگر چوں نماز و حج (نفلی) نیمے راہ" (سیر الاولیاء ص ۱۲۴ پ ح)

(۲۵) ضرورت مندوں کی خدمت میں مشغول رہنا، اوراد و وظائف سے افضل ہے (۵۵)

یہی راہِ سلوک ہے کہ ع طریقت بجز خدمتِ خلق نیست، یہی انسانیت کا اعلیٰ وصف ہے، یہی حضرت بابا صاحبؒ کا عمل تھا۔ حضرت محبوبِ الٰہیؒ کا ارشاد ہے کہ حضرت بابا صاحبؒ کا دستور یہ تھا کہ عصرؔ کی نماز کے بعد بھی اگر ضرورت مند ہوتے یا آجاتے تو درود وظائف میں مشغول نہ ہوتے بلکہ ضرورت مندوں کی سنتے اور ان کے دکھ درد کا درماں فرماتے، حالانکہ عصر و مغرب کا درمیانی وقت صوفیائے کرام کے لیے مشغولیِ خاص کا وقت ہے، اس وقت یادِ الٰہی کے سوا اور کسی طرف متوجہ نہیں ہوتے، مگر حضرت بابا صاحبؒ فرماتے تھے "یکے بر سرِ راہ محتاج بود و او مشغول بود و ماند در چنیں حالتے اگر کسے بہ وردے مشغول باشد چہ ذوق یابد" (سیر الاولیاء ص ۴۴۳ پ ح) ضرورت مند موجود ہوں تو درود و وظائف میں دل کیسے لگے گا کہ ان کے دکھ درد کا احساس مشغولی میں مانع رہتا ہے اس ذکر کے بعد حضرت محبوبِ الٰہیؒ نے یہ شعر بھی پڑھا تھا ؎

در کوئے خرابات و سرائے او باش   مئے نہ بود بیا و بنشیں و بباش

(۲۶) سجادۂ طریقت اس کے لیے ہے، جو متوکلانہ بسر کرتا ہے، مخلوق میں سے کسی سے

لے مولوی غلام احمد خاں بریاں مرحوم نے ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء میں سیر الاولیاء کا اردو میں ترجمہ کرکے شائع کیا تھا اور اردو سیر الاولیاء نام رکھا تھا جو اب کمیاب ہے، اس میں انھوں نے نمازِ دیگر کا ترجمہ ظہر کی نماز کیا ہے جو صحیح نہیں ہے، فارسی میں ظہر کی نماز کو نمازِ پیشیں اور عصر کی نماز کو نمازِ دیگر کہتے ہیں، لاہور (پاکستان) میں آج تک یہ لفظ اسی طرح مستعمل ہے اور اہلِ پنجاب کی زبان پر ہے۔ بریاں مرحوم کی اردو سیر الاولیاء اب پاکستان سے شائع ہو گئی ہے

توقع نہیں رکھتا، اگر ایسا نہیں تو وہ لائق سجادۂ طریقت نہیں ہے مدعی دروغ زن ہے(۴۱)
آج اس کے برعکس عمل ہے، جو جتنا فراہمی زر میں مشغول اور امراء کی دریوزہ گری کرتا پھرتا
ہے، اتنا ہی وہ کامیاب سجادہ نشیں ہے اور معزز و محترم ہے۔

(۴۷) اے درویش بیماری اچھی چیز ہے اس کی وجہ سے انسان پاک و صاف ہو جاتا ہے(۴۲)
بیماری میں انسان اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس کو فریاد رس سمجھتا ہے، اس سے یقین کو
تقویت حاصل ہوتی ہے، اعتماد باللہ کو استحکام نصیب ہوتا ہے، جو بڑی اہم چیز ہے،

(۴۸) درویشی کے روپ میں جو طلب دنیا میں مبتلا ہے، طلب جاہ و منزلت میں کوشاں ہے
وہ درویش نہیں گمراہ ہے، اور گمراہی کے دشت و بیابان میں مارا مارا پھرتا ہے (۴۳)
درویش صورت رہزن پیر بہروپیا سے دور ہی رہنا چاہیے، ان کے جال میں پھنسنا خسر الدنیا
والآخرہ ہے، مولانا روم نے فرمایا ہے ؎

اے بسا ابلیس آدم روئے است　　　پس بہر دستے نہ شاید داد دست

یہ ہیں معدودے چند جواہر پارے جو اسرار الاولیاء کے اوراق کی زینت ہیں، پوری کتاب
ایسے ہی جواہر پاروں سے مالا مال ہے، پوری کتاب میں کوئی ایسی روایت یا کوئی مقولہ ایسا نہیں
جو آئین شریعت و اصول طریقت یا عقائد اہلسنت والجماعت کے خلاف ہو، اس سے یہ بھی واضح
ہے کہ حوادث روزگار سے دوچار رہنے کے باوجود اور عقیدتمندوں کی سخت بے اعتنائی کے باوجود
اسرار الاولیاء بے پناہ قدر و منزلت کی مستحق ہے، اور اس سے کیا کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے،
اخلاق و معاشرے کی اصلاح کے لیے اس میں وہ کچھ ہے جو ہمیں درکار ہے، اللہ پاک اکتساب
کی توفیق عنایت فرمائیں، آمین ثم آمین۔

بعض اہم ترین روایتیں | کتب ملفوظات کا مطالعہ شاہد ہے کہ بظاہر کتب ملفوظات کی روش
میں نمایاں فرق نہیں ہے، نقطۂ نظر ایک ہی ہے، اور وہ یہ ہے کہ انسان قرآنی تعلیمات
کی راہ نمائی کے سہارے خدا رسیدہ ہو جائے، جو واحد ذریعہ ہے، خدا رسی کا، اصلاح خلق،

معاشرے کا سدھار، انسانی ہمدردی، غرض جو بھی کچھ ہے، اسی کے فروعات ہیں، اسلام کا بنیادی نقطۂ نظر یہی ہے، جو کلمہ لا الٰہ الا اللّٰہ سے تعبیر کیا گیا ہے، اور جو کچھ ہے وہ اسی کی فروعات و ثمرات ہیں، صوفیائے کرام اسی روش پر کار بند رہے، جس کی بدولت معاشرہ میں سدھار آیا اور انسانیت نے فروغ پایا۔

بہر حال جب کتب ملفوظات کو نظر تعمق سے مطالعہ کیا جاتا ہے، تو ہلکا سا امتیاز ملتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ جن ملفوظات کے سامعین میں کوئی ایسی شخصیت بھی ہے جسے مخلوق کی خدمت و رہنمائی اور شیخ کی جانشینی کی ذمہ داری سونپنی ہے، تو ان میں کچھ ایسی بھی روایتیں ہیں کہ سطحی نگاہ ان کی کنہ کو نہیں پہنچتی، اور ان کی تفہیم سے وہ قاصر رہتے ہیں، جو ذوق تصوف سے لذت آشنا نہیں ہوتے، اور تردد بے جا میں مبتلا ہو کر راہ حق سے دور پڑ جاتے ہیں، واللّٰہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم ط

اسرار الاولیاء میں بھی ایسی روایتیں ہیں جن کی تفہیم سے خصوصاً مادہ پرست اذہان قاصر رہتے ہیں ان ہی میں سے بعض کو پیش کیا جاتا ہے، اور مناسب حل طریق تفہیم کی یا اس کے پس منظر کی وضاحت اور ان نکات کی موشگافی کی کوشش کی جاتی ہے، جو تفہیم میں قدرے حائل ہو سکتی ہیں جو دراصل تل اوجھل پہاڑ کی مصداق ہیں:-

روایت نمبر ا | مولانا بدر الدین اسحاق لکھتے ہیں:-

"غلبات شوق میں حضرت بابا صاحبؒ نے یہ حکایت بیان فرمائی کہ جب حضرت یوسفؑ نے حضرت زلیخا کو چاہا اور بلایا تو وہ آئیں اور انھوں نے دین یعقوب علیہ السلام کو قبول کیا اور اللّٰہ پاک کی عبادت میں مشغول رہنے لگیں کہتے ہیں کہ ایک دن حضرت یوسفؑ نے ان سے خلوت چاہی تو وہ بھاگیں حضرت یوسفؑ نے ان کا پیچھا کیا اور پکڑ لیا، اور ان سے کہا کہ یہ کیا بات ہے کہ پہلے تو تم میرا پیچھا کرتی اور مجھے پکڑتی تھیں، اب میں چاہتا ہوں تو تم مجھ سے بھاگتی ہو، حضرت

زلیخا نے کہا کہ اے یوسفؑ جب تو میں خدا سے ناواقف تھی، اور تمہارے سوا مجھے
کسی سے محبت و نسبت نہ تھی لیکن اب میں نے رب کو پالیا ہے، اب میں اسی کی
عبادت و پرستش میں لگی رہتی ہوں، مجاہدے سے مجھے مشاہدے کی نعمت نصیب
ہوگئی ہے، اس کی محبت نے میرے دل میں گھر کر لیا ہے، اے یوسفؑ اب تم
اور تم سے لاکھوں درجے افضل بھی کوئی ہو تو وہ بھی میری نظر میں سما نہیں سکتا
پھر جب مجھے اللہ سے محبت ہوگئی اور میں اس کی ہوگئی ہوں تو اگر میں کسی اور
سے محبت کرنے لگوں تو میں دروغ گو اور جھوٹی ہوں، اور محبت میں یہ بات زیبا نہیں"۔

مقصد واضح ہے کہ اللہ کا ہونے کے بعد کسی اور کی چاہت یا طلب ہرگز مناسب نہیں، بلکہ ماسوا اللہ
کی طلب رہتی ہی نہیں یہی تو توحید خالص ہے اور یہی محبت اس کی اجازت نہیں دیتی کہ اور کسی
سے وابستگی رکھی جائے، بیان واقعہ سے واقعہ ہی مراد نہیں ہوتا بلکہ اس کا اثر و نتیجہ بھی مراد ہوتا
ہے، اس واقعہ سے مقصود اخلاص اور استحکام محبت الٰہی کا اظہار ہے اور بس! یہ حکایت قبل از
تاریخ واقعات سے متعلق ہے، اس پر تاریخی واقعہ کا اطلاق نہیں ہوتا، فن تاریخ کا آغاز مسلمانوں
کا مرہون منت ہے، دانشوران یورپ کو بھی اس کا اعتراف ہے، اس روایت کو تاریخی واقعہ سے
تعبیر کرنا عجز و واقفیت کی علامت ہے البتہ اس کا تعلق اسرائیلیات سے ہے، قرون اولیٰ میں
علماء یہود جو مسلمان ہوگئے تھے وہ قصص القرآن کے متعلق اسرائیلی روایات کو بھی بیان کرتے تھے
لہٰذا اگر وہ روایات کفر و شرک کی آمیزش سے پاک ہیں تو انھیں اپنا لینے میں کوئی مضائقہ نہیں،
ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:-

حدثوا عن بنی اسرائیل	بنی اسرائیل کی روایات نقل کرو
ولا حرج،	اس میں کوئی حرج نہیں ہے،

اس ارشاد کی تکمیل میں ہمارے علمائے مفسرین نے متعدد روایتیں بنی اسرائیل سے
نقل کی ہیں یہ بھی ان ہی میں سے ہے، سورہ یوسف کی تفسیر پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں

اس روایت کو اپنایا گیا ہے۔ ہمارے مشائخ کرام نے بھی اعتنا فرمایا ہے، برصغیر ہند و پاک کے سب سے پہلے مشہور و مقبول اسلامی مبلغ عالم و درویش کامل حضرت داتا گنج بخش لاہوری رحمۃ اللہ علیہ (سید علی ہجویری) نے لکھا ہے۔

"چوں یوسف با یعقوب رسید خدا وند دیرا وصال یوسف کرامت کرد، زلیخا را جوان کرد باسلام راہ نمود، و بیانی یوسف داد، یوسف قصد وے کرد، زلیخا از وے گریخت (کشف المحجوب) ۲۹۴"

حضرت بابا صاحبؒ نے بھی ذکر فرمایا ہے جو عارف کامل اور بے مثل عالم شریعت و طریقت تھے، مولانا عبدالرحمٰن جامی نے مثنوی یوسف زلیخا میں کمال شستگی سے اس واقعہ کو بیان فرمایا ہے، یہ مثنوی مدارس اسلامیہ میں مدتوں سے داخل درس ہے مولانا جامی وہ جلیل القدر عالم بلکہ عالم گر ہیں جن کی شرح جامی اسلامی درس گاہوں کے نصاب میں مدت مدید سے شامل اور آج تک داخل نصاب ہے، جسے پڑھ کر طالب علم عالم بنتے ہیں۔

ہمارے لیے اتنا ہی بہت ہے کہ ہمیں یہ روایت ثقہ بزرگوں سے پہنچی ہے، ہمیں اس سے بحث نہیں کہ یہ روایت آج یہودیوں کے علمی ذخیرے میں ہے یا نہیں ہے، کیونکہ رد و بدل ان کی دیرینہ عادت ہے، اسی کی بدولت وہ کتاب مقدس توریت کو بھی محفوظ نہیں رکھ سکے ہیں، رب العلمین کا یہ ارشاد ہے یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ اور قدیم علماء یہود میں سے کسی نے انکار بھی نہیں کیا ہے پھر ثقہ بزرگوں کی روایت کو ہر اعتبار سے ترجیح ہے، اس روایت کے متعلق اتنی ہی معلومات مناسب ہے، جس سے اس کی نوعیت و اہمیت واضح ہے۔

اس روایت میں کئی جملے ایسے ہیں جو روایت کی جان اور روح رواں ہیں، اور ایسے ہی بزرگ کے فرمودہ ہو سکتے ہیں جو توحید و حق شناسی کی نعمت سے مالا مال ہو، ان جملوں کو دہرائیے اور ان کی نورانیت اور کیف سے لطف حاصل کیجئے، عجیب پر کیف جملے ہیں۔

ایں زماں کہ حق تعالیٰ را بشناختم۔ در پرستش او مشغول شدم ــــ از مجاہدہ او بجناب او تاختم ــــ چوں مرا حق تعالیٰ لذت شد ــــ اگر عبادت با غیرے او لذت

گیرم — مدعی دروغ زن بودم —

یہ شواہد سراسر موٴلف سے پڑے بول رہے ہیں کہ اسرار الاولیا کا انتساب حضرت بابا صاحبؒ سے بلاشبہ صحیح اور درست ہے۔

روایت نمبر ۲ حضرت بابا صاحبؒ نے فرمایا کہ ایک دفعہ یہ دعا گو حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشیؒ اور قاضی حمید الدین ناگوریؒ کے ساتھ محفل سماع میں تھا، سماع ہو رہا تھا، دونوں بزرگ سماع میں محو تھے، ایک شبانہ روز رقص فرماتے رہے، البتہ نماز کے وقت نماز پڑھ لیتے تھے، کیف کے دوران میرا ہاتھ پکڑا اور محوِ کیف ہو گئے، اور رقص فرمانے لگے، گانے والے جو قصیدہ گا رہے تھے وہ یہ تھا۔

من آں نیم کہ ز عشق تو پائے پس آرم	اگر بہ تیغ کشندم ز در تو نہ گذارم
مپرس از شبِ ہجراں چگونہ می گزرد	مباد ہیچ کسے را قولیت وشوارم
من از جمالِ تو اے سرو باغ نادیدم	ہوس نہ شد کہ گہے دل رود بگلزارم
اگر دہند بعوض دا بہشت با ہمہ چیز	بجبہ نخرم من کہ مست دیدارم

اس روایت سے واضح ہے کہ اتباعِ شریعت ان حضرات کی طبیعت ثانیہ تھی، اور اتباع کا ملکہ ایسا راسخ اور پختہ تھا کہ کیسی ہی کیفیت ہو نماز بروقت ادا فرماتے تھے، جو مجوبہ روزگار ہے، نماز دین کا ستون ہے، اگر ستون ہی برقرار نہ رہے تو دین و ایمان کہاں، تصوف کی معراج یہی ہے کہ صوفی عامل شریعت ہو، اگر یہ نہیں تو خاک بھی نہیں۔ اس روایت میں بروقت نماز پڑھنے کی عملی ترغیب و تحریص ہے، ممکن ہے کہ بے نمازیوں کو اس سے وحشت ہوتی ہو اور وہ اسے اقوال نامناسب میں شمار کرتے ہوں یا در ہوا شدند کے غلط معنی سے کوئی متاثر ہو (جس کی وضاحت حاشیہ میں ہے) ورنہ اس میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے، سادہ وصاف ہے، اور احوال صوفیہ کے مطابق ہے۔

---

۱ اسرار الاولیاء ص ۸-۹ ۲ در ہوا شدند کے معنی یہ ہیں کہ ذوق و شوق میں کھڑے ہو گئے۔ یہ ترجمہ غلط ہے کہ اڑنا شروع کیا یا ہوا میں کھڑے ہو گئے۔

روایت نمبر ۳ حضرت باباصاحبؒ نے فرمایا کہ یہ دعاگو اور برادرم مولانا بہاؤ الدینؒ زکریا ملتانی ایک جگہ بیٹھے ہوئے سلوک کی باتیں کر رہے تھے، ذرا دیر بعد برادرم بہاء الدین اٹھ کھڑے ہوئے زار وقطار رونے لگے اور کہا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ۔ میں نے کہا کیا بات ہے؟ انھوں نے کہا اٹھو اور دیکھو، میں اٹھ کھڑا ہوا، دیکھتا ہوں کہ دروازۂ بغداد سے شیخ سعدالدین حمویہؒ کا جنازہ لائے ہیں اور بغداد کی جامع مسجد کے سامنے نماز جنازہ پڑھ رہے ہیں۔ (اسرار الاولیاء ص ۱۱۱)

یہ روایت سادہ وصاف ہے۔ اس میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے، البتہ سطحی علم رکھنے والوں کو دو اشکال لاحق ہو سکتے ہیں، ایک تاریخی اندراج سے متعلق اور دوسرا بصیرت باطنی سے متعلق۔ تاریخی خلفشار اندراج سے متعلق یہ دو نکات ذہن نشین رکھنے چاہئیں (۱) اسرار الاولیاء کا عہد تدوین ۶۵۶ھ (1258) تا ۶۶۹ھ (1270) ہے، البتہ اس کتاب کے آغاز میں جو ۶۳۱ھ (1233) لکھا ہے وہ غلط اور محرف ہے۔ (۲) شیخ سعدالدین حمویہؒ کے سال وفات کے متعلق حضرت محبوب الٰہیؒ کے ارشاد سے رہنمائی حاصل کرنی چاہیے، حضرت والا کا ارشاد ہے:۔

"اول شیخ سعدالدین حمویہؒ نقل کرد، بعد از دو سہ سال شیخ سیف الدین باخرزیؒ — بعد از دو سہ سال شیخ بہاء الدین زکریاؒ — بعد از دو سہ سال شیخ فریدالدین رحمۃ اللہ علیہم، (سیر الاولیاء ص ۱۹۰ و فوائد الفواد ص ۱۴۳)

پہلے شیخ سعدالدین حمویہؒ نے انتقال فرمایا، ان سے تین سال بعد شیخ سیف الدین باخرزیؒ نے انتقال فرمایا، ان سے تین سال بعد شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے انتقال فرمایا، ان سے تین سال بعد حضرت باباصاحبؒ نے انتقال فرمایا۔ رحمۃ اللہ علیہم

تذکروں میں جو سنین مرقوم ملتے ہیں، وہ عموماً سماعی اور خلاف تحقیق ہوتے ہیں اسی لیے وہ مختلف بھی ہیں ان پر بلا تحقیق اعتماد نہیں کیا جا سکتا، حضرت محبوب الٰہیؒ کے ارشادات کے مطابق اور بروئے تحقیق حضرت باباصاحبؒ کا سن وفات ۶۷۰ھ (1271) ہے۔ ۶۶۴ھ (1265) وغیرہ

لہ جرنل آف سکھ اسٹڈیز امرتسر اگست ۱۹۶۷ء ص ۷۳ تا ۹۳ معارف اعظم گڑھ مارچ ۱۹۷۱ء ص ۱۹۴ تا ۱۹۷

سنین غلط اور بالکل غلط ہیں۔

شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کا سنہ وفات بروئے تحقیق ۶۶۶ھ/1268ء ہے جو حضرت محبوب الٰہیؒ کے مذکورہ بیان کے مطابق ہے، ۶۶۱ھ/1262ء غلط اور نہایت غلط ہے۔

شیخ سیف الدین باخرزیؒ کا سنہ وفات حضرت محبوب الٰہیؒ کے ارشاد کے مطابق اور حضرت بابا صاحبؒ کے سنہ وفات کی مطابقت میں ۶۶۴-۶۶۳ھ/1266-65ء ہے،

شیخ سعد الدین حمویہؒ کا سنہ وفات بھی حضرت محبوب الٰہیؒ کے ارشاد کے مطابق اور حضرت بابا صاحبؒ کے سنہ وفات کی مطابقت میں ۶۶۱-۶۶۰ھ/1261-62ء ہے، سنہ ۶۵۹ھ/1261ء یا ۶۵۵ھ/1257ء یا ۶۵۰ھ/64 غلط اور بالکل غلط ہے۔

حضرت محبوب الٰہیؒ بصیرت باطنی سے مالا مال اور کثیر المطالعہ بزرگ تھے، تذکروں میں نوشتہ سنین کے غیر مستند ہونے کا یقیناً انھیں احساس تھا، تعجب نہیں کہ اسی احساس کی بنا پر ان بزرگوں کے انتقال کے باہمی فصل کا ذکر فرما دیا آپ نے مناسب سمجھا اور جو کچھ آپ کے ارشاد کے مطابق ہے وہ حرف حرف صحیح ہے، تذکروں میں جو سنین لکھے ہیں ان پر بلا تحقیق اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

اسرار الاولیاء کے عہد تدوین سے متعلق تحقیق سے بتایا جا چکا ہے کہ اس کا عہد تدوین ۶۵۶ھ/1258ء تا ۶۶۹ھ/1270ء ہے، لہٰذا جن بزرگ کا انتقال ۶۶۰ھ میں ہوتا ہے تو ان کا ذکر ۶۵۶ھ تا ۶۶۹ھ/1270ء کی نوشتہ کتاب میں ہونا صحیح اور بالکل صحیح ہے، لہٰذا اسرار الاولیاء میں شیخ سعد الدین حمویہؒ کی وفات کا ذکر صحیح اور برمحل ہے، اس میں اختلاف و تردد کی گنجائش نہیں ہے۔

دوسری مشکل جو سطحی علم رکھنے والوں کو لاحق ہو سکتی ہے، وہ یہ ہے کہ شیخ الاسلام شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے اور حضرت بابا صاحبؒ نے شیخ سعد الدین حمویہؒ کے نماز جنازہ کے منظر کو کیسے دیکھ لیا تھا، اس کا تعلق بصیرت باطنی سے ہے، مختصراً اتنا ہی عرض کر دینا کافی ہے کہ یہ مشہور و معتبر روایت ہے کہ حضرت ساریہؓ مصر میں قبطیوں سے جنگ فرما رہے تھے، امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مدینہ منورہ میں جمعہ کی نماز کا خطبہ دیتے ہوئے فرمایا یا ساریۃ الجبل[1]

[1] مسالک السالکین جلد ۲ ص ۳۸۸

حضرت ساریہؓ حضرت عمرؓ کی آواز سے متنبہ ہوتے، پہاڑ کی طرف رخ کیا، جہاں قبطی چھپے ہوئے تھے اور اس انتظار میں تھے کہ حضرت ساریہؓ کا لشکر آگے نکل جائے تو پیچھے سے یہ حملہ کر دیا اور شکست خوردہ مصری فوج پلٹ کر مقابلہ کرنے لگے اسی طرح تکبیر کر اسلامی لشکر کو شکست دے دیں، واقعہ سے آگاہی اور حضرت ساریہؓ کو متنبہ فرمانا اور حضرت ساریہؓ کا یقین و اعتماد اور تعمیل ارشاد، اسی پر شیخ بہاء الدین زکریاؒ اور حضرت باباصاحبؒ کی حضرت شیخ سعد الدین حمویہؒ کے واقعہ وفات کو قیاس کر لینا چاہیے، ورنہ یہ تصوف کا اہم مسئلہ ہے تا وقتیکہ مادیت کے پردے مرتفع نہ ہوں، اس کی حقیقت تک رسائی نہیں ہو سکتی، ان اشکال کے رفع ہونے کے بعد اس روایت کو درست مان لینے میں کوئی شے مانع نہیں رہتی، حدیث مبارکہ سے بھی بصیرت باطنی کی تائید ہوتی ہے۔ اِتَّقُوْا فِرَاسَتَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّہٗ یَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰہِ۔

روایت نمبر ۴ حضرت باباصاحبؒ نے فرمایا کہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشیؒ جب تلاوت قرآن پاک فرماتے اور کسی آیت وعید (عذاب کی آیت) پر پہنچتے تو سینے پر ہاتھ مارتے اور بے ہوش ہو کر گر جاتے تھے، جب ہوش میں آتے تو پھر قرآن پاک کی تلاوت میں مشغول ہو جاتے اور اس طرح دن میں ہزار بار بے ہوش ہونے اور ہوش میں آتے تھے، (روزے ہزار بار بیہوش آمدے) اسی طرح جب آپ آیت مشاہدہ (دیدارِ الٰہی کی آیت) پر پہنچتے تو مسکراتے اور اٹھ کھڑے ہوتے اور عالم مشاہدہ میں متحیر رہتے، ایک رات دن عالم مشاہدہ میں ایسے متحیر رہتے کہ اپنی بھی خبر نہ رہتی۔[1] یہ مخصوص ترین کیفیت ہے، جو عام حالات سے ممیز ہے۔ اس کا تعلق مراتب سلوک سے ہے۔ اور ہر کس و ناکس کی فہم سے بالاتر ہے۔

تو نظر باز نہ ور نہ تغافل نگہہ ست　　　تو زبان فہم نہ ور نہ خموشی سخن ست

اس کا احساس تو کیا جا سکتا ہے، مگر اصل کیفیت کو نہ گرفت میں لایا جا سکتا ہے، اور نہ بیان کیا جا سکتا ہے، کیفیات کی ترجمانی قوت بشری سے باہر ہے، اس میں یہی راز پنہاں ہے،

[1] اسرار الاولیاء ص ۳۳

اہل زبان کی روش سے کم آگاہی ہزار بار پر بھی انگلی دھرے گی مگر سمجھ لینا چاہیے کہ عرف عام میں ہزار سے مراد گنتی نہیں کثرت ہے، مرزا غالب کہہ گئے ہیں ؂

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

محاورے میں کہتے ہیں ہزار بار کہا یا باز نہ آئے، اب کچھ تو اس کا خمیازہ' یہ بھی ہے کہ ایسی حالت میں گنتی گنی ہی نہیں جاتی، قرینے ہی سے کہہ دیا جاتا ہے، مراد ہوتی کثرت، اس روایت میں بھی دو نکتے تھے جو حل ہو گئے، ورنہ ہر دانش ور ہر اعتبار سے روایت کی معنویت اور اسلوب کی لطافت کو تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

روایت نمبر ۵ حضرت بابا صاحبؒ نے فرمایا کہ کل قیامت کے دن جب عاشقوں کو مقام تجلی میں لایا جائے گا تو حکم ہوگا کہ آنکھیں کھولو، پھر عاشقوں سے ہر ایک کو آگے لایا جائے گا، اور ہر ایک پر ہر بار تجلی ہوگی، وہ سات ہزار برس بے ہوش رہیں گے، جب ہوش میں آئیں گے تو فریاد کریں گے، ھل من مزید، ان پر پھر تجلی ہوگی، ستر مرتبہ ایسا ہی ہوگا، پھر وہ اپنی جگہ آجائیں گے، حضرت بابا صاحبؒ نے یہ بیان فرمانے کے بعد آہ کی اور بے ہوش ہو گئے اور بے ہوشی کے عالم میں یہ رباعی پڑھی ؂

از بہر رخ تو مبتلا می باشم
اندر غم عشق در بلا می باشم
در یاد جمال تو چناں مدہوشم
کز خود خبرے نیست کجا می باشم[1]

اس بیان کا اور اس روایت کا تعلق عالم بقا سے ہے، جو اس عالم فنا سے مختلف ہے، یہ مادی ہے، اور وہ غیر مادی، وہاں کی کیفیات کو اس عالم کی مشابہت سے بیان کرنا ہوتا ہے، لیکن جو کچھ بیان کیا جاتا ہے وہ تشبیہ و تمثیل سے منزہ ہوتا ہے، بے ہوشی سلوک کی اصطلاح ہے، اس حالت میں سالک صفات ذات میں محو ہوتا ہے، اسی سے عالم جاتی کی اس کیفیت کا احساس کیا جا سکتا ہے، جسے بے ہوشی سے تعبیر کیا ہے، اس کی نہید کا تعلق عرفا سے ہے ہر کس د

[1] اسرار الاولیاء ص ۳۴

ناکس سے نہیں ہے، یہ ایسی بات ہے کہ منطق و فلسفہ کی اصطلاحات کو علمائے منطق و فلسفہ ہی جانتے ہیں، جو ان علوم سے آگاہ نہیں وہ نہیں جانتے۔

دوسری چیز ہے طول مدت ـــ اس کا تصور واقعہ معراج سے کیا جاسکتا ہے کہ یہاں بستر بھی گرم رہا، کنڈی بھی ہلتی رہی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قاب قوسین او ادنیٰ کی سیر بھی فرمالی، ان نکات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس روایت کو سمجھا جاسکتا ہے، ورنہ ناآشنائے تصوف اس کی فہم سے قاصر رہتے ہیں، وہ کچھ بھی کہیں ان کا کہنا معتبر نہیں ہے

تلقین درس اہل نظر یک اشارت است کردم اشارتے و مکرر نمی کنم

روایت نمبر ۶ | حضرت بابا صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ دعاگو اور خواجہ قطب الدین بختیار اوشیؒ ملک بالا[1] کی طرف سفر میں تھے، سوتہ نامی دریا کا کنارہ تھا، ہم دونوں جب وہاں پہنچے تو وہاں کوئی کشتی نہ تھی جس سے ہم پار جاتے، مقام بھی خوف کا تھا، حضرت خواجہؒ نے فرمایا، فریدؔ آؤ پار چلیں، میں نے عرض کیا زہے سعادت، مگر دل میں یہ بات آئی کہ کشتی تو ہے نہیں، پار کیسے ہوں گے، دل میں یہ خطرہ گزرا ہی تھا کہ اپنے کو اور حضرت خواجہ صاحبؒ کو دریا پار کھڑے دیکھا، موقع ملا تو میں نے دریافت کیا کہ ہم کیسے پار ہوگئے تھے، آپ نے فرمایا کہ جب دیکھا کہ دریا کے کنارے کشتی نہیں ہے تو میں نے سورۂ اخلاص (قل ھو اللّٰہ احد) پڑھ کر دریا پر دم کیا دریا شق ہوگیا، اور ہم چلے آئے۔ (اسرار الاولیاء ص ۷۳)

پوری حکایت سادہ اور عام فہم ہے، البتہ دریا کا راستہ دینا خوارق عادت میں سے ہے لیکن صوفیائے کرام کے حالات میں ایسے واقعات بکثرت ملتے ہیں، اور ان کتابوں میں ملتے ہیں جنھیں اولیا دشمن نہایت درجہ مستند اور ادب صوفیہ میں بے مثل مانتے ہیں گویا کہ ایسے واقعات صوفیہ کے معمولات میں سے ہیں عجائبات میں سے نہیں ہیں اس سلسلے میں عصائے موسیٰؑ اور رود نیل کا واقعہ بھی ذہن نشین رہنا چاہیے۔

---

[1] فوائد الفواد (ص ۱۹۳) کی عبارت سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ ملک بالا سے مراد بلخ و کاشان وغیرہ ہیں۔

امیر خورد کرمانی لکھتے ہیں کہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشیؒ نے فرمایا کہ ایک دفعہ میں اور قاضی حمید الدین ناگوریؒ دریا کی طرف سفر میں تھے ..... ہم نے دریا پار جانا چاہا کشتی تھی نہیں، ہم نے دعا کی تو بحکم خدا دریا نے ہمیں راستہ دے دیا' آپ کا مبارک بیان یہ ہے:-

دست بدعا بردیم بفرمان خدائے تعالیٰ	ہم نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے خدا کے
دریا دو شق شد' زمین خشک پیدا شد'	حکم سے دریا شق ہو گیا' خشک زمین
ما بگذشتیم۔ (سیر الاولیاء ص ۵۲ چ)	نکل آئی اور ہم دریا پار چلے گئے۔

امیر خورد کرمانیؒ نے خواجۂ بزرگ خواجہ معین الدین حسن سجزیؒ کی زبانی نقل کیا ہے:-

خواجہ معین الدین حسن سجزیؒ طیب اللہ	خواجۂ بزرگ خواجہ معین الدین حسن
مضجعہ می فرمود کہ وقتے من بیار خواجہ	سجزی فرماتے تھے کہ ایک دفعہ میں خواجہ
عثمان ہرونیؒ در سفر بودم در کنارہ دجلہ	عثمان ہرونیؒ کے ہمراہ سفر میں تھا'
رسیدیم کشتی نبود' خواجہ عثمان قدس	جب ہم دریائے دجلہ کے کنارے
اللہ سرہ العزیز فرمود کہ چشم پیش کن'	پہنچے تو وہاں کشتی نہ تھی' خواجہ عثمان
چشم پیش کردم' خواجہ را و خود را	ہرونیؒ نے فرمایا' آنکھیں بند کر لو'
در گذر رائے دجلہ دیدم' از خواجہ	میں نے آنکھیں بند کر لیں' آنکھیں
عثمان قدس اللہ سرہ العزیز	کھولیں تو دیکھا کہ ہم دونوں دریا
پرسیدم کہ شما ایں چہ کردید' فرمود	کے پار ہیں' میں نے عثمان ہرونیؒ
چند بار سورۃ فاتحہ خواندم'	سے دریافت کیا تو فرمایا میں نے
(سیر الاولیاء ص ۴۴ چ)	چند بار سورہ الحمد شریف پڑھی تھی۔

مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے ذکر میں فرمایا:-

از دے روایت کردہ اند' پیرش ہفتاد	وہ یہ بیان کرتے تھے کہ میرے پیر کے
مرید تارک داشت' پوشش ایشاں	ستر مرید تارک دنیا تھے' ان کا لباس

میزری وعرق چین وریر کلاہ بر سراو	تہمد تھا اور بدن میں عرق چین یعنی
اگر آبے پیش آمدے وکشتی نہ بودے	پسینہ کو جذب کرنے والا لباس اور سر
پائے می نہاد و می گزشتند (خیرالمجالس	پر ٹوپی (سادہ ہی لباس سادہ تھا مگر
ص ۱۵۱)	ایسے باکمال تھے کہ دریا آجاتا اور کشتی نہ
	ہوتی تو (پانی ہی پہ) پیر رکھتے اور چلے
	جاتے تھے۔

گویا کہ اسرارالاولیاء کا مذکورہ واقعہ بھی کچھ ایسا واقعہ نہیں ہے، جو دیگر کتب ملفوظات میں مندرجہ واقعات کے لگ بھگ نہ ہو، اگر اس دلیل سے اسرارالاولیا جعلی ہے تو پھر سیرالاولیاء اور خیرالمجالس معتبر کیوں ہیں؟ جعلی کیوں نہیں ہیں؟

روایت نمبر ۷ حضرت باباصاحبؒ نے فرمایا کہ ایک دفعہ میں بغداد کی طرف مسافر تھا، دریائے دجلہ کے کنارے پہنچا تو دیکھا کہ ایک بزرگ پانی پر مصلی بچھائے نماز پڑھ رہے ہیں، جب نماز پڑھ چکے تو سجدہ میں سر رکھا اور سجدے ہی میں جناب باری میں التجا کرتے رہے کہ خداوندا! حضرت خضر سے گناہ کبیرہ ہو رہا ہے، آپ انھیں توبہ کی توفیق عنایت فرمائیے، اتنے میں حضرت خضرؑ بھی آگئے اور انھوں نے دریافت کیا کہ اے بزرگوار! میں کون سے گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو رہا ہوں، انھوں نے کہا کہ تم نے جنگل میں (فی سبیل اللہ) درخت لگایا جب وہ بارآور ہو گیا تو تم اس کے سائے میں بیٹھتے ہو اور آرام کرتے ہو، اور کہتے ہو کہ یہ درخت میں نے خدا کے لیے لگایا ہے، حضرت خضرؑ نے توبہ کی۔

پھر ان درویش نے ترک دنیا اور حق درویشی سے متعلق حکایت بیان کر کے فرمایا کہ اس طرح رہو جس طرح میں رہتا ہوں، حضرت خضرؑ نے دریافت کیا کہ آپ کس طرح رہتے ہیں اور کیا کرتے ہیں، ان بزرگ نے کہا کہ میں اس طرح رہتا ہوں کہ اگر مجھے ساری دنیا عنایت فرمائیں اور کہیں کہ تم سے اس کا حساب بھی نہ لیا جائے گا، اور یہ بھی کہیں کہ اگر قبول نہ کرو گے تو دوزخ میں

ڈال دیئے جاؤ گے تو میں دوزخ میں پڑنا قبول کر لوں گا، مگر دنیا کو لینا گوارا نہ کروں گا' حضرت خضرؑ نے دریافت کیا کہ یہ کیوں' انھوں نے فرمایا اس لیے کہ وہ (دنیا) خدائے عز وجل کی مبغوضہ ہے جس چیز کو اللہ پاک دشمن قرار دیں میں اسے قبول نہ کروں گا' اس کی بجائے دوزخ کو قبول کرلوں گا۔

حضرت بابا صاحبؒ نے فرمایا کہ میں ان کے نزدیک ہوا' اور سلام کیا' تھر حائل رہا' انھوں نے کہا آجاؤ' میں سوچنے لگا کہ پانی کو کیسے عبور کروں' میں اسی فکر میں تھا کہ خشکی نمودار ہوئی' میں چلا اور ان کے پاس پہنچ گیا' تھوڑی دیر بعد انھوں نے میری طرف رخ کیا اور فرمایا کہ اے فرید! چالیس برس ہوئے کہ میں سونے کے لیے لیٹا تک نہیں' لیکن اے درویش میرے مقام پر مجھے کھانے کو ملتا ہے تو جب تک کوئی آنے والا نہیں جاتا اور میں اپنے ساتھ اسے کھلا نہیں لیتا مجھے اطمینان حاصل نہیں ہوتا' اتنے میں دو پیالے سالن کے اور چار روٹیاں ٹکی ٹکی سی عالم غیب سے آئیں' ایک پیالہ میرے آگے رکھا اور دوسرا پیالہ اپنے آگے' دونوں نے کھانا کھایا' جب رات ہوگئی تو عشاء کی نماز پڑھی' پھر وہ بزرگ نماز نفل پڑھنے لگے' میں بھی ان کے ساتھ پڑھنے لگا' انھوں نے دو رکعت نماز میں چار بار قرآن پاک ختم کیا' ہر رکعت میں دو قرآن پاک ختم کرتے تھے۔ اس کے بعد سلام پھیرا اور سر سجدے میں رکھا' اور زار و قطار رونے لگے' اور عرض کیا کہ خداوندا! میں نے آپ کے شایان شان عبادت نہیں کی جو میں یہ سمجھوں کہ میں نے کچھ کیا ہے' اس کے بعد صبح کی نماز پڑھی' اور مجھے رخصت کیا' میں نے اپنے آپ کو دریا کے کنارے کھڑا پایا' اور وہ بزرگ نظروں سے غائب ہو گئے' نہیں معلوم کون تھے اور کہاں گئے۔

اس کے بعد حضرت بابا صاحبؒ نے فرمایا کہ اے درویش درویشی یہ تھی جو وہ رکھتے تھے کہ دنیا کی چیزوں میں سے ان کے پاس ٹوٹی ہوئی ٹھلیا کے سوا اور کچھ نہ تھا' رات ہوتی تو اس کا پانی بھی پھینک دیتے تھے' اور رات دن تجرید میں مشغول رہتے تھے' (اسرار الاولیاء ص ۴۴)

یہ حکایت بہت دلچسپ اور نہایت سبق آموز ہے' اس میں مافوق العادۃ عنصر کتنا ہے' اس روایت کو خواجہ حسن علا سجزیؒ نے بھی حضرت محبوب الٰہیؒ کی زبانی نقل کیا ہے' بیان میا

وہی فرق ہے جو فطرتاً دو صاحبوں کے بیان میں ہوا کرتا ہے[۱] لیکن موازنہ یہ بتاتا ہے کہ مولانا بدرالدین اسحاق ؒ کا ضبط الفاظ خواجہ حسن علائے سنجری ؒ کے ضبط الفاظ سے افضل و اعلیٰ ہے، محل غور ہے کہ ایک ہی خیال کو دونوں صاحبوں نے کس کس طرح بیان فرمایا ہے، مولانا بدرالدین اسحاق ؒ نے لکھا ہے :-

مصلیٰ بر آب انداختہ نمازی گزارد	پانی پہ مصلیٰ ڈالے نماز پڑھ رہے ہیں
چوں از نماز فارغ شد، سر بسجدہ	جب نماز سے فارغ ہوئے تو سر سجدہ
نہاد و در مناجات می گفت	میں رکھا اور التجا کرتے رہے۔

(اسرار الاولیاء ص ۴۴)

خواجہ امیر حسن علائے سنجری ؒ نے لکھا ہے :-

مصلیٰ بر روئے آب انداختہ بود	پانی پہ مصلیٰ ڈال رکھا تھا، اور نماز
و نماز می کرد و می گفت، خداوندا!	پڑھ رہے تھے اور کہتے رہے تھے کہ خداوندا

(فوائد الفواد ص ۴۰)

جسے علم و فن سے ذرا بھی آگاہی ہے وہ ان جملوں کے اوصاف سے واقف ہے کہ چوں از نماز فارغ شد سر بسجدہ نہاد و در مناجات می گفت اقتضائے حال کے مطابق ہے، یا یہ کہ نماز می کرد و می گفت (نماز پڑھتے رہے اور کہتے رہے) نماز میں کچھ کہتے رہنا کہاں تک مناسب ہے، اولیاء اللہ ہمہ تن ذات الٰہی میں محو ہو جاتے ہیں، اور اگرچہ مدعا یہی ہے کہ نماز سے فارغ ہونے کے بعد دعا کی مگر ظاہر ہے، "اسرار الاولیاء" کا اسلوب زیادہ اقتضائے حال کے مطابق ہے بہر نوع "اسرار الاولیاء" کو اسلوب بیان اور ماخذ کے اعتبار سے ترجیح حاصل ہے۔

روایت نمبر ۸ حضرت باباصاحب ؒ نے فرمایا کہ زمانہ ماضی میں ایک بزرگ تھے جو بیس سال عالم تحیر[۲] میں رہے، ایک سال گزرتا تو وہ عالم صحو میں

---

[۱] تفصیل کے لیے ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ ستمبر ۱۹۶۹ء ص ۱۷۵ تا ۱۸۲ ملاحظہ فرمائیے۔ [۲] عالم تحیر یا عالم سکر: سالک کا مرتبہ احدیت میں محو ہونا، اس مقام کی کیفیات احاطۂ تحریر و تقریر میں نہیں سما سکتیں اسی کو عالم سکر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ (اصطلاحات صوفیہ ص ۲۲)

آتے[1]، ان کے پاس کھانے پینے کا کوئی سامان نہ تھا، البتہ ایک چھوارا تھا، جو ان کی خانقاہ کے طاق میں رکھا رہتا تھا، جب بھوک کا غلبہ ہوتا تو وہ اس چھوارے کو طاق میں سے اٹھاتے اور چوس لیتے پھر وہیں رکھ دیتے تھے، کہتے ہیں کہ پچاس برس تک یہی کرتے رہے، ابھی وہ چھوارا کچھ باقی ہی تھا کہ اُن بزرگ کا انتقال ہوگیا، اور وہ رحمتِ حق سے جا ملے (اسرار الاولیاء ص ۵۵)

اس حکایت میں سلوک کی دو اصطلاحیں آگئی ہیں (۱) تحیر (۲) صحو، سالک کے مرتبۂ احدیت میں محو ہونے اور مشاہدۂ حق میں مستغرق رہنے کو حیرت و تحیر سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور صحو کہتے ہیں ہوش میں آنے یا رہنے کو، مراد اس سے یہ ہے کہ انتہائے توحیدِ حقیقی تک رسائی حاصل ہونے کے باوجود سالک حفظِ مراتب اور فرقِ مراتب سے غافل نہ ہو۔

یہ حکایت بلاشبہ عجائبِ روزگار سے ہے، تاہم ہر عہد میں عجوبۂ روزگار شخصیتیں عالمِ وجود میں آتی رہی ہیں، اور کتبِ ملفوظات میں ایسے بزرگوں کا ذکر خوب ملتا ہے، خواجہ امیر حسن علا سنجریؒ حضرت محبوب الٰہیؒ کی زبانی نقل فرماتے ہیں:-

بقالے بود علیہ الرحمۃ در عمارت بیست و	ایک بقال تھا اس پر خدا کی رحمت ہو،
پنج سال صائم بود، ہیچ کس را بر حال	پچیس برس روزہ دار رہا، کسی کو خبر
او اطلاع نہ بود کہ او صائم می باشد	نہ ہوئی کہ وہ روزے سے ہے حتیٰ کہ
اگر در خانہ بودے چناں نمودے کہ در	اس کے گھر والوں کو بھی خبر نہ ہوئی، اگر
دکان چیزے خوردہ است و اگر در	وہ گھر پر ہوتا تو یہ ظاہر کرتا کہ اس نے
دکان بودے چناں نمودے کہ در خانہ	دکان پر کھانا کھا لیا ہے، اور دکان پر
چیزے خوردہ است۔	ہوتا تو ظاہر کرتا کہ گویا اس نے گھر پر
(فوائد الفواد ص ۲۴۳)	کھا لیا ہے،

اسرار الاولیاء میں شیخ بزرگ کی حکایت ہے اور یہ ایک بقال کی کیفیت ہے، مخدوم نصیرالدین

[1] بے ہوشی سے ہوش میں آنا یا سالک کا انتہائے توحیدِ حقیقی میں پہنچ کر فرقِ مراتب سے غافل نہ ہونا، مگر یہاں پہلے ہی معنی مراد ہیں (اصطلاحاتِ صوفیہ ص ۲۲)

چراغ دہلیؒ نے رشید بشارت کا ذکر فرمایا کہ آپ کے کاروباری مشغولیت میں کھانا یاد ہی نہ آتا تھا،
اور یہ کلیہ بھی بیان فرمایا ہے،

در عالم عشق چنیں است چوں دلِ عاشق
بہ معشوق متعلق می شود، او را طعام و خواب
یاد نمی آید، چنانکہ در عالم ظاہر ایں
معاملہ است در عالم باطن بطریقِ اولیٰ،
آں کہ مشغول مشاہدات عالم غیبی باشد
طعام کہ؟ آب کہ؟ خواب کہ؟
(خیر المجالس ص ۹۲)

عشق کے عالم میں ایسا ہی ہوتا ہے کہ
جب محب کا دل محبوب سے متعلق ہو
جاتا ہے تو اسے کھانا اور سونا یاد نہیں
آتا، جب عالم ظاہر میں یہ کچھ ہے، تو
عالم باطن میں بطریقِ اولیٰ ہے جو بھی
عالم غیب کے مشاہدے میں محو و مستغرق
ہے، اس کے لیے کھانا پینا اور سونا کیسا۔

حضرت مخدومؒ نے یہ بھی فرمایا:-

عبادت ظاہری سبب می شود برائے
غذا و ہمیں عبادت ظاہری جائے غذا
می شود برائے اشتہا ....
بعد ازاں فرمودند کہ ذکر ہم سبب
اشتہا است و ہم بجائے غذا، اما
مراقبہ در ہمہ حال بجائے غذا است
زیراکہ در مراقبہ حضور و مشاہدہ است
و جوارح در حرکت نمی آید۔ ملائم
ایں فرمودند کہ خواجہ عقال مغربیؒ"
چہار سال در کعبہ مراقب بود
دریں چہار سال طعام و آب

عبادت ظاہری غذا کا سبب ہوتی
ہے، عبادت ظاہری سے بھوک لگتی ہے،
اور یہی ظاہری عبادت غذا بن جاتی
ہے اور اگر کسی کو ذوق و شوق نہیں ہے
تو یہی بھوک کا سبب ہو جاتی ہے۔
...... پھر فرمایا کہ ذکر بھوک بھی
لگاتا ہے اور غذا بھی بن جاتا ہے، مگر
مراقبہ ہر حال میں غذا کا قائم مقام
ہے، کیونکہ مراقبے میں حضور و مشاہدہ
ہے اور اعضا حرکت میں نہیں آتے
اسی سے متعلق یہ فرمایا کہ خواجہ عقالؒ

نخورد،	مغربیؒ چار سال بیت اللہ میں مراقب
(خیرالمجالس ص ۱۵۳-۱۵۴)	رہے، اس چار سالہ مدت میں انھوں نے
	نہ کھانا کھایا نہ پانی پیا۔

خواجہ عقال مغربیؒ کے متعلق یہ بھی فرمایا ہے:-

خواجہ عقال مغربی قدس اللہ سرہ العزیز	خواجہ عقال مغربی قدس اللہ سرہ العزیز
ہفت سال طعام نخورد، چوں وقت	نے سات برس کھانا نہیں کھایا عجب
نماز شدے، بہ خود آمدے، برخاستے،	نماز کا وقت ہوتا، ہوشیار ہو جاتے
نماز گزاردے باز در مراقبہ شدے،	اٹھتے، نماز پڑھتے، پھر مراقبہ میں
(خیرالمجالس ص ۹۲)	مشغول ہو جاتے۔

کتب ملفوظات مشائخ چشتؒ رحمہم اللہ میں ایسے واقعات اور بھی ملتے ہیں حضرت خواجہ گیسو دراز نے فرمایا:-

شیخ شرف الدین (بوعلی قلندر) پانی پتیؒ نے تیس سال تک کھانا نہیں کھایا۔ (جوامع الکلم ۱۰ رمضان المبارک ۸۰۲ھ)

یہ بھی فرمایا ہے:-

سید مصریؒ ایک خطاط تھے، انھوں نے بتایا تھا کہ انھوں نے تیس برس سے پانی نہیں پیا ہے۔ (جوامع الکلم ۱۰ رمضان المبارک ۸۰۲ھ)

حضرت مخدوم نصیرالدین چراغ دہلیؒ نے اشتہا پیدا نہ ہونے اور مدتوں تک کچھ نہ کھانے پینے کی حکایت بھی بیان فرمادی ہے، جنھیں علم تصوف سے ذرا بھی آگاہی ہے، وہ جانتے ہیں کہ راہ سلوک میں ایسے بھی مقام آتے ہیں کہ جن کی فہمید سے سطحی اذہان معذور رہتے ہیں۔ اسرارالاولیاء کی مذکورہ بالا حکایت آئین تصوف کے مطابق اور شہادت درجہ موقر ہے، فوائد الفواد اور خیرالمجالس اسی کی خوشہ چین ہیں۔

آج بحوالہ ملفوظات

روایت نمبر ۹ حضرت باباصاحبؒ نے فرمایا کہ بزرگان دین میں سے ایک بزرگ تھے، انھیں عبداللہ خفیف کہتے تھے۔ چالیس سال تک وہ رات کو سوئے نہیں بلکہ لیٹے تک نہیں، اور وہ خدائے تعالٰی کے خوف سے اس قدر روئے کہ ان کے مبارک رخساروں پر گوشت نام کو بھی نہ رہا تھا، یہ بھی کہتے ہیں کہ چڑیوں نے ان کے مبارک رخساروں میں گھونسلے بنا لیے تھے، اور وہ خدائے تعالٰی کے خوف سے ایسے حیران و سراسیمہ تھے کہ انھیں چڑیوں کی آمد و رفت کی خبر تک نہ ہوتی تھی جب وہ بزرگ قیامت کی باتیں اور قبر کی کیفیت سنتے تو مثل بید کے کانپنے لگتے، زمین پر گر پڑتے اور ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگتے، جب ہوش میں آتے تو اٹھتے اور یہ آیت پڑھتے، فَرِيقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيقٌ فِي السَّعِيرِ زار و قطار روتے اور فرماتے میں کچھ نہیں جانتا کہ میں کس فریق میں ہوں گا۔ ساری عمر انھوں نے اسی طرح گزاری اور اللہ کو پیارے ہوئے۔ (اسرار الاولیا ص ۵۸)

یہ روایت بھی محیر العقول اور عجائب روزگار میں سے ہے، لیکن ایسی روایتیں دیگر کتب ملفوظات میں بھی ہیں، اس لیے یہ ماننا ہوگا کہ صوفیۂ کرام کے احوال سے ایسی روایات کو خصوصی علاقہ ہے یہ بھی ذہن نشین رکھنے کے لائق ہے کہ یہ جملہ کہ "یہ بھی کہتے ہیں کہ چڑیوں نے ان کے مبارک رخساروں میں گھونسلے بنالیے تھے الخ" بعض نسخوں میں نہیں ہے، اس کے ماسوا "چنانچہ می گویند" اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ وہ روایت ہے، جو بطور افواہ عوام کی زبان پر ہے، اس کا کوئی معتبر راوی نہیں ہے، بات کا بتنگڑ بنا دینا عوام کی عادت ہے، اس نکتے کو سمجھ لینے کے بعد روایت میں کوئی خلفشار نہیں رہتا۔ چڑیوں کا گھونسلہ بنانے کا ذکر عوامی منطق ہے، اسے حقیقت سے علاقہ نہیں ہے۔

اب رہی یہ بات کہ چالیس سال تک وہ رات کو نہ سوئے، تو کاملین صوفیۂ کرام کے احوال میں ایسے واقعات ملتے ہیں، چنانچہ حضرت محبوب الٰہیؒ کا ارشاد ہے،

شجاع کرمانیؒ چہل سال شب نہ خفت (فوائد الفواد ص ۳۰)	شجاع کرمانی چالیس سال تک رات کو نہ سوئے۔

اسی روایت کو مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے دہرایا ہے، فرماتے ہیں :-

شاہ شجاع کرمانی ؒ فرمودند، چہل سال	شاہ شجاع الدین کرمانی ؒ نے فرمایا
نخفت ، (خیر المجالس)	کہ وہ چالیس سال سوئے نہیں ،

فوائد الفواد اور خیر المجالس کے بیانات سے بھی اس خیال کو تقویت حاصل ہوتی ہے کہ یہ روایت بھی صوفیۂ کرام سے خصوصی رابطہ رکھتی ہے ، اور خشیت ایزدی کی ترجمان ہے ، اور اس کا اسلوب بیان یہ بتاتا ہے کہ اس کا تعلق حضرت باباصاحب ؒ ہی سے ہے ، بھر اسے کیسے ہدف تنقید بنایا جا سکتا ہے -

روایت نمبر ۱۰ | حضرت باباصاحب ؒ نے فرمایا کہ اے درویش شیر خاں ملتان کا حاکم تھا ، وہ دعا گو سے صاف نہ تھا ، خلش رکھتا تھا ، میں نے بارہا نہایت نرمی اور ہمدردی سے کہا اور سمجھایا کہ درویشوں سے بغض وکینہ مناسب نہیں ہے بلکہ ملک کی تباہی و بربادی کا سبب ہے ، مگر وہ نہ مانا اور من مانی کرتا رہا ، انجام کار تاتاریوں نے اُچ پہ یورش کی (لوٹ مار کی) قضاء عنداللہ صرف وہی مارا گیا ، پھر آپ نے یہ شعر پڑھا - (اسرار الاولیا ص ۶۹)[له]

درویش بہ شہر نہ بودے اگر مقام — گشتے سراسر ہمہ عالم خراب حال

یہ واقعہ بروئے تاریخ ۶۴۲ھ کا ہے اسی واقعہ کو حضرت محبوب الٰہی ؒ نے بھی بیان فرمایا ہے خواجہ حسن علائے سنجری ؒ نے لکھا ہے ،

شیر خان والی اُچ و ملتان بود در حق	شیر خان اُچ اور ملتان کا حاکم تھا -
شیخ الاسلام شیخ فرید الدین قدس اللہ	حضرت باباصاحب ؒ کے متعلق کچھ اچھا

له اسرار الاولیاء کی اصل فارسی عبارت یہ ہے :-

اے درویش! شیر خاں والی ملتان بود ، چنداں عقیدہ بدعاگوے نداشت ، ہر بار بہ طریق بہتری گفتم ، کہ با درویشاں کینہ کردن نیکو نیست کہ خلل ملک تو ست ، او التفات نکردے ، چنانچہ حقیقۃً در جوالی اُچ مغل رسید ہیچ کشتہ نشد مگر ہموں -

آں گاہ بر لفظ مبارک ایں دو مصرع راند

درویش بہ شہر نہ بودے اگر مقام ، گشتے سراسر ہمہ عالم خراب حال -

(اسرار الاولیا ، ص ۶۹)

سرہ العزیز چنداں اعتقادے نداشت	اعتقاد نہ رکھتا تھا، یہاں تک کہ
تا بارہا شیخ الاسلام در معنی او	حضرت بابا صاحبؒ نے اس سے متعلق بارہا
ایں دو مصرع بگفتے ؎	یہ شعر پڑھا۔
افسوس کہ از حال منت نیست خبر	افسوس کہ تجھے میرے حال کی کچھ بھی خبر
آنگہ خبرت شود کہ افسوس خوری	نہیں، البتہ جب تجھے پتہ چلیگا تو افسوس کریگا۔
بعد ازاں فرمود کہ چوں شیخ الاسلام	اس کے بعد فرمایا کہ حضرت بابا صاحبؒ
قدس اللہ سرہٗ العزیز از دنیا برفت	کا انتقال ہو گیا، تو اسی سال کا فر
ہماں سال کافراں دراں دیار رسیدند	اس شہر میں آ پہنچے۔

(فوائد الفواد ص ۲۲۰-۲۲۱)

مفہوم کے اعتبار سے دونوں بیان یکساں ہیں، الفاظ کا ردو بدل فطری شے ہے، جو دو مختلف اشخاص کے بیان میں ہوتا ہے، البتہ اشعار مختلف ہیں، یہ بھی ہو سکتا ہے، البتہ فوائد الفواد میں بعد ازاں کے بعد جو کچھ لکھا ہے، اس کا تعلق اس واقعہ سے نہیں ہے کیونکہ شیر خاں کا واقعہ ۶۶۲ھ / 1263ء کا ہے، اور بیان کا تعلق حضرت بابا صاحبؒ کی وفات (۶۷۰ھ / 1271ء) کے بعد کے واقعہ سے ہے جس کا اعادہ امیر خورد کرمانیؒ نے بھی کیا ہے۔ اور لکھا ہے:-

"بعد نقل شیخ شیوخ العالم کفار در دیار اجودھن رسیدند خواجہ نظام الدینؒ از جہت مردی غایت دلاوری بحرب کفار پیوست۔ بعد قتال بسیار شہادت یافت" (سیرالاولیاء ص ۱۹۰ پ ح)

یہ خواجہ نظام الدینؒ حضرت بابا صاحبؒ کے جو تھے صاحبزادے تھے، غالباً حضرت محبوب الٰہیؒ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ حضرت بابا صاحبؒ کی وفات کے بعد یہ حادثہ بھی پیش آیا تھا جو حضرت بابا صاحبؒ کے فرمودہ اس شعر سے بھی متعلق ہے، جو اسرار الاولیاء میں اس ذکر کے ساتھ ہے، خواجہ امیر حسن علا سنجریؒ کے اسلوب میں ایجاز ہے، انھوں نے بعد ازاں

سے اس واقعہ کو علیحدہ تو کر دیا ہے لیکن پھر بھی مبہم ہی رہا اس سے یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ وہی واقعہ ہے، جس میں شیر خان مارا گیا تھا، مگر ایسا ہے نہیں، کیونکہ یہ واقعہ حضرت باباصاحبؒ کی وفات کے بعد کا ہے اور شیر خان کے مارے جانے کا واقعہ حضرت باباصاحبؒ کی حیات ۶۶۲ھ 1263 کا ہے جس کو حضرت محبوب الٰہیؒ نے بھی راحت القلوب میں قلم بند فرمایا ہے، آپ کا مبارک بیان یہ ہے:-

شیر خان والیِ اچ و ملتان بود، درحقِ دعاگوئے چنداں عقیدہ نہ داشت کہ بر زبان آید بارہا درحق او ایں بیت گفتہ، ع

افسوس کہ از حال منت نیست خبر آنگہ خبرت شود کہ افسوس خوری

بعد از چند روز ہماں سال کفار در رسیدند، تمام نہیب کردند و بردند۔"
(راحت القلوب ص۱۶-۱۷)

تینوں بیان سامنے ہیں مگر یہ وضاحت صرف اسرار الاولیاء میں ہے کہ مغلوں کی یورش اچ کی گرد و نواح میں تھی، دوسرے یہ وضاحت بھی اسرار الاولیاء ہی میں ہے کہ حملہ آور مغل دتاتاری) تھے، کفار و کافروں میں یہ وضاحت کہاں ہے، اس اعتبار سے اسرار الاولیاء کے بیان کو ترجیح ہے، خواجہ امیر حسن علائے سنجریؒ کا بیان ایجاز کی بنا پر قدرے گنجلک ہو گیا ہے، اس لیے اس کا مقام میسرا ہے، اولیت اسرار الاولیاء کے بیان کو حاصل ہے، اور یہ صحت تقابل میں بھی اسرار الاولیاء کے مستند ہونے کی بین دلیل ہے ع

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

روایت نمبر ۱۱ حضرت باباصاحبؒ نے فرمایا ایک دفعہ سلطان ناصر الدین محمود علیہ الرحمۃ والغفران ملتان جا رہا تھا تو جب اجودھن دپاکپتن) پہنچا تو مجھ سے ملنے آیا، جو آداب ملاقات ہیں وہ اس نے انجام دیے اور چلا گیا، فوجی جو اس کے ساتھ تھے وہ بکثرت آتے رہے، جب میں ہجومِ خلق سے عاجز ہو گیا تو میں نے تنہائی اختیار کرنی چاہی، لیکن پھر یہ سوچا کہ ہمارے

بزرگوں نے ایسا نہیں کیا ہے، سب ہی سے مصافحہ کیا ہے، میں ایک چھت پر جاکر بیٹھ گیا، ہاتھ نیچے لٹکا دیے۔ آنے والے آتے اور مصافحہ کرتے، آنے والے بے حد بے شمار آتے، مصافحہ کرتے اور کپڑے کا ٹکڑا عقیدت مندی سے پھاڑ کے لے جاتے، اس دن دس کرتے کیے بعد دیگرے پہننے پڑے، سب ہی پارہ پارہ ہو گئے، مجھے ان کی اس عقیدت مندی پر حیرت ہوئی کہ یہ کیسے خوش عقیدہ ہیں، جمعہ کا دن تھا میں نماز کو گیا، واپس آیا تو پھر مخلوق کا ہجوم ہو گیا، میں مصافحہ کرتے کرتے تنگ آ گیا تھا، اتنے میں ایک فراش نے میرا پیر پکڑ کر گھسیٹا، مجھے اس کی یہ حرکت اچھی نہیں لگی، فراش نے برجستہ کہا کہ شیخ فرید خدا کا شکر ادا کرو کہ اپنے ہی جیسے انسان پائے بوسی کے آرزو مند ہیں، مجھے اس کی یہ بات پسند آئی کہ اس نے خوب کہا، واقعی مجھے خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے، پھر فرمایا اے درویش جو اللہ کو پیارا ہے، وہ سب ہی کو پیارا ہے۔" (اسرار الاولیاء ص ۸۲-۸۳)

اس روایت میں کئی اہم نکات ہیں۔

(۱) یہ اس عہد کا یعنی ۶۵۵ھ / 1257ء کا اہم تاریخی واقعہ ہے، جس کے پسِ منظر میں وہ سب کچھ ہے جس کا تعلق اس عہد کے سیاسی اور سماجی حالات سے ہے، اس باب میں "اسرار الاولیاء" پہلا مجموعہ ملفوظات ہے جو اپنے عہد کے سیاسی اور سماجی احوال کی نشان دہی کرتا ہے، اس لیے اس باب میں دیگر ملفوظات پر اسے فوقیت ہے، اس وصف میں مقابلتاً نہ فوائد الفواد کو پیش کیا جا سکتا ہے اور نہ خیر المجالس کو۔

(۲) اس روایت سے حضرت بابا صاحبؒ کی مقبولیت کے عمومی رجحان کی اور ان سے عقیدت مندی کی پوری کیفیت سے آگاہی ہو جاتی ہے، اور معاشرے کا واضح نقشہ سامنے آ جاتا ہے۔

(۳) فراش کی بصیرت اور جسارت اور برمحل توجہ دلانا ایسا واقعہ ہے جو آپ اپنی نظیر ہے، جس سے قرونِ اولیٰ کے کردار کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، جو صحت مند معاشرہ کی علامت ہے۔

یہ روایت فوائد الفواد (ص ۲۵) میں بھی ہے۔ اور سیر الاولیا ص ۹۷ پر ح میں بھی

ہے بلکہ فوائد الفواد[1] اور سیر الاولیاء[2] میں ایک اور روایت بھی ہے، جس میں الغ خان (غیاث الدین بلبن) کے حضرت بابا صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہونے کا ذکر ہے[3]، بہر حال یہ واضح ہے کہ اسرار الاولیاء، فوائد الفواد کا ماخذ بھی ہے، اور سیر الاولیاء کا بھی، اسلوب کی سادگی اور صفائی اور دل آویزی موجود ہے پڑی بول رہی ہے کہ یہ کلام حضرت بابا صاحبؒ ہی کا ہے۔

روایت نمبر ۱۴ حضرت بابا صاحبؒ نے فرمایا کہ ایک شخص بیعت ہونے کی نیت سے دہلی سے اجودھن چلا تاکہ مجھ سے بیعت ہو، راستے میں ایک عورت سے ملاقات ہوئی اس نے، اس عورت سے دست درازی کرنی چاہی یا بات چیت کرنی چاہی اچانک ایک ہاتھ نمودار ہوا اور اس کے منہ پر طمانچہ مارا اور کہا کسی بزرگ سے بیعت ہونے کی نیت سے جا رہا ہے اور یہ کچھ کرنا چاہتا ہے، القصہ جب وہ شخص میرے پاس آیا سب سے پہلے میں نے اس سے یہی کہا کہ دیکھا اس دن اللہ پاک نے تجھے اس بلا سے کیسے محفوظ رکھا۔ (اسرار الاولیاء ص ۸۸)

حضرت بابا صاحبؒ نے اس سے پہلے ایسے ہی ایک شخص کا واقعہ بیان کیا اور وہ یہ کہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشیؒ کی خدمت میں بیعت ہونے کی نیت سے چلا تھا، راستے میں ایک مطربہ اس پر مائل ہوئی، اتفاق سے یہ دونوں ایک گاڑی میں ہمسفر ہوئے کوئی دوسرا نہ تھا تو اس کی طرف کچھ رغبت ہوئی کچھ دست درازی کی یا بات چیت کی، اس حالت میں اس نے دیکھا کہ ایک شخص آیا، اس کے منہ پر طمانچہ مارا اور کہا کسی بزرگ کی خدمت میں جا رہا ہے اور کس نیت سے جا رہا ہے، اور یہ کیا ہے جو تو کر رہا ہے، غرض کہ جب وہ حضرت قطب صاحبؒ

[1] فوائد الفواد ص ۹۹ [2] سیر الاولیاء ص ۷۹ [3] انوار الفریدی ص ۲۰ مطبوعہ پاکستان میں سات مجموعات ملفوظات کے نام لکھ کر یہ لکھا ہے کہ ان کی بعض روایات کو تاریخ بھی رد کرتی ہے تاریخ کی کتابوں میں خصوصاً طبقات ناصری میں ان روایات کا ذکر نہیں ہے جو مذکورہ تینوں کتابوں میں ہیں۔ کیا انھیں بھی تاریخ رد کرتی ہے؟ اگر رد کرتی ہے تو سیر چشتی کیوں ہیں؟ انہیں بھی ان میں شامل کرنا چاہیے ع چوں نہ دیدند حقیقت رہ افسانہ زدند۔

کی خدمت میں پہنچا تو سب سے پہلے آپ نے یہی فرمایا اللہ پاک نے اس دن تیر کی بہت ہی حفاظت فرمائی (اسرار الاولیاء ص ۸۶)

الغرض جو روایت حضرت بابا صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہونے والے کے متعلق ہے وہ فوائد الفواد (ص ۲۲۳ مطبوعہ نولکشور) میں بھی ہے لیکن بعض تفصیلات جو اس شخص سے متعلق ہیں جو قطب صاحبؒ کی خدمت میں بیعت و ارادت کی نیت سے چلا تھا وہ بھی حضرت باباصاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہونے والے سے متعلق ملتی ہیں، اس سے گمان یہ ہوتا ہے کہ فوائد الفواد کسی ناقص نسخے سے منقول ہے، اور کسی کاتب و ناقل نے دونوں روایتوں کی معلومات کو خلط ملط کر کے ایک ہی سے وابستہ کر دیا ہے، اور یہ قرین قیاس ہے، تاہم یہ واضح ہے کہ اسرار الاولیاء ہی فوائد الفواد کا ماخذ ہے، جو مستند و معتبر ہے، اس کے علاوہ حضرت بابا صاحبؒ نے جو اس شخص کا واقعہ بیان فرمایا ہے وہ بسبیل تذکرہ زبان پر آگیا ہے، مقصود اظہار کرامت نہیں ہے، پھر ایسے واقعات سے آگاہی کو امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت ساریہؓ کے واقعہ پر قیاس کرنا چاہیے، جس کا تعلق بصیرت باطنی[1] سے ہے جو باوفی توجہ حاصل ہوتی ہے، اس کے لیے خیر المجالس ص ۱۳۷-۱۳۸) کی وہ روایات بھی ذہن نشین رکھنی چاہیے جو روغن فروش کی بیوی سے متعلق ہے،

روایت نمبر ۱۳ حضرت بابا صاحبؒ نے فرمایا کہ ایک دفعہ میں اور شیخ جلال الدین تبریزی قدس اللہ سرہ العزیز دونوں بدایوں گئے اور ایک دن ہم دونوں گھر کی دہلیز میں بیٹھے ہوئے تھے کہ دہی بیچنے والا دہی کا ہنڈہ سر پر رکھے سامنے آیا، یہ دہی بیچنے والا مواسی[2] کا رہنے والا تھا، جو بدایوں کے پاس ہی ہے، اسے کہیم (کھیڑ) کہتے ہیں، وہاں ہنود کو بہت رہتے تھے۔ دہی بیچنے والا بھی ان ہی میں سے تھا، الغرض جب دہی بیچنے والا کی نظر شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے مبارک چہرے پہ پڑی، دیکھتے ہی وہ متاثر ہوا، اور جب شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے اس کی طرف دیکھا تو کہنے لگا

---

[1] اتقوا فراسۃ المومن فانہ ینظر بنور اللہ تعالیٰ (الحدیث) مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ [2] مواسی - مواس پناہ گاہ کو کہتے ہیں اور ایسی بستی کو بھی کہتے ہیں جس کے اردگرد فصیل یا خندق ہوتی ہے۔

کہ دینِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ایسے ایسے بزرگ بھی ہیں تو فوراً ہی مسلمان ہو گیا۔ اس کا نام علیؒ رکھا گیا، جب مسلمان ہو گیا تو اپنے گھر گیا، اور فوراً ہی واپس آگیا اور ایک لاکھ جیتلؒ لا کر شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی خدمت میں پیش کیے، شیخ جلال الدین تبریزیؒ نے انھیں قبول فرمایا اور فرمایا انھیں تم اپنے ہی پاس رکھو اور جس طرح میں کہوں، اسی طرح خرچ کرتے رہو، چنانچہ کسی کو سَو دلاتے اور کسی کو کم و بیش مگر پانچ سے کم کسی کو نہ دلاتے تھے، تمام رقم خرچ ہو گئی صرف ایک درہم رہ گیا، علی کہتے ہیں مجھے تردد تھا کہ پانچ سے کم تو کسی کو دلاتے نہیں اور میرے پاس اب ایک ہی درہم ہے، اگر کسی کو پانچ دینے کو کہا تو میں کیا دوں گا، اتنے میں ایک مانگنے والا آیا، تو آپ نے فرمایا کہ ایک درہم اسے دے دو، علی کہتے ہیں کہ میں یہ سن کر حیران رہ گیا۔ (اسرار الاولیاء ص ۹۰)

یہ روایت بھی فوائد الفوادؒ کا ماخذ ہے، البتہ اسلوب و جزئیات میں قدرے فرق ہے، اس کا ایک سبب تو وہی ہے جسے مطالعہ ملفوظاتِ خواجگانِ چشتؒ کے مبادیاتؒ کے زیرِ عنوان تفصیل سے لکھ چکا ہوں، اور وہ یہ کہ جب ایک ہی شخص کسی واقعہ کو یا کسی حکایت کو ایک سے زیادہ مجالس میں بیان کرتا ہے تو اسلوب و جزئیات میں فرق ہو جاتا ہے، اور جب دو مختلف شخص ایک ہی واقعہ کو بیان کریں تو اسلوب و جزئیات میں فرق ہونا فطری شے ہے۔

اسرار الاولیاء کی روایت میں حضرت باباصاحبؒ بھی شریک ہیں، مگر فوائد الفواد (ص ۱۴۲) کی روایت میں حضرت باباصاحبؒ کا نام نہیں ہے، اسی طرح فوائد السالکین (ص ۱۰) کی حکایت طوافِ کعبہ میں قاضی حمید الدین ناگوریؒ اور حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشیؒ دونوں بزرگ ہیں مگر فوائد الفواد (ص) کی اسی روایت میں صرف قاضی حمید الدین ناگوری کا نام ہے۔

لے یہ بزرگ علی مولہ کے نام سے بھی مشہور ہیں، حضرت محبوب الٰہیؒ کی دستار بندی کی تقریب میں شریک تھے، لے جیتل بہت کم قیمت کا سکہ ہوتا تھا، مگر یہاں جیتل سے مراد وہ رقم ہے جس میں درہم اور چاندی کے سکے شامل تھے۔

سے فوائد الفواد ص ۱۴۲ لے ماہنامہ معارف اعظم گڑھ ستمبر ۱۹۷۹ء اور فوائد الفواد ص ۱۶۲، ۱۶۷، ۶۵، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۲۱، ۵۹، نیز خیر المجالس ص ۱۳۱، ۱۳۷

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشیؒ کا نام نہیں ہے، اور ان بزرگ کا بھی نام نہیں ہے جن کی ان دونوں بزرگوں نے اتباع کی تھی، اور جن کا نام فوائد السالکین میں شیخ عثمان لکھا ہے (اور نیز شیخ عثمان گفتند سے[1])۔

اس کا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خواجہ امیر حسن علا سجزیؒ چونکہ یادداشت قلم بند نہیں کرتے تھے، بلکہ صرف قوتِ حافظہ سے کام لیتے تھے، اور یہ بہت لائق ستائش امر ہے لیکن یہ بھی ہے کہ قوتِ حافظہ خواہ کتنی قوی کیوں نہ ہو تاہم تحریری یادداشت کی نسبت حافظہ میں سہو کا زیادہ امکان ہے، اور انھیں اس کا اعتراف بھی ہے، انھوں نے لکھا ہے:۔

خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر سہ چہار بیت	حضرت محبوب الٰہیؒ نے تین چار شعر
بخواند، بندہ را ایں دو بیت یاد آمد	پڑھے تھے، مجھے یہ دو ہی یاد آسکے
(فوائد الفواد ص ۱۵۰)	ہیں۔

حضرت محبوب الٰہیؒ نے بھی قوتِ حافظہ سے متعلق استعجاب کا اظہار فرمایا ہے اور یہ بھی فرمایا:۔

ایں کہ یاد می ماند عجب است (فوائد ص)	یہ بات کہ سب ہی کچھ یاد رہتا ہے، تعجب خیز ہے۔

تعجب نہیں کہ آپ پر یہ روشن ہو کہ سہو لاحق ہوتا ہے، اور آپ نے تنبیہاً یہ ذکر چھیڑا ہو اور اظہار استعجاب فرمایا ہو، قرینہ اسی پر دلالت کرتا ہے، بلاشبہ حضرت محبوب الٰہیؒ مکاشف عالم بھی تھے۔

الغرض فوائد الفواد کی مذکورہ روایت میں حضرت بابا صاحبؒ کا نام نامی نہ ہونا ہرگز اس کی دلیل نہیں ہے کہ آپ جلال الدین تبریزیؒ کے ہمراہ شریک سفر نہیں تھے، یا آپ کبھی بدایوں تشریف لے ہی نہیں گئے تھے، اس لیے کہ مذکورہ وجوہ کے علاوہ یہ بھی ہے کہ کسی کتاب میں کسی

[1] فوائد السالکین ص ۱۳ — ہشت بہشت کی ترجمہ ملفوظات میں برہان الدین لکھا ہے جو غلط ہے۔

واقعہ کا نہ ہونا اس کی دلیل نہیں کہ واقعہ کا وجود ہی نہیں ہے، میر شکار کا واقعہ اور روغن فروش کی بیوی کا واقعہ نہ فوائد الفواد میں ہے اور نہ سیر الاولیاء میں، صرف خیر المجالس میں ہے۔ سلطان ناصر الدین محمود کے سفر ملتان کا اور حضرت بابا صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہونے کا واقعہ تاریخ طبقات ناصری میں نہیں ہے، جو اس عہد کی معتبر تاریخ ہے اور سلطان ناصر الدین محمود ہی سے منسوب ہے، مگر اسرار الاولیا، فوائد الفواد اور سیر الاولیاء میں ہے تو کیا صرف اس لیے اس سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ یہ واقعہ طبقات ناصری میں نہیں ہے، جو اس عہد کی مستند تاریخ ہے، اصول یہ ہے کہ جب راوی مستند ہوتے ہیں تو خواہ کوئی واقعہ کسی کتاب میں ہو اور کسی میں نہ ہو تو اسے مستند ہی مانا جاتا ہے، حضرت بابا صاحبؒ کے سوانح کے متعلق حضرت بابا صاحبؒ سے زیادہ اور کون مستند ہو سکتا ہے، یہ کہنا یا سمجھنا کہ اگر ہوتا تو فلاں کتاب میں ضرور ہوتا یہ لزوم مالا یلزم ہے، ممکن تو ہے مگر ہر کسی کتاب میں ہونا لازم نہیں،

یہ بھی ہوتا ہے کہ بعض امور کا ذکر ان مستند کتابوں میں ہوتا ہے، جو دستبرد زمانے سے ناپید ہو چکی ہوتی ہیں، مگر ان ہی سے مابعد کی کتابوں میں بھی منقول ہو چکا ہوتا ہے، تو اگر کتاب معتبر ہے، تو اس کی روایت کو بھی معتبر مانا جاتا ہے، تاہم تواتر بیان سے یہ ثابت ہے کہ اسرار الاولیاء مابعد کی کتب ملفوظات کا ماخذ اور بدرجۂ اولیٰ معتبر ہے، اور اس میں حضرت بابا صاحبؒ کے سفر بدایوں کا ذکر بھی معتبر ہے، قرائن سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، امیر خورد کرمانیؒ نے لکھا ہے:-

"شیخ نجیب الدین متوکلؒ را برادرے بود در بدایوں، ہر سالے بدیدن او آنجا رفتے۔" (سیر الاولیاء، ص ۶۷ ایچ)

شیخ نجیب الدین متوکلؒ حضرت بابا صاحبؒ کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے، جو ہر سال اپنے بھائی کی خدمت میں بدایوں تشریف لے جاتے تھے، تو کیا حضرت بابا صاحبؒ کا بدایوں تشریف لے جانا ناممکنات سے ہے جو انکار کیا جائے، واقعات متعلقہ سے اسرار الاولیاء کے بیان کی پوری پوری تائید ہوتی ہے اور گوناگوں اوصاف کی بنا پر اسرار الاولیاء میں بیان کردہ

مذکورہ سفر بدایوں کو تسلیم کرنا ہوتا ہے، اور انکار کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی، اندریں
مانتا ہوگا کہ اگرچہ اسرار الاولیاء عقیدت مندوں کی بے اعتنائی کی بنا پر صحت و مقابلہ سے مزین
ہوکر منظر عام پر نہ آسکی ہے، اور اس میں کتابت و طباعت کی بکثرت غلطیاں ہیں۔ تاہم وہ
بذات خود معتبر و مستند ہے، اور اس کا استناد حضرت باباصاحبؒ سے صحیح اور درست ہے۔

روایت نمبر ۱۳ | حضرت باباصاحبؒ نے فرمایا، امام ابو یوسف (قاضی) کی روایت کے مطابق
طاقیہ (کلاہ) دو طرح کا ہوتا ہے، (۱) لاطیہ (۲) ناشرہ، لاطیہ سر سے ملا ہوا ہوتا ہے اور ناشرہ
کسی قدر سر سے اُبھرا ہوا ہوتا ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کلاہ لاطیہ اکثر استعمال کیا ہے اور کلاہ
ناشرہ کم استعمال کیا ہے، کلاہ ناشرہ سیاہ رنگ کا ہوتا ہے، بعض مشائخ نے بھی کلاہ ناشرہ
استعمال کیا ہے (اسرار الاولیاء ص ۶۳)

حضرت باباصاحبؒ کے اس مبارک بیان سے کلاہ کی نوعیت واضح ہوگئی کہ کلاہ یعنی طاقیہ
جو صوفیہ میں مروج ہے، وہ حضور اکرم صلی اللہ کی نسبت سے ہے اور سنت کا مرتبہ رکھتا ہے،
اسرائیلیات سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے اسے دیومالائی کہانی سے تعبیر کرنا نہایت درسبہ
گستاخی اور کم علمی کی علامت ہے۔

حضرت باباصاحبؒ نے تفصیل سے اس موضوع پر گفتگو فرمائی ہے جو اسرار الاولیاء
کے اوراق کی زینت ہے، اور وہ یہ کہ اس کا شمار مشائخ کرام کے لباس میں ہوتا ہے، یہ بھی
تاثیر و کیفیات سے مالامال رہا ہے، اسے صوفیہ کرام کے یونی فارم کا جزو تصور کرنا چاہیے، یہ
نادر معلومات ہے جس کی استناد حضرت باباصاحبؒ کے بیان سے صحیح و درست ہے، یہ ذکر
فوائد الفواد ص ۱۳۸ میں بھی ہے

روایت نمبر ۱۴ | حضرت باباصاحبؒ نے فرمایا: ہمارے خواجگان کے نزدیک خرقہ کا
تعلق حضرت رب العزت سے ہے، اور وہ یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ وسلم کو شب معراج میں
خرقہ عطا ہوا، جسے خرقہ معراج کہتے ہیں، اور یہ فرمان ہوا ہے کہ اپنے اصحاب میں سے

اُسے عنایت فرمایئے، جو یہ کہے کہ میں پردہ پوشی پر عمل کروں گا، چنانچہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب معراج سے تشریف لائے تو اصحابِ کرامؓ سے دریافت کیا کہ اگر میں تمھیں یہ خرقہ دوں تو تم کیا کروگے، صحابہ نے جو مناسب سمجھا جواب دیا، حضرت علیؓ نے عرض کیا کہ میں پردہ پوشی سے کام لوں گا، مسلمانوں کے بلکہ جملہ بندگانِ خدا کے عیوب چھپاؤں گا، چونکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا جواب حضرت حق تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق تھا اس لیے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خرقۂ معراج سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو عنایت فرمایا۔ (اسرارالاولیاء ص ۳۹)

حضرت باباصاحبؒ نے یہ بھی فرمایا کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: میرے پاس حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ کی یادگار ایک گلیم ہے، مجھے فرمانِ ربی یہ ہے کہ میں یہ گلیم علی ابن ابی طالبؓ کو دے دوں تاکہ وہ میرے امتیوں کو پہنچادیں، حضرت علی کرم اللہ وجہہ حاضرِ خدمت تھے، لہٰذا وہ گلیم آپ نے سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو عنایت فرمادی، اس سے یہ واضح ہے کہ گلیم پوشی کا آغاز حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ سے ہے۔ (اسرارالاولیاء ص ۴۵-۴۶)

خرقہ کہتے ہیں پیوند لگے کرتے کو اور گلیم کہتے ہیں کمبلی کو، جو زمانۂ قدیم سے انبیا علیہم السلام اور صوفیۂ کرام کا لباس ہے، اور اس لباسِ صوفیہ کو خرقۂ معراجیہ اور گلیم ابراہیمی سے نسبت ہے، لیکن خرقۂ معراجیہ کو اور گلیم ابراہیمی کو مادی لباس سمجھنا صحیح نہیں، بلکہ وہ لطیفۂ غیبی ہے، مادی نہیں ہے۔ مولانا فخر الاسلام فریدی چشتی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے:۔

"خرقۂ معراج ایک باطنی چیز ہے، اور مخفی راز ہے، کپڑے اور اشیائے محسوسہ میں سے نہیں ہے ...... خرقۂ معراجیہ ایک مخفی راز ہے، جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف سے ہر اس شخص کو ملا جو اس نعمتِ عظمیٰ کے لائق تھا..... ...... خرقۂ معراجیہ ایک قسم کی خصوصیت تھی جو ان بائیس حضرات کے سوا کسی کو نصیب نہیں ہوئی، اس خصوصیت کو حضرت خواجہ نصیرالدین چراغ دہلیؒ اپنے ساتھ قبر میں لے گئے۔" (مقابیس المجالس ص ۲۵۶) ترجمہ

لے اسی نسبت سے دلّی کو بائیس خواجہ کی چوکھٹ کہتے ہیں

خرقہ اور گلیم کا اسرائیلیات سے دور کا بھی رشتہ نہیں ہے، اور نہ اسرائیلیات سے ان کا رشتہ جوڑا جا سکتا ہے، ایسا گمان کرنا کم علمی اور نافہمی کی علامت ہے، خرقۂ معراجیہ کا اور ملائکہ کی گلیم پوشی کا ذکر ان کتابوں میں بھی ہے، جنہیں مخالفین ملفوظات نہایت درجہ مستند اور ادب صوفیہ میں بے مثل تسلیم کرتے ہیں، ان میں یہ روایت حضرت محبوب الٰہیؒ سے منقول ہے:—

"بعد ازاں از کرامت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حکایت فرمود کہ آں روز او چہل ہزار دینار بیاورد گلیمے پوشیدہ و میخے براں زدہ بخدمت رسول علیہ السلام بیامد ہماں زماں جبرئیل علیہ السلام بحضرت رسالت آمد گلیمے پوشیدہ و میخے براں زدہ، رسول علیہ السلام پرسید کہ ایں چہ لباس است جبرئیل گفت یا رسول اللہ امروز ہمہ ملائکہ را فرمان شدہ است تا بموافقت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ گلیمے پوشیدہ و میخے براں زدہ"

(فوائد الفواد ص ۲۳۲، سیر الاولیاء ص ۳۴۳)

"اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بزرگی کے متعلق حکایت بیان فرمائی کہ جس دن وہ چالیس ہزار دینار لائے تھے اس دن وہ کمبلی پہنے ہوئے اور کانٹے لگائے ہوئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اسی وقت جبرئیل بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے وہ بھی کمبلی پہنے ہوئے تھے اور اس میں کانٹے لگا رکھے تھے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت کیا کہ یہ کیا لباس ہے، تو انہوں نے بتایا کہ یا رسول اللہ آج تمام فرشتوں کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی موافقت میں کمبلی پہننے کا حکم ہوا ہے سب نے کمبلی پہنی ہے اور اس میں کانٹے لگائے ہیں۔"

حضرت داتا گنج بخش سید علی ہجویریؒ (المتوفی ۴۶۵ھ/۱۰۷۲ء) نے بھی اس روایت کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور لکھا ہے:—

صدیق اکبر اندر حال تجریدش جامہ صوف پوشیدہ (کشف المحجوب ص ۳۲)

حضرت محبوب الٰہیؒ نے یہ بھی روایت بیان فرمائی ہے، امیر خورد کرمانیؒ لکھتے ہیں:-

سلطان المشائخ می فرمود پیغمبر صلی اللہ
علیہ وسلم در شب معراج از حضرت
عزت خرقہ یافت آں را خرقہ فقر گویند
بعدہ صحابہ را طلب کرد و گفت من از
حضرت عزت خرقہ یافتہ ام و مرا فرمان
است کہ ایں را بیکے بدہم بعدہ پیغمبر
صلی اللہ علیہ وسلم روئے سوئے ابوبکرؓ کرد
و فرمود اگر من ایں خرقہ بتو بدہم تو چہ
کنی؟ ابوبکرؓ گفت من صدق ورزم
و طاعت کنم و عطا کنم بعدہ حضرت
عمر رضی اللہ عنہ را فرمود، اگر من ایں
خرقہ بتو بدہم تو چہ کنی؟ عمرؓ گفت
عدل کنم و انصاف نگاہ دارم، بعدہ
از حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پرسید
اگر من ایں خرقہ بتو بدہم تو چہ کنی
عثمانؓ گفت من اتفاق کنم و سخاوت
ورزم، بعدہ علی رضی اللہ عنہ پرسید
اگر من ایں خرقہ را بتو بدہم تو چہ کنی؟
علیؓ گفت من پردہ پوشی کنم

حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا کہ حضور
اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج
میں جو خرقہ اللہ پاک سے پایا اسے خرقۂ فقر
کہتے ہیں پھر صحابہ کرامؓ کو بلایا اور فرمایا
کہ میں نے اللہ پاک سے خرقہ پایا ہے۔
اور مجھے حکم ہے کہ میں یہ کسی ایک کو دوں گا
پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت
ابوبکر صدیقؓ کی طرف رخ کیا اور دریافت
فرمایا کہ اگر میں یہ خرقہ تمہیں دوں تو
تم کیا کرو گے، حضرت ابوبکر صدیقؓ
نے جواب دیا کہ میں سچائی اختیار کروں گا
عبادت کروں گا اور بخشش کروں گا، پھر
حضرت عمر فاروقؓ سے دریافت فرمایا
اگر میں یہ خرقہ تمہیں دوں، تو تم
کیا کرو گے، انہوں نے جواب
دیا کہ میں انصاف کروں گا اور انصاف
کی نگرانی کروں گا، پھر حضرت عثمانؓ
غنیؓ سے دریافت فرمایا کہ اگر یہ خرقہ
میں تمہیں دوں تو تم کیا کرو گے۔

و عیب بندگان خدائے عزوجل بپوشم
آں خرقہ بر علی داد کرم اللہ وجہہ و فرمود
فرمان خدائے عزوجل بود، ہر کہ ایں
جواب گوید، ایں خرقہ او را بدہی۔
(فوائد الفواد ص ۹۶، سیر الاولیاء
ص ۳۴۲، ۳۴۳ ج)

انھوں نے عرض کیا کہ میں اتفاق
اور باہمی میل جول سے کام لونگا اور
سخاوت کرونگا، پھر حضرت علیؓ سے دریافت
فرمایا کہ اگر یہ خرقہ میں تمہیں دوں تو
تم کیا کروگے، حضرت علیؓ نے عرض
کیا کہ میں عیب پوشی کروں گا اور خدا
کے بندوں کے عیبوں کو چھپاؤں گا۔
آپ نے وہ خرقہ حضرت علیؓ کو دے دیا اور
فرمایا کہ مجھے اللہ پاک کا یہی حکم تھا
کہ جو یہ جواب دے اسے یہ خرقہ
دے دینا۔

حضرت داتا گنج بخش سید علی ہجویریؒ نے لکھا ہے :۔

شعار متصوفہ لبس مرقعہ است و
لبس مرقعات سنت است، ازاں
جاکہ رسول گفت علیہ السلام علیکم
بلبس الصوف تجدوا حلاوۃ
الایمان فی قلوبکم، و دیگر یکے گوید
از صحابہؓ کان النبی صلی اللہ علیہ
وسلم یلبس الصوف و یرکب
الحمار... حسن بصریؒ گوید رحمۃ اللہ
... ہفتاد بدری را دیدم ہمہ را

گدڑی پہننا صوفیوں کا معمول ہے،
اور گدڑی پہننا سنت ہے، اس لئے
کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد
ہے کہ اون پہننا اپنے لئے لازم جانو گے
تو تم اپنے دلوں میں ایمان کی حلاوت
پاؤگے، (صحابیوں سے) ایک (صحابی)
یہ بھی کہتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ
وسلم اون پہنتے تھے اور خچر پر سوار ہوتے
تھے ..... حضرت

جامہ پشمین بود — حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ستر اصحاب بدر کو دیکھا ہے، سب ہی صوف پوش تھے۔
(کشف المحجوب ص ۴۳)

خرقہ ابراہیمی کی روایت شیخ الشیوخ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ المتوفی ۶۳۲ھ / ۱۲۳۴ء نے اپنی موقر تصنیف عوارف المعارف (ص ۱۲۰) میں بھی نقل فرمائی ہے ادب صوفیہ میں عوارف المعارف کا پایۂ اعتبار متفق علیہ اور مسلم ہے اس کے پانچ باب حضرت محبوب الٰہی نے حضرت بابا صاحب سے پڑھے تھے۔[1]

بہر نوع ان موقر بیانات سے یہ واضح ہے کہ خرقہ و گلیم کا تعلق عین اسلامیات سے ہے، اور ان کا استعمال سنت ہے، خرقہ ابراہیمی اور خرقہ معراجیہ لطیفۂ غیبی سے ہیں، اور خرقہ فقر کو ان سے گہری نسبت ہے، اور صوفیۂ کرام کے استعمال کی برکت سے خرقہ غیر معمولی اوصاف کا مالک ہے، حضرت محبوب الٰہیؒ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ از فرزندان حضرت مرتضیٰ علی علیہ السلام و کرم اللہ وجہہ است و یک شعبہ خرقہ حضرت امیر المومنین مرتضیٰ علی علیہ السلام از آں جانب می رود۔ (سیر الاولیاص ۳۴۹ ج)

۲۰ ۔ احادیث کی تدوین

مسلمانوں کا یہ زندۂ جاوید کارنامہ ہے کہ انہوں نے اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قول و عمل کی کامل نگہداشت کی، اور محنت و خلوص سے احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدون کیا۔ اس باب میں دنیا کی کسی قوم کو مسلمانوں سے ہمسری کا حق حاصل نہیں ہے، انہوں نے جمع و تدوین ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ احادیث کو پرکھنے کے لئے اصول و ضوابط بھی بنائے، اور پرکھ پرکھ کے احادیث کے مجموعات مرتب کئے، اصول حدیث مستقل فن ہے اور علم کا ایک گرانقدر شعبہ ہے اس کے ساتھ ہی علم اسماء رجال وجود میں آیا، جو علوم و فنون میں منفرد حیثیت کا مالک ہے جس کی بدولت آج تک مسلمانوں کو سربلندی حاصل ہے۔

---

[1] سیر الاولیاء ص ۱۰۶ ج

صوفیۂ کرام میں بھی جید عالم گزرے ہیں، وہ اصول حدیث کے قائل اور اسے معتبر مانتے تھے، بلکہ اصول حدیث کا درس بھی دیتے تھے [۱] اور حدیث کی مشہور اور معتبر کتابوں کو اسی نگاہ عظمت سے دیکھتے تھے جس سے علمائے محدثین دیکھتے تھے، حضرت محبوب الہٰی کا مشہور مقولہ ہے، آنچہ در صحیحین است آں صحیح است (فوائد الفواد ص ۱۰۳)

اور اگرچہ احادیث مبارکہ کا بے پناہ ذخیرہ مہیا ہو چکا ہے، لیکن پھر بھی کوئی اس کا قائل نہیں کہ سب ہی کچھ مہیا ہو گیا ہے، اس تصور کو کہ سب ہی کچھ مہیا ہو گیا ہے احصا سے تعبیر کرتے ہیں اور احصا کے تصور کو نا رَوا قرار دیتے ہیں، محمد بن اسمٰعیل امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور مقولہ ہے۔

"مجھے ایک لاکھ صحیح حدیثیں یاد تھیں، ان میں سے میں نے چھ ہزار کے انتخاب سے صحیح بخاری کو تدوین کیا ہے"

چورانوے ہزار صحیح حدیثوں کا ذخیرہ جو محفوظ نہیں ان میں سے بھی کچھ ہو سکتی ہیں، جو صوفیائے کرام کے ملفوظات کی زینت ہیں۔

صوفیۂ کرام متقیوں سے زیادہ متقی اور بصیرت باطنی سے مالا مال تھے، صاحب ذوقِ سلیم بھی تھے، اور کلام نبی صلعم سے لذت آشنا بھی تھے، اگر وہ کیفیت اندوز نہ ہوتے تو بے تکلف ان کی زبان پر آجاتا تھا۔

لیس فیہ ذوق کلامہ علیہ السلام [۲] (اصول السماع قلمی ص ۲۴)

---

[۱] سیر الاولیا ص ۱۰۶، اصول حدیث کی معتبر کتاب تمہید الابتدا (تصنیف شیخ ابو شکور سالمی) حضرت محبوب الٰہیؒ نے حضرت بابا صاحب ہی سے پڑھی تھی، شیخ ابو شکور سالمیؒ کا مزار پر انوار حصار کے مضافات میں ہے اور اب تک محفوظ ہے۔

[۲] یہ بھی ان میں سے ایک اصول ہے۔ جن پر احادیث کو پرکھا جاتا ہے، محدثین کرام نے حدیث کی فصاحت و بلاغت قوت تاثیر و نفوذ فی القلب اور انوار نبوت کو بھی علامت قرار دیا ہے۔
(انتخاب الترغیب والترہیب امام زکی الدین المنذری کی ص ۱۰۸ جلد اول)

لہٰذا حضرت صوفیہ کرام نے جن احادیث نبوی کو اپنایا ہے ان کے متعلق بھی کلام نہیں کیا جا سکتا اور آداب حدیث کے باب میں صوفیہ کرام کا خصوصی نقطۂ نظر ہے جس کے متعلق حضرت محبوب الٰہیؒ کا یہ ارشاد ہے۔

حدیثے کہ مردم بشنوند نتواں گفت کہ ایں حدیث رسول صلعم نیست، اماں ایں تواں گفت، و کیتیے کہ ایں حدیث جمع کردہ اند و اعتبار یافتہ اند نیامدہ است

(فوائد الفواد ص ۲۳۳)

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہے کہ حدیث خرقہ کا بھی معتبر مقام ہے، خرقہ انبیاء علیہم السلام کے شعار کی یادگار ہے۔ اس کا اسرائیلیات سے رشتہ قرار دینا صحیح نہیں ہے اس کے علاوہ اس روایت خرقہ سے بھی یہ واضح ہے کہ اسرار الاولیاء حضرت باباصاحبؒ کے معتبر ملفوظات کا مجموعہ ہے اور بعد کی کتب ملفوظات کا ماخذ ہے، اور کوئی ایسی معقول دلیل نہیں ہے جس کی بنا پر اسرار الاولیاء کو معتبر مانا جا سکے۔

۲۱۔ فصول کا اختتامیہ

اسرار الاولیاء میں ۲۲ فصلیں ہیں ہر فصل کے آخر میں اختتام کی کیفیت لکھی ہے، اور ان کی تفصیل یہ ہے، (۱) چار فصلوں کے اختتام پر یہ ذکر ہے کہ اذان کی آواز آئی تو مجالس ختم ہوئیں، ان چار میں سے دو اذانیں ظہر کی تھیں (۸-۱۲) دو اذانوں کے متعلق یہ صراحت نہیں کہ وہ کس وقت کی تھیں (۷-۹) گمان غالب یہ ہے کہ وہ بھی ظہر ہی کی ہوں گی۔

(۲) تین کے اختتام پر آپ عالم تحیر میں کھڑے ہو گئے تھے، (۲-۲۱-۲۲)

(۳) ایک کے اختتام کے بعد آپ تلاوت قرآن میں مشغول ہو گئے تھے (۱۸)

(۴) ایک کے اختتام کے بعد آپ دولت خانہ میں چلے گئے تھے، (۵)

(۵) ایک کے اختتام کے بعد آپ مشغول ہو گئے تھے، (۹)

(۶) تین کے اختتام کے بعد آپ بعجلت اٹھ کھڑے ہوئے، (۱۰-۱۷-۲۰)

(۷) پڑھنے کے بعد آپ اٹھ کھڑے ہوئے چلے گئے۔ (۲-۳-۶-۱۴-۱۵-۱۷)

(۸) ایک کے بعد آپ اٹھ کھڑے ہوئے۔ (۱۱)

(۹) ایک کے اختتام پر آپ اٹھے اور عجلت سے اندر چلے گئے۔ (۱۳)

بدواں برخاست وبدواں درروں رفت سے مراد یہ ہے کہ بعجلت آپ اٹھ کھڑے ہوئے اور بعجلت اندر تشریف لے گئے، اندر تشریف لے جانے سے مراد غالباً حجرے میں تشریف لے جانا ہے، ایک جگہ یہ تشریح بھی ہے کہ اندر جا کر آپ تلاوت قرآن میں مشغول ہو گئے، تین کے اختتام پر یہ ہے بدواں درروں رفت، بعجلت اندر چلے گئے، غالباً مجالس میں وقت زیادہ صرف ہوا تھا معمولات کو پورا کرنا ہی تھا اس لئے آپ عجلت اندر تشریف لے گئے، مخدوم نصیر الدین چراغ دہلی نے فرمایا ہے :

بیشتر احوال در مسجد اجودھن مشغول بودے (خیر المجالس ص ۸۹)	آپ اکثر اجودھن (پاکپتن) کی مسجد میں مشغول رہتے تھے۔

گویا کہ مسجد ہی میں اذان ہوتی، اور مسجد ہی میں نماز باجماعت پڑھتے۔ خانقاہ میں اذان ونماز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے[۱] اس لئے یہ کہنا لا حاصل ہے کہ بابا صاحبؒ کی خانقاہ میں کبھی نماز باجماعت نہیں ہوتی تھی، تو ظاہر ہے کہ مسجد کے قریب ہوتے اور مسجد میں اکثر مشغول رہنے کی بنا پر اس کی ضرورت ہی نہ تھی۔ مجالس کا اختتام عموماً ایسے اوقات میں ہوتا تھا، جو اذان ونماز کے اوقات نہ ہوتے تھے، بائیس ۲۲ میں سے صرف چار کا اختتام اذان کی آواز پر ہوا ہے۔ غالباً یہ چاروں مجالس موسم سرما کی تھیں، جو اذان ظہر کے وقت تک منعقد رہیں، بدولت خانہ درروں رفت سے مراد غالباً گھر میں تشریف لے جانا ہے

[۱] حضرت محبوب الٰہی پنجگانہ نماز اپنے جماعت خانہ میں ادا فرماتے تھے، اس عہد میں غیاث پورہ میں کسی مسجد کا ذکر کسی تاریخ میں نہیں ملتا، کیونکہ آبادی چند مکانات پر مشتمل تھی جو جماعت خانہ سے متصل تھے، اسی لئے آپ جامع مسجد کیلوکھری میں نماز جمعہ پڑھتے تھے۔ سیر الاولیاء ص ۱۲۷

اذان کے بعد ہی جو آپ دولت خانہ میں تشریف لے گئے تو یقیناً کسی ضرورت سے گئے ہونگے اور جماعت میں آ شریک ہوئے ہونگے، چونکہ صرف اختتام کی کیفیت بتانی مقصود تھی، بعد کی تفصیلات میں جانا مقصود نہ تھا، اس لئے اس کا ذکر بھی نہیں کیا اور نہ کرنا چاہیئے تھا۔

کتابت کی غلطیاں پیش نظر نسخۂ اسرار الاولیاء میں بکثرت غلطیاں ہیں، مطبع نولکشور کانپور کی مطبوعہ کتابیں بکثرت مطالعہ میں آئی ہیں، مگر اس قدر اغلاط سے بھری کوئی کتاب دیکھنے میں نہیں آئی، اسماء کا تو ذکر ہی کیا املا کی معمولی معمولی بکثرت غلطیاں ہیں، ایسا لگتا ہے کہ جو نسخہ کاتب کے پیش نظر تھا وہ بھی اغلاط سے پر تھا، کاتب بھی فارسی زبان سے قطعاً ناواقف تھا اس کے علاوہ نہ کسی نے کاپی کی تصحیح کی اور نہ پروف کو دیکھا، اور متواتر غلط نسخے شائع ہوتے رہے، اور وہ نسخہ بھی جو ۱۳۳۴ھ / ۱۹۱۵ء میں بار ششم شائع ہوا تھا کثرت اغلاط سے مملو ہے۔ اغلاط کی امثلہ یہ ہیں۔

غلط	صفحہ	صحیح
(۱) دوگانہ بگذارد۔ ودو زانو	ص ۷	دوگانہ بگزارد، و دو زانو
(۲) بر نور تجلی کنم	ص ۷	بر تو تجلی کنم
(۳) رفت ایماں	ص ۱۱	رخت ایماں
(۴) کارزار گفتگوے گزشت	ص ۱۴	کارانہ گفتگوے بگزشت
(۵) در ذکر رزق رجزان	ص ۱۵	در ذکر رزق و جزاں
(۶) دور دراز	ص ۱۷	دو روزہ
(۷) اور انکار برکرم حق	ص ۱۸	اورا نگاہ برکرم حق
(۸) سنگ رابشگفتم	ص ۱۹	سنگ رابشکنم

(۹) شش نوعت	ص ۲۱	شش نوع است
(۱۰) صبح بدبد	ص ۲۳	صبح بدمید
(۱۱) ادقات	ص ۶۱	ملاقات
(۱۲) آزادی	ص ۶۲	آرزوے
(۱۳) بلاند	ص ۶۷	بداند
(۱۴) بدوال دروں رفت	ص ۷۱	بدواں دروں رفت
(۱۵) درمیان رفتہ است		در بیاباں رفتہ است

اسماء کی غلطیاں

(۱) چوں برادرم مولانا بہاوالدین زکریا قدس اللہ سرہ العزیز کار خود را درعشق و محبت بتکمیل رسانیدہ بخدمت شیخ بہاءالدین سہروردی قدس اللہ سرہ العزیز پیوست	ص ۴۱	چوں برادرم مولانا بہاءالدین زکریا قدس اللہ سرہ العزیز کار خود را درعشق و محبت بتکمیل رسانیدہ بخدمت شیخ شہاب الدین سہروردی قدس اللہ سرہ العزیز پیوست۔
(۲) این سخن بسمع شیخ بہاوالدین نوراللہ مرقدہ رسید فرمود	ص ۴۰	ایں سخن بسمع شیخ شہاب الدین نوراللہ مرقدہ رسید۔
(۳) اے درویش برادر شیخ جلال الدین تبریزی رحمۃ اللہ بعد از نقل پیر خود بخدمت شیخ بہاءالدین رحمۃ اللہ علیہ پیوست، اما چنداں خدمت کرد کہ ہیچ خدمتگارے آں چناں خدمت نہ کند۔	ص ۲۷	اے درویش برادر شیخ جلال الدین تبریزی رحمۃ اللہ علیہ بعد از نقل پیر خود بخدمت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ پیوست، اما چنداں خدمت کرد کہ ہیچ خدمتگارے آں چناں خدمت نہ کند (اسرارالاولیاء کے

متن	صفحہ	تبصرہ
		جس نسخے سے مولوی عبدالاحد مرحوم نے ترجمہ کیا ہے اس میں برابر نہیں ہے 'برادر ہے'، مناسب یہ ہے کہ کچھ بھی نہ ہو۔)
(۴) اے درویش دعاگوئے را برادرے بود شیخ نجم الدین نام او بود۔	ص ۱۹	اے درویش دعاگوئے را برادرے بود، شیخ نجیب الدین نام او بود،
(۵) اے درویش وقتے شیخ جلال الدین تبریزی و دعاگوئے یک جا بودیم مولانا علاءالدین صوفی می گزشت، نظر شیخ براو افتادہ او را بخواندہ جامہائے خود برو داد شیخ بار سورۂ اخلاص بخواند و برو دمید حق تعالیٰ بر مولانا علاءالدین چنداں برکت و نعمت داد و بیداو گردانید (از برکت شیخ جلال الدین تبریزی بود)	ص ۳۰	اے درویش وقتے شیخ جلال الدین تبریزی و دعاگوے یک جا بودیم مولانا علاءالدین اصولی می گزشت الخ (مولانا علاءالدین اصولیؒ بدایوں میں تھے، اور حضرت محبوب الٰہیؒ کے استاد تھے، اور یہ ان ہی کا واقعہ ہے، اصولی کی بجائے صوفی لکھ دیا گیا ہے) چنداں برکت و نعمت داد (بیداو تصحیح طلب ہے) گردانید۔
(۶) مولانا بدرالدین اسحاق و چند نفر درویش دیگر بخدمت حاضر بودند۔	ص ۱۷	مولانا بدرالدین و چند نفر (جس قلمی نسخے سے مولوی عبدالاحد مرحوم نے اسرارالاولیاء کا ترجمہ کیا ہے اس میں یہ نام نہیں ہے) البتہ اس نام کے اور بھی بزرگ تھے، جو شیخ سیف الدین باخرزیؒ سے اور شیخ نجم الدین کبریؒ سے فیض یافتہ تھے، ہندوستان آئے تھے، حضرت محبوب الٰہیؒ سے بھی فیض پایا تھا۔

			سن وفات ۳۱۶ھ ہے، غالباً بدرالدین اسحاقؒ سے مراد بھی بزرگ تھے، جو سمرقند کے باشندے تھے، ان کا مزار موضع سنگولہ دہلی میں ہے۔
(۷) خدمت خواجہ قطب الدین بیاد ملاقی شد	ص ۸،	خدمت سید[1] قطب الدین بیاد ملاقی شد،	

تحریف (جنگ غولان بیابانی) قلمی کتابوں میں تحریف کی امثلہ تو عموماً ملتی ہی ہیں، اسرار الاولیاء کا نسخہ بھی اس سقم سے مبرا نہیں ہے لیکن اہم ترین تحریف کا ایک واقعہ وہ ہے جو اسرار الاولیاء فصل ہفتم ص ۳۸ میں ہے اور جو سورۂ اخلاص (قل ھو اللہ احد) کے اوصاف وفضائل اور خواص سے متعلق ہے، اسے واقعۂ جنگ خیبر سے متعلق کر دیا ہے، وہ دراصل جنگ خیبر سے متعلق نہیں ہے بلکہ جنگ غولان بیابانی سے متعلق ہے، حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا ہے:

"ایک دفعہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جنگ غولان بیابانی پر مامور فرمایا تھا، امیر المومنین (حضرت علی) عرصے تک لڑائی میں مشغول رہے مگر فتح یابی نصیب نہ ہوئی، ایک دن آپ نے ایک نعرہ بلند کیا کہ زمین و آسمان کے طبق گونج اٹھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گوش مبارک تک یہ آواز پہنچی۔ اتنے میں حضرت جبرئیل علیہ السلام آئے اور سورہ اخلاص[2] لائے، اور کہا کہ یہ سورت ان کے پاس بھیج دیجیے کہ

---

[1] نوٹ: سادات کرام کو خواجہ سے بھی یاد کیا جاتا ہے، اس میں کچھ مضائقہ نہیں کہ سید قطب الدین کو خواجہ قطب الدین لکھ دیا ہے اور چونکہ بختیار اوشی یا بختیار کاکی نہیں ہے، اس لیے تسامح بھی واقع نہیں ہوتا۔ [2] حضرت جبرئیلؑ کے سورۂ اخلاص کو لے کر آنے سے مراد سورہ کا نزول نہیں ہے کیونکہ سورۂ اخلاص مکی ہے اور یہ بعد کا واقعہ ہے، تفاسیر کا مطالعہ شاہد ہے کہ بعض آیات جو مکی ہیں حضرت جبرئیلؑ موقع کی مناسبت سے مکرر بھی لے کے آتے تھے۔

وہ اس کی کثرت سے تلاوت کریں، چنانچہ آپ نے فوراً بھیج دی، حضرت علیؓ نے ایک شبانہ روز اس کی مزاولت کی تھی کہ وہ ہم سر ہو گئی، اور قلعہ فتح ہو گیا۔"

(راحت المحبین ص۲۰۳ ترجمہ مجتبائی)

راحت المحبین حضرت امیر خسروؒ کی موقر تالیف ہے جو حضرت محبوب الٰہیؒ کے ملفوظات پر مشتمل ہے، اسے حضرت امیر خسروؒ نے کتاب افضل الفوائد کے بعد مرتب فرمایا تھا، یہ کتاب شمائل الاتقیاء و دلائل الاتقیاء کی فہرست ماخذات میں بھی شامل ہے، جو حضرت محبوب الٰہیؒ کے بزرگ خلیفہ مولانا برہان الدین غریب (المتوفی ۷۳۸ھ / 1337) کی نگرانی میں مرتب ہوئی تھی، جس کا پایۂ اعتبار مسلم ہے، مولانا شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ نے حضرت امیر خسروؒ کے مرتب کردہ کتب ملفوظات کے متعلق فرمایا ہے۔

امیر خسروؒ ہم ملفوظ جمع کردہ لیکن آں قدر مقبول نیست (ملفوظات شاہ عبد العزیز محدث دہلوی ص ۲۷)

ضرورت ہے کہ اسرار الاولیا کے قدیم قلمی نسخوں سے مقابلہ کر کے مذکورہ روایت کی تصحیح کی جائے، مجموعی اوصاف سے اسرار الاولیا حضرت بابا صاحبؒ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے اور قدیم سے اہل کمال اس کی اہمیت کے معترف ہیں، اور اس میں وہی کچھ ہے جو دیگر کتب ملفوظات میں ہے، اور جو بھی کچھ ہے شریعت و طریقت کے مطابق ہے،

وقت کا تقاضا وقت کا اہم تقاضا یہ ہے کہ مخلص عقیدت مند مجتمع ہوں، اور ایسی پھر غور کریں کہ یہ طرفہ تماشہ کیا ہے کہ کیوں اسرار الاولیا کو غیر مستند اور جعلی قرار دیا جا رہا ہے، مدافعت کی تدبیر یہ ہے کہ اسرار الاولیا کو صحت و مقابلہ سے مزین کر کے منظر عام پر لایا جائے، یہی نہیں بلکہ اس کا صحیح ترجمہ بھی شائع کیا جائے، اور ہر زبان میں کیا جائے، اسے رواج دیا جائے، وسیع اشاعت کی جائے، روحیں اس کی متلاشی ہیں، اس سے معاشرے میں سدھار آئے گا، اور اخلاقی قدریں جلوہ گر ہوں گی، یہ کام مخلص عقیدتمند ہی انجام دے سکتے ہیں وہ نہیں جو حصول مقاصد کی

طبع میں عقیدت مندی کا بہروپ بھرے بیٹھے ہیں، ان پر تو یہ مصرع صادق آتا ہے، ؏

دوست وہ کرتے ہیں دشمن سے جو ہو سکتا نہیں

بلاشبہ اگر مخلص عقیدت مند کمر ہمت باندھیں تو اس مشکل کو آسان کر سکتے ہیں، اور ہدایت کی روشنی سے دنیا میں اجالا کر سکتے ہیں، یہ بہت بڑی نیکی ہے، اللہ پاک ہی بہتر جانتا ہے کہ کس کے لیے مقدر ہے، راقم حروف سے جو کچھ بن پڑا کیا ہے، کر رہا ہے اور کرتا رہے گا، انشاء اللہ اس کے لیے یہی توشہ آخرت ہے، اللہ پاک قبول فرمائیں۔

اسرار الاولیاء کے قدیم قلمی نسخے اسرار الاولیاء کو مرتب کرنے کے لیے اسرار الاولیاء کے قدیم قلمی نسخوں سے آگاہی، اور ان سے مقابلہ اسرار الاولیاء کی صحت کیلیے اشد ضروری ہے، اس ضرورت کے اقتضا سے میں نے ہندوستان کی مشہور مشہور لائبریریوں سے جو معلومات فراہم کی ہیں وہ پیش کرتا ہوں، مدعا اس سے یہ ہے کہ صحت و مقابلہ سے اسرار الاولیاء کا کوئی نسخہ مرتب ہو کر شائع ہو جائے اور منظر عام پر آجائے جو معاشرے کے سدھار میں بیحد ممد و معاون ہوگا،

اگر توفیق الٰہی سازگار ہوئی اور حیات مستعار نے ساتھ دیا تو میں خود اس خدمت کو انجام دوں گا مگر میں چراغ سحری ہوں، چاہتا ہوں کہ کوئی جواں سال و جواں ہمت اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے اور اپنے اخلاص اور اپنی کوشش سے دنیا میں اجالا کر دے، اگر خدائے پاک نے کسی اولوالعزم کو توفیق دی، اور اس نے اس کام کو سنبھالا تو یہ میرے لیے انتہائی مسرت کا باعث ہوگا، اور جو تعاون میں دے سکتا ہوں، اس میں مجھے ذرا بھی تامل نہ ہوگا انشاء اللہ، اسرار الاولیاء کے قدیم قلمی نسخے میرے علم میں آئے ہیں وہ یہ ہیں:-

(۱) مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تین نسخے ہیں، ایک نسخہ ۱۰۰۸ھ 1599 کا مکتوبہ ہے دوسرا ۱۰۸۲ھ 1671 کا مکتوبہ ہے اور تیسرے پر سنہ کتابت مرقوم نہیں ہے۔

(۲) آندھرا پردیش گورنمنٹ اورینٹل مینوسکرپٹس لائبریری اینڈ ریسرچ انسٹیٹیوٹ

حیدرآباد میں دو نسخے ہیں، مگر ان میں سنہ کتابت مندرج نہیں ہے۔

۳۔ سالار جنگ میوزیم حیدرآباد میں ابتدائی بارہویں صدی ہجری کا ایک نسخہ ہے۔

۴۔ رضا لائبریری رامپور میں ایک نسخہ ہے، سنہ کتابت تحریر نہیں ہے۔

۵۔ عربی فارسی ریسرچ انسٹیٹیوٹ ٹونک (راجستھان) میں ایک نسخہ ہے، سنہ کتابت درج نہیں ہے۔

نوٹ:۔ میرے پاس ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کلکتہ کی کیٹلاگ شکستہ اور کرم خوردہ ہے، اس لیے وہاں کے نسخے کا پتہ نہیں چل سکا۔ خط لکھنے پر جواب بھی نہیں آیا۔ اگر کوئی صاحب وہاں کے یا اور کہیں کے قلمی نسخہ کی نشان دہی کر سکیں تو ممنون ہوں گا۔ میرا پتہ یہ ہے، اخلاق حسین دہلوی لال محل بستی حضرت نظام الدین اولیاءؒ نئی دہلی، ۱۱۰۰۱۳۔

بشکریہ معارف، اعظم گڑھ
نومبر، دسمبر ۱۹۸۰ء جنوری، فروری ۱۹۸۱ء

راحت القلوب

۱۔ تعارف | راحت القلوب (فارسی نسخہ) مطبوعہ ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء مطبع قاسمی میرٹھ، حجم ۸۶ صفحات سائز ۲۰×۲۶/۸ مسطرہ ۲ سطری قلم خفی۔ یہ چوبیس مجالس ملفوظات کے بیانات کا مجموعہ ہے، جو حضرت بابا فرید مسعود گنج شکر قدس اللہ سرہ العزیز کے ملفوظات پر مشتمل ہے، اس کے جامع حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاءؒ ہیں۔ اس کتاب کا گہرا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہ فی الحال چند اوراق منتشرہ کا مجموعہ ہے۔

۲۔ استناد و قدامت | یہ صحیح ہے کہ حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاءؒ نے حضرت بابا فرید مسعود گنج شکر قدس اللہ سرہ العزیز کے ملفوظات کو جمع فرمایا تھا، چنانچہ ۲۸ شوال ۷۰۸ھ کی مجلس میں آپ نے فرمایا:۔

کلماتے کہ از شیخ استماع داشتم	جو باتیں میں نے شیخ سے سنیں، وہ میں نے
بنوشتم تا ایں غایت آں مجموعہ	لکھ لیں، اور وہ مجموعہ ملفوظات اب
برمن است۔ (فوائد الفواد ص ۱۳۱)	تک میرے پاس محفوظ موجود ہے۔

اس بیان کا تعلق خواجہ امیر حسن علاء سجزیؒ (س ن ح ر ی) کی اس عرض داشت سے ہے جو انھوں نے حضرت محبوب الٰہیؒ کے ملفوظات کو جمع کرنے کی اجازت حاصل کرنے کے لیے حضرت والا کی خدمت میں پیش کی تھی، حضرت محبوب الٰہیؒ نے اس سے متعلق جو کچھ فرمایا ہے اس کا تعلق اجازت سے بھی ہے اور ہمت افزائی سے بھی ہے۔ اس گفتگو میں کتاب کے نام سے متعارف کرانا خالی از تکلف نہ ہوتا، کیونکہ مدعا اسی سے حاصل تھا جو کچھ آپ نے فرمایا تھا۔

حضرت محبوب الہیٰؒ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "تا ایں غایت آں مجموعہ بر من است" اس سے بخوبی یہ تشریح ہو جاتا ہے کہ اس وقت تک یہ مجموعۂ ملفوظات معروف و متداول نہ تھا، اس لیے بھی نام سے متعارف کرانے کی چنداں ضرورت نہ تھی، جو بھی آداب مجلسی سے آگاہ اور رمز شناس رہیں وہ جانتے ہیں کہ ضمنی اذکار میں صورت حال یہی ہوتی ہے کہ کتاب کا نام نہیں لیا جاتا بلکہ کبھی اشارہ کنایہ سے اور کبھی مصنف کے ذکر پر اکتفا کر لیا جاتا ہے کہ فلاں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے، خیر المجالس میں اور متعدد کتب میں اس کی مثالیں ملتی ہیں، حضرت محبوب الہیٰؒ کا یہ ارشاد اقتضائے حال کے بالکل مطابق ہے، اور اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ جو کتاب آج ان ملفوظات پر مشتمل مانی جاتی ہے اور مانی جاتی رہی ہے اور جو معروف و متداول ہے اور داخلی و خارجی شواہد بھی اس کے حق میں ہیں، پھر بھی وہ کوئی اور کتاب ہے، مذکورہ ملفوظات کا مجموعہ نہیں ہے، یہ منطق لایعنی ہے، قابل قبول نہیں ہے، آئندہ شواہد بتائیں گے کہ راحت القلوب ان ہی ملفوظات کا مجموعہ ہے جن کا ذکر حضرت محبوب الہیٰؒ نے فرمایا تھا۔

یہ بھی ذہن نشین رکھنے کے لائق نکتہ ہے کہ یہ مجموعۂ ملفوظات حضرت محبوب الہیٰؒ کو اس قدر مرغوب و محبوب تھا کہ نصف صدی کے قریب گزر چکی تھی، مگر آپ نے اسے کلیجے سے لگائے رکھا اور ضائع ہونے نہیں دیا، کتنے پیار سے فرمایا ہے "تا ایں غایت آں مجموعہ بر من است" مزید یہ بھی فرمایا:-

ہم دراں ایام مردے مرا کاغذہائے سفید داد یکجا جلد کردہ من آں را	ان دنوں میں ایک شخص نے مجھے سفید کاغذ یکجا جلد بستہ مجھے دیئے، جو میں نے لیے،

لے پروفیسر محمد حبیب مرحوم نے اس عبارت کا کہ "مردے مرا کاغذہائے سفید داد یکجا جلد کردہ" یہ ترجمہ لکھا ہے کہ ایک شخص نے سفید کاغذ جلد بندھا ہوا مجھے دیا (حضرت نظام الدین اولیاءؒ حیات و تعلیمات ص ۵۰) یہ ترجمہ صحیح نہیں ہے، کاغذہا میں علامت جمع موجود ہے، ترجمہ یہ ہونا چاہیے کہ ایک شخص نے جلد بستہ سفید کاغذوں کی بیاض مجھے دی۔

بستدم، فوائد شیخ ہم وراں ثبت کردم، بالا نبشتم سبحان اللہ والحمدللہ ولا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم[1]

اور اس میں حضرت شیخ کے فرمودہ فوائد و اشارات قلم بند کیے، اور پر لکھا سبحان اللہ والحمدللہ ولا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

(فوائد الفواد ص ۱۳۱)

ان بیانات سے بخوبی ثابت ہے کہ حضرت محبوب الٰہیؒ نے حضرت بابا صاحبؒ کے ملفوظات جمع فرمائے تھے، جو آٹھویں صدی ہجری کے ربع اول تک آپ کے پاس محفوظ و موجود تھے، مگر ظنِ غالب یہ ہے کہ اس وقت تک یہ مجموعۂ ملفوظات متداول و معروف نہ تھا، اگر ہوتا تو اعادۂ ذکر کی ضرورت نہ ہوتی، تاہم اس کے مبارک نام کی اطلاع ہمیں اس سے قریب تر عہد ہی میں شمائل الاتقیاء و دلائل الاتقیاء[2] سے ملتی ہے، جو حضرت محبوب الٰہی کے معزز خلیفہ مولانا

---

[1] مطبوعہ نسخہ راحت القلوب (قرآن) میں کلمۂ تمجید سبحان اللہ الخ بھی بالائی حصہ میں مرقوم نہیں ہے، مجھے بھی اس باب میں تردد تھا، مگر مطالعے نے رہنمائی کی اور میرا یہ تردد رفع ہوگیا، مطالعے سے یہ پتا چلا کہ حوادثات روزگار سے نقل و کتابت میں اس قسم کے سہو بکثرت واقع ہوتے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں، یہ تو ہے بھی بے تعلق عبارت، ممکن ہے کہ کسی نے اسی بے تعلقی سے متاثر ہو کر اسے حذف کر دیا ہو، اور فوائد الفواد کا بیان اس کے مطالعے میں نہ ہو، یا ذہن میں محفوظ نہ ہو، قلمی کتابوں میں بعض مربوط عبارتوں کے ایسے جملے بھی محذوف ملتے ہیں جن سے عبارت بے ربط ہو جاتی ہے، اس کا تدارک یہی ہے کہ قلمی نسخوں کی طرف رجوع کیا جائے، بلاشبہ یہ تردد رفع ہو جائے گا، بنظر اختصار اتنے ہی پر اکتفا مناسب ہے، تاہم اہلِ علم کے نزدیک ایسی خامی کسی کتاب کے جعلی ہونے کی دلیل نہیں ہوا کرتی کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ کسی نسخے میں یہ عبارت نہیں ہے؟

[2] شمائل الاتقیاء و دلائل الاتقیاء کا ایک قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کلکتہ کے ذخیرۂ مخطوطات میں ہے اور ایک نسخہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں ہے، اور اسی نام سے میں ایک قلمی نسخہ جو ۱۲۹۶ھ کا مکتوبہ ہے، حضرت مولانا نسیم احمد فریدی صاحب مدظلہ العالی مفتی امروہہ نے عاریتاً مجھے بھیجا تھا، جس سے میں نے استفادہ کیا ہے، اس کی فہرست ماخذات میں ڈیڑھ سو سے زیادہ کتب و رسائل کے نام مندرج ہیں، ان میں سے متعدد کتابیں ایسی ہیں جو نایاب و کمیاب ہیں، ماہنامہ معارف اعظم گڑھ ۱۳۸۷ھ ۱۹۶۷ء کے حاشیہ میں ہے کہ یہ کتاب ۱۳۴۷ھ (1928) میں اشرف پریس حیدرآباد (آندھرا پردیش) سے شمائل الاتقیاء کے نام سے شائع ہوئی تھی۔

برہان الدین غریب ؒ (المتوفی ۷۳۸ھ 1337) کے ایما سے اور ان کی نگرانی میں ان کے لائق ترین مرید مستند اہل قلم مولانا رکن الدین عماد کاشانی دبیر ؒ نے تالیف کی تھی جس کی فہرست آخذات میں اس کا نام موجود و مرقوم ہے۔

محل غور ہے کہ مولانا برہان الدین غریب علیہ الرحمۃ سالہا سال اور مدت مدید تک حضرت محبوب الہیؒ کی خدمت میں رہے اور قریب تر رہے، اور وہ ایسے محب صادق اور برگزیدہ بزرگ تھے کہ مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ انھیں عزیز رکھتے اور ان کا احترام ملحوظ خاطر رکھتے تھے حتی کہ مولانا برہان الدین غریبؒ کی وفات کے بعد بھی مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ کی اس روش میں فرق نہ آیا، وہ حول ماحول سال کے سال ان کا عرس کرتے اور خراج محبت پیش کیا کرتے تھے۔

ان حالات کے پیش نظر اس بدگمانی کی گنجائش نہیں رہتی ہے کہ مولانا برہان الدین غریبؒ جیسے جلیل القدر اور طبقہ اولی کے بزرگ اس سے واقف نہ ہوں کہ مجموعۂ ملفوظات جو راحت القلوب کے نام سے منسوب ہے، ان ملفوظات پر مشتمل نہیں ہے جن کا ذکر خیر حضرت محبوب الہیؒ کی زبان مبارک پر آیا ہے، اگر ایسا ہوتا اور راحت القلوب کوئی جعلی کتاب ہوتی تو یقیناً وہ ہرگز یہ گوارہ نہ کرتے کہ اسے فہرست ماخذات میں شامل کیا جائے۔ لہٰذا شمائل الاتقیاء و دلائل الاتقیاء کی فہرست ماخذات میں راحت القلوب کا شمول اور اس کو حضرت محبوب الہیؒ کی تالیف قرار دینا اس کا بین ثبوت ہے کہ راحت القلوب ان ہی ملفوظات کا مجموعہ ہے جن کا ذکر حضرت محبوب الہیؒ نے فرمایا تھا۔

۷۲۵ھ میں حضرت محبوب الہیؒ نے پردہ فرمایا۔ ۷۲۸ھ 1325 عہد محمد تغلق میں دہلی کا تخلیہ 1328 عمل میں آیا اور بقول ابن بطوطہ دہلی میں کوئی بھی متنفس نہیں رہا تھا (ترجمہ سفرنامہ ابن بطوطہ ص ۱۵۲-۱۵۳) ظن غالب یہ ہے کہ خواجہ رفیع الدین ہارونؒ جنھیں حضرت محبوب الہیؒ نے متولی خانہ و حظیر بنایا تھا (سیر الاولیاء ص ۳۰۲ پ ح) وہ حضرت کے موقوفہ کتب خانے کو اپنے ہمراہ

دیو گیر (دولت آباد) لئے گئے ہوں، ممکن ہے کہ وہیں مولانا برہان الدین غریبؒ نے یا مولانا رکن الدین کاشانیؒ نے وہ نسخہ لے لیا ہو، جو حضرت محبوب الہیؒ کی تحویل میں تھا، یا اس کی نقل حاصل کر لی ہو اور جب ہی سے اس کا نام زبان زد خلائق ہوا ہو۔

یہ ہرگز قرین قیاس نہیں کہ اتنی قلیل مدت میں اور افراتفری کے زمانے میں کسی نے جعلی کتاب کو حضرت محبوب الہیؒ سے منسوب کرنے کی جسارت کی ہو، اور مولانا برہان الدین غریبؒ جیسے بزرگ نے بھی اسے تسلیم کر لیا ہو، یہ بدگمانی ہے اور سخت قسم کی بدگمانی ہے، کوئی دانشور اس لایعنی منطق کو قبول نہیں کر سکتا۔

اس کے برعکس ایسے شواہد بکثرت دستیاب ہوتے ہیں کہ بالیقین راحت القلوب ان ہی ملفوظات پر مشتمل ہے، جن کی طرف حضرت محبوب الہیؒ نے اشارہ فرمایا ہے، مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے ایک بزرگ و عالم مرید مولانا محمد مجیر وجیہ ادیب کی تصنیف کتاب مفاتح الجنان[1] ہے، جو انھوں نے ۷۵۶ھ میں لکھنا شروع کی تھی جس کی تصحیح خواجہ کمال الدین علامہ نے فرمائی اس میں وہ ملفوظات بکثرت منقول ہیں جو راحت القلوب کے سوا دیگر دستیاب شدہ کسی مجموعہ ملفوظات میں نہیں ہیں[2]، اور یہ امر بلاشبہ راحت القلوب کے استناد اور قدامت کی روشن دلیل ہے۔

صاحب سیر الاولیاء امیر خورد کرمانیؒ نے بھی حضرت باباصاحبؒ کے ان ملفوظات کا ذکر کیا ہے، جو حضرت محبوب الہیؒ نے قلمبند فرمائے تھے، انھوں نے لکھا ہے:

"بعضے ملفوظات شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین قدس اللہ سرہ العزیز سلطان المشائخ قدس اللہ سرہ العزیز بخط مبارک خود در قلم آوردہ" (سیر الاولیاء ص ۷۰)

یہ صحیح ہے کہ امیر خورد کرمانیؒ نے اس مجموعہ ملفوظات کا نام نہیں لکھا، اس کے گونا گوں

---

[1] مفاتح الجنان کا ایک قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کلکتہ کے ذخیرۂ مخطوطات میں ہے اور ایک نسخہ راقم کے پاس ہے، ممکن ہے اور کہیں بھی ہو۔ [2] مفاتح الجنان قلمی ورق ۱۸۳ الف وغیرہ

اسباب ہو سکتے ہیں، مثلاً حضرت محبوب الٰہیؒ کی اتباع مقصود ہو یا انھیں کوئی ناقص نسخہ دستیاب ہوا ہو۔ انھوں نے دررِ نظامی اور خیر المجالس کا ذکر بھی نہیں کیا ہے، حالانکہ وہ ان کے معاصرین کی یادگار ہیں مگر کسی کتاب کا نام نہ لکھنا یا ذکر نہ کرنا ہرگز کسی کتاب کے جعلی اور وضعی ہونے کی یا اس کے عدم وجود کی دلیل نہیں۔ راحت القلوب کو تو اس لیے بھی اہمیت حاصل ہے کہ ان سے پیشرو اور ان سے زیادہ مستند اور معتبر حضرات نے راحت القلوب سے استفادہ کیا اور نام لکھا ہے جن کا ذکر کیا جا چکا ہے۔

شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ (المتوفی ۱۰۵۲ھ) عہدِ مغلیہ میں جلیل القدر عالم و درویش اور باکمال اہلِ قلم گزرے ہیں انھوں نے بھی ان مجموعۂ ملفوظات کا ذکر کیا اور لکھا ہے [1]

"بعضے ملفوظات گنج شکرؒ کہ بجمع شیخ نظام الدین اولیاء یافتہ ام مکتوب می گردد۔"

شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ اصولِ تصوف سے بھی بہرۂ کامل رکھتے تھے، اور تعلیماتِ اسلامی سے بھی، ان جیسے باکمال بزرگ سے ہرگز یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ کسی خود ساختہ اور جعلی نسخے کو حضرت محبوب الٰہیؒ سے منسوب فرماتے اور اس سے استفادہ کرتے، یا کسی ایسے نسخۂ ملفوظات کو حضرت بابا صاحبؒ کے ملفوظات سے تعبیر کرتے جو تعلیماتِ اسلامی یا اصولِ تصوف کے خلاف مضامین پر مشتمل ہوتا، بلاشبہ اگر وہ کہیں غلطی یا بے احتیاطی کا شائبہ بھی پاتے تو ان کی حق گوئی ہرگز اس کے اظہار میں تامل نہ کرتی۔

شاہ محمد بولاق مرحوم وابستۂ خانقاہِ درگاہ حضرت محبوب الٰہیؒ سے تھے، جو خوش گو شاعر اور باکمال اہلِ قلم بھی تھے، انھوں نے ۱۱۹۹ھ میں مطلوب الطالبین [2] نام سے حضرت محبوب الٰہیؒ کی

---

[1] شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ نے اخبار الاخیار کا بھی ذکر کیا ہے بلکہ انھوں نے کہیں مشائخ چشتؒ کی کتب ملفوظات سے انکار نہیں کیا اور ان کے مشتبہ ہونے کا ذکر نہیں فرمایا ہے۔

[2] مطلوب الطالبین کا ایک قلمی نسخہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ہے، ایک نسخہ رضا لائبریری رامپور میں ہے اور ایک قلمی نسخہ راقم کے پاس ہے۔

سوانح حیات لکھی، انھوں نے بھی راحت القلوب سے استفادہ کیا اور حوالہ دیا ہے لکھتے ہیں:

سلطان المشائخ در کتاب راحت القلوب تصنیف خود کہ الفاظ شیخ فریدالدین گنج شکر ؒ مجلس بہ مجلس جمع کردہ است۔ (مطلوب الطالبین ص۔۲ قلمی)

الغرض متعدد کتب تذکرہ و تصوف میں متواتر راحت القلوب کا ذکر ملتا ہے، حتیٰ کہ چودھویں صدی ہجری کے جلیل القدر عالم و عارف خواجہ غلام فرید چشتی علیہ الرحمۃ المتوفی ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء کی زبان مبارک پر بھی راحت القلوب کا ذکر آیا، اور انھوں نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ کی حکمت اس طرح ہے کہ مشائخ عظام کے ملفوظات مثلاً حضرت شیخ شیوخ العالم فریدالدین گنج شکر قدس اللہ سرہٗ کے ملفوظات سیر الاولیاء اور راحت القلوب میں بھی شیخ علی احمد صابر رضی اللہ عنہ کا ذکر نہیں آیا"

(مقابیس المجالس ص ۳۴۳ ترجمہ)

حضرت خواجہ غلام فرید چشتی ؒ کا مجموعۂ ملفوظات مقابیس المجالس کا مطالعہ[1] شاہد ہے کہ حضرت خواجہ ؒ علوم متداولہ پر گہری نظر رکھتے تھے، کثیر المطالعہ تھے اور نگاہِ تنقید سے مطالعہ فرماتے تھے۔

کتب تذکرہ و ملفوظات کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جاتا ہے تو قدم قدم پر راحت القلوب کی قدامت اور اس کے استناد کے شواہد دستیاب ہوتے اور اس کی روایتیں منقول ملتی ہیں، اور اس کے جعلی و وضعی اور نو مسود ہونے کا وسوسہ رفع ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ اس کے معتبر و قدیم ہونے میں شک و شبہہ کی گنجائش نہیں رہتی۔

بلاشبہ حوادث روزگار سے متاثر ہونا فطری امر ہے، جس سے چارۂ کار نہیں، قلمی کتابیں اکثر و بیشتر اس سے متاثر ملتی ہیں، راحت القلوب بلاشبہ ان ہی ملفوظات کا

---

[1] مقابیس المجالس کے مترجم نے اس عبارت کے متعلق جو حاشیہ سپرد قلم فرمایا ہے اس میں کتب ملفوظات مشائخ چشت کو جعلی ثابت کرنے کی ناکام اور لائق ندامت کوشش کی ہے جو سخن فہمی اور نکتہ دانی کے منافی ہے، بلاشبہ ایک جلیل القدر عالم و عارف کے مقابلہ میں بے علمی اور لایعنی اظہار رائے لائق ندامت جسارت ہے۔

مجموعہ ہے جن کا ذکر خیر حضرت محبوب الٰہیؒ کی مبارک زبان پر آیا تھا، راحت القلوب صحیفۂ رشد و ہدایت بھی ہے، اور اہل دل کے لیے سرمۂ چشم بھی ہے، اس کے مطالعہ سے نیکی و نکوکاری کا ولولہ موجزن ہوتا اور توفیق عمل نصیب ہوتی ہے۔

۳۔ جعلی کا وسوسہ | جعلی کا وسوسہ بعض مستشرقین کو لاحق ہوا ہے جو صحیح ذوق تصوف نہیں رکھتے، اور جو شعور دینی سے عاری ہیں، اور جنھوں نے بصیرت کی نگاہ سے راحت القلوب کا مطالعہ نہیں کیا ہے، انھیں خیر المجالس اور جوامع الکلم کی وہ ایسی عبارتوں سے مغالطہ ہوا ہے جو الحاقی اور مبہم ہیں اور بے معنی اور بے ربط ہیں، اور میزان سخن پر صحیح نہیں اترتیں بلکہ تاہما داز کار رفتہ ثابت ہوتی ہیں، جب صحیح تنقیدی شعور سے پرکھا جاتا ہے تو ان کی قباحتیں واضح ہو جاتی ہیں، اور جعلی کا وسوسہ رفع ہو جاتا ہے[۱]۔

۴۔ تاریخی اندراجات | جب کسی ایسی قدیم کتاب پر اظہار خیال مقصود ہو جس میں تاریخی اندراج ہوں، تو مناسب یہ ہے کہ پہلے تاریخی اندراجات کا جائزہ لے لیا جائے، اگر صحیح اور دستبرد زمانہ سے محفوظ ہیں تو فہو المراد ورنہ انھیں مسترد کر دیا جائے، اور صحیح تاریخی اندراجات معلوم کرنے کی کوشش کی جائے اور صحیح تاریخی اندراجات کی روشنی میں واقعات کو پرکھا جائے ورنہ کیا دھرا سب اکارت جائے گا۔

متعدد وجوہ کی بنا پر تاریخی اندراجات صحیح نہیں رہتے، حتیٰ کہ اس قسم سے تاریخ کی قدیم و معتبر کتابیں بھی مستثنیٰ نہیں ہیں[۲]، یہ طریقہ سنجیدہ اہل علم کا نہیں ہے کہ غلط تاریخی

---

[۱] خیر المجالس اور جوامع الکلم کی مذکورہ عبارتوں کی حقیقت سے واقفیت کے لیے مضمون عنوانی "مطالعہ ملفوظات خواجگان چشتؒ کے مبادیات" کا مطالعہ کارآمد ہے جو معارف اعظم گڑھ اگست، ستمبر، اکتوبر و نومبر ۱۹۶۹ء میں شائع ہو چکا ہے۔ اور اب اس کتاب کے ابتدائی حصے میں ہے۔

[۲] سفرنامہ ابن بطوطہ کے فاضل مترجم پیرزادہ محمد حسین مرحوم لکھتے ہیں:۔

ابن بطوطہ کا سفرنامہ نہ ہوتا تو جو غلطیاں ہمارے مورخوں نے کی ہیں، ان کا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲۳ پر)

اندراجات کو اساس بنا کر کسی کتاب کے مندرجات کو خلاف واقعہ اور کتاب کو جعلی اور نامعتبر قرار دیا جائے۔ اگر یہ روش اختیار کی جائے گی تو طبقات ناصری، منہاج سراج، تاریخ فیروز شاہی ضیاء برنی، اور تاریخ فرشتہ (ابوالقاسم ہندو شاہ فرشتہ) میں مندرج متعدد واقعات اور سنین کو خلاف واقعہ تسلیم کر کے ان کتابوں کو نامعتبر یا جعلی قرار دینا ہوگا۔ گویا کہ غلط تاریخی اندراجات کو بلا تحقیق معتبر مان کر واقعات کو پرکھنا اصولاً غلط ہے، جو ایسا کرتا ہے، وہ دراصل علمی قدروں سے بے بہرہ ہے، اور اس کی کارکردگی ہرگز قابلِ اعتبار نہیں۔

الغرض ان مراعات کے ساتھ ہمیں راحت القلوب کے تاریخی اندراجات کا جائزہ لینا ہے، فی الحال میرے پیش نظر راحت القلوب کا مطبوعہ فارسی نسخہ بھی ہے، اور اس کا وہ ترجمہ بھی ہے، جو مولوی غلام احمد خاں بریاں مرحوم نے ۱۳۱۲ھ میں کتاب "ملفوظات خواجگان چشت" کے مجموعہ میں شائع کیا تھا، تراجم اور بھی ہیں، مگر فی الحال ان ہی دونوں نسخوں سے تاریخی اندراجات نقل کیے جاتے ہیں، جن سے ان کی نوعیت واضح ہوتی ہے۔

(بقیہ ص ۲۲۲ کا) دریافت ہونا نہایت مشکل تھا، مثلاً بنگالہ کی تاریخ بیان کرنے میں اور سلطان محمد تغلق کی سلطنت کے سنوات قائم کرنے میں۔ اور معبر کی تاریخ بیان کرنے میں جو جو غلطیاں بدایونی (ملا عبدالقادر بدایونی صاحب منتخب التواریخ) و فرشتہ (ابوالقاسم ہندو شاہ فرشتہ صاحب تاریخ فرشتہ) و نظام الدین احمد (صاحب تاریخ مبارک شاہی) و مصنف تاریخ فیروز شاہی (ضیاء الدین برنی) و ملا احمد ٹھٹوی مصنف تاریخ الفی اور سندھ کے مورخوں نے کی ہیں...... (ترجمہ سفرنامہ ابن بطوطہ مقدمہ ص ۱۸)

فاضل مترجم کے بیان سے یہ بخوبی واضح ہے کہ واقعات کو قلمبند کرنے یا اور سنین کے اندراج میں نامور مورخوں سے بھی لغزشیں ہوئی ہیں۔ تاریخ کی معتبر کتابیں بھی اس سقم سے مبرا نہیں ہیں، کتب ملفوظات کا تو ذکر ہی کیا۔ تاہم اس نقص کی بنا پر تاریخ کی کسی کتاب کو نہ جعلی قرار دیا گیا اور نہ وضعی اور نہ دیا جا سکتا ہے، البتہ تصحیح کی طرف توجہ مبذول کرائی جا سکتی ہے اور ویسا ہی کیا گیا ہے۔ اور ایسا ہی ہونا چاہیے تھا، مگر ملفوظات کے باب میں نام نہاد نقادوں نے جو روش اختیار کی ہے۔۔ سراسر گمراہ کن، نامعقول، غلط اور آئین نقد و نظر کے منافی ہے، جو ہرگز قابل قبول نہیں (اخلاق حسین دہلوی)

آئینۂ ملفوظات

۵ — تاریخی اندراجات کا نقشہ

فارسی نسخہ راحت القلوب	ترجمہ بریاں	تقویم میں ۱۵ رجب کو اتوار ہے
۔		۱۱ رجب کو پیر ہے
۱۔ بارھ ۱۵ رجب ۶۵۵ھ	بارھ ۱۱ رجب ۶۵۵ھ	بارھ نہیں ۱۵ رجب کو ہے نہ گیارہ کو
۲۔ جمعرات ۱۶ شعبان "	ہفتہ ۱۶ " "	۱۶ شعبان کو بارھ ہے۔ ۱۶ رجب کو پیر ہے۔ ۲۱ شعبان کو اتوار ہے
۳۔ پیر ۲۱ ماہ مذکو "	بارھ ۲ ر "	۲ رجب کو ہفتہ ہے ۲۷ رجب کو بدھ ہے
۴۔ ندارد ۲۷ ر "	منگل ۲۷ ر "	۲۹ شعبان کو منگل ہے
۵۔ جمعرات ۲۹ شعبان "	جمعرات ۱۰ شعبان "	۱۰ شعبان کو جمعرات ہے
۶۔ ندارد ۱۱ ماہ مذکور "	ندارد ۱۱ ماہ مذکور	
۷۔ " " ۱۳ ر "	" ۱۳ ماہ مذکور	
۸۔ " " ۲۵ ر "	" ۲۵ "	
۹۔ " ۵ رمضان	" ۵ رمضان	
۱۰۔ پیر ۲۵ شوال	" ۵ شوال	۲۵ شوال کو پیر ہے
۱۱۔ ندارد ۱۵ ماہ مذکور	" ۵ ر "	ایک ہی تاریخ میں دو مجلسیں ہیں یہ کیوں؟
۱۲۔ " " ۲۰ "	" ۱۰ "	
۱۳۔ " ۲۱ ر ۶۵۵ھ سبع	" ۲۱ ماہ مذکور	۵۵ ھ کیا ہے؟
۱۴۔ " ۱۰ ذیقعدہ ۶۵۵ھ	" ۲ ذیقعدہ	
۱۵۔ " " ۱۲ ر "	" ۱۲ "	
۱۶۔ " ۲ ذی الحجہ	" ۲ ذی الحجہ	
۱۷۔ " " ۷ ر	" ۱۷ ر "	
۱۸۔ ۲۰ ماہ مذکور	" ۲۰ ر "	

۱۹-	ندارد ۲۷ ماہ مذکور	ندارد ۲۷ ذی الحجہ
۲۰-	" یکم ماہ محرم ۶۵۵ھ	" یکم محرم ۶۵۶ھ
۲۱-	" ۱۰ ماہ مذکور	" ۹ ماہ مذکور
۲۲-	" ۴ ماہ صفر	" ۴ صفر
۲۳-	" ۲۷ ماہ مذکور	" ۲۵ "
۲۴-	" ۲ ربیع الاول	" ۲ ربیع الاول

اس نقشے کے تقابلی مطالعہ سے یہ واضح ہے کہ راحت القلوب کے فارسی نسخہ میں اور ترجمۂ بریاں میں تاریخوں کے ساتھ صرف پانچ پانچ دن لکھے ہیں، ان کا تقویم سے مقابلہ ہو سکتا ہے باقی چونکہ ناتمام ہیں لہذا ان کا مقابلہ نہیں ہو سکتا، ان پانچ پانچ کے تقابل سے یہ واضح ہے کہ صرف ایک ایک دن تقویم کے مطابق ہے، باقی نہیں۔

اس نقشہ کے تقابلی مطالعہ سے اور بھی نتائج برآمد ہوتے ہیں جو ترتیب وار درج ذیل ہیں:

(۱) دن اگرچہ صرف پانچ پانچ تاریخوں کے ساتھ ہیں لیکن ایک ایک کے سوا تقویم سے کسی کی تصدیق نہیں ہوتی، باقی سب ہی غلط اور ناقابل قبول رہیں۔

(۲) فارسی نسخے میں کسی مہینے کی کوئی تاریخ ہے تو ترجمۂ بریاں میں کوئی تاریخ ہے، مثلاً فارسی نسخے میں ۲-۳-۴-۵ مجلسوں کی تاریخیں ۱۶، ۲۰، ۲۷، ۲۹ شعبان ہیں، اور ترجمۂ بریاں میں ۲، ۱۶، ۲۷ رجب اور ۱۰ شعبان ہیں، مہینے کا بھی فرق ہے، مگر ترجمۂ فارسی متن ہی کے مطابق ہے، دن بھی بدلے ہوتے ہیں، یہ اس قدر اختلاف کیوں ہے؟ ہو سکتا ہے کہ یہ اندراجات کسی اور کی ہوا بدید کا ثمرہ ہوں۔

(۳) مہینوں میں فرق ہونا زیادہ حیرت انگیز ہے، اور سنین میں اس سے بھی زیادہ۔

(۴) اہم ترین بات یہ ہے کہ فارسی نسخے میں ۹ شعبان کے بعد ۱۱، ۱۳، ۱۵ تاریخیں ہیں،

جن کے ساتھ ماہ مذکور لکھا ہوا ہے، اسی طرح ۵ رشوال کے بعد ۱۵، ۲۰، ۲۲ تاریخیں ہیں، ان کے ساتھ بھی ماہ مذکور لکھا ہوا ہے، اگر یہ تاریخیں شعبان و شوال ہی کی ہیں تو ۲۹ ر اور ۲۵ کے بعد کیوں ہیں؟ ان سے پہلے ہونی چاہیے تھیں، اگر کسی اور مہینے کی ہیں تو اس کا نام ہونا چاہیے تھا، یہ حالات بتاتے ہیں کہ ناشر مطبوعہ نسخہ کسی محفوظ نسخے سے منقول نہیں ہے بلکہ کسی ایسے نسخے سے منقول ہے جو اوراق منتشرہ کا مجموعہ تھا، اور تاریخی اندراج کے باب میں نہایت درجہ ناقص تھا، البتہ اس سے یہ ثابت ہے کہ یہ کوئی جعلی نسخہ بھی نہیں تھا، کیونکہ کوئی جعل ساز افشائے راز کے خوف سے اس بے ہنگامی کو ہرگز گوارا نہیں کرتا، یہ ناشر کی دیانت داری ہے کہ اس نے جوں کا توں شائع کر دیا۔

(۵) سنین قطعاً غلط ہیں، راحت القلوب کی پہلی مجلس کے آغاز میں ۱۵ رجب ۶۵۵ھ/1256ء اور آخری مجلس کے آغاز میں ۲ ربیع الاول ۶۵۶ھ/1257ء مندرج ہے، یا تو یہ صحیح پڑھے نہیں جا سکے ہیں یا غلط بیانات سے متاثر ہو کر کسی نے تبدیل کر دیے ہیں، کیونکہ بعض ایسے بیانات بھی ملتے ہیں جو غلط فہمی اور غلط بیانی پر مبنی ہیں[1]، الغرض تاوقتیکہ مصدقہ اقوال کی روشنی میں ان اندراجات کا جائزہ نہ لیا جائے ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

۶۔ **تاریخی اندراجات کا جائزہ** | ان تاریخی اندراجات کا جائزہ ان مصدقہ بیانات و اقوال کی روشنی میں لیا جا سکتا ہے جو حضرت محبوب الٰہیؒ کی ولادت، ارادت اور خلافت و وفات سے متعلق معتبر کتابوں میں ملتے ہیں، جن میں سے بعض حضرت محبوب الٰہیؒ ہی کے اقوال و بیانات ہیں، امیر خورد کرمانیؒ نے حضرت محبوب الٰہیؒ کی تاریخ وفات کے متعلق لکھا ہے:

ہیژدہم ماہ ربیع الآخر خمس و عشرین	اٹھارہ ربیع الآخر ۷۲۵ھ ہجری کو
و سبعمایہ بعد طلوع آفتاب سلطان المشائخ	سورج نکلنے کے بعد حضرت محبوب الٰہی
بجوار رحمت رب العلمین پیوست۔	جوار رحمت رب العلمین میں تشریف
(سیر الاولیاء ص ۱۵۵)	لے گئے، وصال فرمایا۔

[1] اسی کتاب کے صفحہ ۲۲۷-۲۲۸-۲۲۹-۲۳۰-۲۳۱ ملاحظہ ہو۔

امیر خورد کرمانیؒ نے آپ کی عمر عزیز کے متعلق یہ بھی صراحت فرمائی ہے :

عمر عزیز سلطان المشائخ ہشتاد سال کشید (سیر الاولیاء ص ۱۴۳ پ)	حضرت محبوب الٰہیؒ کی عمر اسی سال کی ہوگئی تھی ۔

خواجہ گیسو دراز بندہ نوازؒ نے اندازاً پچھتر برس کی بتائی ہے (جوامع الکلم[1] مجلس ۱۳ شعبان ۸۰۲ھ قلمی نسخہ) خواجہ گیسو دراز بندہ نوازؒ ایک واسطے سے حضرت محبوب الٰہیؒ سے منسلک تھے انھوں نے حضرت محبوب الٰہیؒ کو دیکھا بھی نہ تھا، مگر جو روایت انھیں بزرگوں سے پہنچی انھوں نے اسے دہرا دیا ہے جس کا تعلق اندازے اور تخمینے سے ہے ۔

اس کے برعکس امیر خورد کرمانیؒ نے حضرت محبوب الٰہیؒ کو دیکھا تھا، آپ ہی کے بابرکت عہد حیات میں پیدا ہوئے، پروان چڑھے اور آپ ہی کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی تھی، اور آپ ہی سے شرف بیعت و ارادت حاصل کیا تھا، اس لیے امیر خورد کرمانیؒ کے بیان کو ترجیح ہے ۔ اس کے علاوہ امیر خورد کرمانیؒ کے دادا بزرگوار سید محمد کرمانیؒ حضرت محبوب الٰہیؒ کے ہم خرقہ تھے ۔ اور ان دونوں بزرگوں میں باہم ایسے خوشگوار تعلقات تھے کہ حضرت باباصاحبؒ نے ان دونوں بزرگوں کو رشتۂ مواخات میں منسلک فرما دیا تھا، (سیر الاولیاء ص ۲۰۹ پ) اسی لیے سید محمد کرمانیؒ مع اہل و عیال دلی چلے آئے اور حضرت محبوب الٰہیؒ کے ہمراہ زندگی بسر کی، ان کے بعد ان کی اولاد اور اولاد کی اولاد بھی حضرت ہی کے سایۂ عاطفت میں رہی جس پر حضرت محبوب الٰہیؒ خصوصی شفقت فرماتے تھے ۔ ان حالات کے پیش نظر بھی امیر خورد کرمانیؒ ہی کے قول کو ترجیح ہے ، تاہم یہ واضح ہے کہ متقدمین کی نگاہ میں حضرت محبوب الٰہیؒ کی عمر عزیز زمانۂ وفات کے قریب اسّی سال سے زیادہ نہ تھی، اور ان موقر بیانات کے مقابلے میں بعد کے کسی بے سند بیان کو فوقیت نہیں ہو سکتی ۔

حضرت محبوب الٰہیؒ کا سنۂ وفات ۷۲۵ھ ہے، اور عمر عزیز اسّی برس کی ہوئی ہے، اس

[1] Jawama-ul-Kilam

اعتبار سے آپ کا سنۂ ولادت ۶۳۴ھ قرار پاتا ہے، جو درویش صفت بادشاہ سلطان ناصر الدین محمود کا عہد معدلت مہد ہے اس کے علاوہ سنۂ ولادت کی تصدیق دیگر بیانات سے بھی ہوتی ہے۔

امیر خورد کرمانیؒ لکھتے ہیں:

می فرمود کہ روز چہارشنبہ آخرین ماہ صفر قوی با برکت است ... و می فرمود کہ تولد این ضعیف ہم درین روز است۔ (سیر الاولیاء ص ۹۸، ۳ پیچ)

آپ فرماتے تھے کہ صفر کے مہینے کا آخری بدھ بہت برکت والا دن ہے ... اور یہ بھی فرماتے تھے کہ میری ولادت اسی دن کی ہے یعنی آخری بدھ کی ہے۔

اس اعتبار سے بعض اہل قلم نے آپ کا یوم ولادت آخری بدھ، ۲۷ صفر لکھا ہے اور یہ صحیح ہے کیونکہ ۶۴۵ھ / 1247 میں، ۲۷ صفر کو بروئے تقویم آخری بدھ ہی ہے (تقویم ہجری و عیسوی ابو النصر خالدی) بعض سوانح نگاروں نے آپ کا سن ولادت ۶۳۳ھ / 1235 اور ۶۳۴ھ / 1236 لکھا ہے، جو خلاف تحقیق اور غلط ہے، شاہ محمد بولاق مرحوم لکھتے ہیں:

صاحب سیر الاولیاء در باب ہفتم فی نکتۂ اوراد مقبلہ وسالیہ گزارش می نماید و ثبت می فرماید کہ تولد سلطان المشائخ بروز آخرین چہارشنبہ بعد از طلوع آفتاب بتاریخ بست و ہفتم شہر صفر سن بست و ثلثین وست مایہ یعنی در سال شش صد وسی وشش بوقوع آمد (روضۃ الاقطاب ص ۵۰، مطلوب الطالبین ص ۸ قلمی)

صاحب سیر الاولیاء نے ساتویں باب کے نکتہ اوراد مقبلہ و سالیہ میں لکھا ہے کہ سلطان المشائخ حضرت محبوب الٰہیؒ آخری بدھ کو آفتاب کے طلوع ہونے کے بعد، ۲۷ ماہ صفر ۶۳۶ھ ہجری کو پیدا ہوئے۔

شاہ محمد بولاق مرحوم کا یہ بیان اگرچہ سیر الاولیاء سے ماخوذ و منقول معلوم ہوتا ہے، مگر حیرت ہے کہ سیر الاولیاء میں حضرت محبوب الٰہیؒ کی ولادت سے متعلق وہی دو جملے ہیں جو نقل

کیے جا چکے ہیں، اور وہ یہ ہیں:

"روز چہار شنبہ آخریں ماہ صفر قوی با برکت ہست ۲ ، تولد ایں ضعیف

ہم دریں روز است۔ (سیر الاولیاء ص ۷۰، پاچ)

ان جملوں میں نہ کوئی سنہ ہے، نہ کوئی تاریخ اور نہ کوئی وقت، نہیں معلوم شاہ محمد بولاق مرحوم کو کیا مغالطہ ہوا ہے کہ انھوں نے سنہ کا اور تاریخ کا اور وقت کا اضافہ فرما دیا ہے، اور یہ معلومات انھیں کہاں سے حاصل ہوئیں، جو انھوں نے صاحب سیر الاولیاء امیر خورد کرمانیؒ سے منسوب فرما دی ہیں، جو سیر الاولیاء کے دستیاب شدہ قدیم نسخوں میں بھی نہیں ہے۔ ان کے اس غیر مصدقہ بیان میں ۶۳۶ھ/1238ء نہایت درجہ غلط ہے جس سے ان ہی کے بیان میں مطابقت برقرار نہیں رہتی، کیونکہ بروئے تقویم، ۳ صفر ۶۳۶ھ/1238ء کو آخریں چہار شنبہ (آخری بدھ) نہیں ہے، بلکہ شنبہ (ہفتہ سنیچر) ہے، آخریں چہار شنبہ (آخری بدھ) ۴ صفر ۶۳۶ھ/1238ء کو ہے، (تقویم ہجری و عیسوی ابو النصر خاں) لہٰذا ان کا متعینہ سنہ ۶۳۶ھ/1238ء غلط اور صریحاً غلط ہے، مزید براں اس سے امیر خورد کرمانیؒ کی نوشتہ عمر اور سنہ وفات سے بھی مطابقت برقرار نہیں رہتی۔

پھر یہ نکتہ بھی ہے کہ اگر امیر خورد کرمانیؒ کو یہ تفصیل لکھنی ہوتی تو وہ حضرت محبوب الٰہیؒ کی ولادت باسعادت کے ذکر کے ساتھ ہی لکھتے جو سیر الاولیاء (حبی لال ایڈیشن) کے صفحہ ۹۴ میں ہے، غیر متعلق باب میں اتنی تفصیل سے کیوں لکھتے، بہرحال شاہ محمد بولاق مرحوم کا مذکورہ بیان نہ تو سیر الاولیاء سے ماخوذ ہے اور نہ صحیح ہے، اور نہ قابل قبول ہے، شاہ محمد بولاق مرحوم نے ایسا ہی یہ بیان بھی نقل کیا ہے جو نہایت درجہ مشتبہ و مشکوک بلکہ سراسر غلط ہے، انھوں نے لکھا ہے:

سید محمد کرمانیؒ مرید خاص وے در کتاب	سید محمد کرمانیؒ آپ کے خاص مرید نے سیر الاولیا
سیر الاولیاء کہ تصنیف و تالیف	میں جو ان ہی کی تصنیف و تالیف ہے مختصر
اوست سنہ عمر شریف در ایام مرض	محبوب الٰہیؒ کے مرض موت کے دنوں میں

موت آں حضرت رسیدہ کہ بابا۔ در باب چہارم فی نکتۃ خلافتہا بامقرر و معین می نماید کہ چوں عمر سلطان المشائخؒ بہشتاد و نہ رسید۔
(روضۃ الاقطاب ص ۵۴)

آپ کی عمر شریف جس طرح کہ چاہیے تھی چوتھے باب میں (اور) خلافت کے نکتہ میں مقرر و معین فرمائی ہے، وہ یہ کہ جب آپ کی عمر شریف نواسی ۸۹ سال کی ہو گئی تھی۔

مگر حیرت یہ ہے کہ سیر الاولیاء (چرنجی لال ایڈیشن ص ۱۲۴) باب چہارم اور نکتہ خلافت میں بہشتاد و نہ (نواسی ۸۹) نہیں ہے، بلکہ "بہشتاد و سال کشید" (اسی سال کی ہوئی) ہے، اور یہی صحیح ہے، اور حضرت محبوب الٰہیؒ کے ان بیانات کے مطابق بھی ہے جو بیعت و ارادت سے متعلق ہیں اور جنھیں امیر خورد کرمانیؒ نے احتیاطاً سے قلمبند کیا ہے، جن کا ذکر آئندہ آئے گا۔

بہر حال شاہ محمد بولاق مرحوم نے حضرت محبوب الٰہیؒ کا سنہ ولادت جو ۶۳۴ھ/1236ء لکھا ہے وہ صحیح نہیں ہے، جو مدت عمر لکھی ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے، اور اس بیان کو سیر الاولیاء سے ماخوذ بتانا بھی صحیح نہیں ہے۔

مولوی غلام احمد خاں بریاں مرحوم نے ترجمہ سیر الاولیاء میں جو انھوں نے ۱۳۲۵ھ/1907ء میں اردو سیر الاولیاء کے نام سے شائع کیا تھا، غالباً شاہ محمد بولاق مرحوم کے بیان سے متاثر ہو کر ذکر وفات کے ضمن میں "واضح ہو" کے تحت یہ بیان الحاق فرمایا ہے:

"واضح ہو کہ جناب سلطان المشائخ قدس سرہٗ رجب کی پندرہویں تاریخ ۶۵۵ھ میں شیخ شیوخ العالم کی شرف ارادت سے مشرف ہوئے، اس وقت آپ کی بیس سال کی عمر تھی، آپ کی ولادت ۶۳۶ھ میں ہوئی اور انتقال ۷۲۵ھ میں ہوا۔ اور جس وقت آپ کا انتقال ہوا، اس وقت آپ کی عمر نواسی ۸۹ برس کی تھی۔" (اردو سیر الاولیاء، از ترجمہ بریاں، پندرہواں نکتہ ص ۱۴۲)

مولوی غلام احمد خاں بریاں مرحوم کو اگر یہ اضافہ کرنا ہی تھا تو مناسب یہ تھا کہ وہ

اسے حاشیہ میں لکھتے اور بتاتے کہ یہ ان ہی کی جدت طبع کا ثمرہ ہے، جو سراسر غلط ہے، اس طرح الحاق کر دینا بلاشبہ نہایت ہی نامناسب ہے بلکہ گمراہ کن ہے، بہرحال سیر الاولیاء کے کسی فارسی نسخے میں ایسی کوئی عبارت نہیں ہے جس کا اس الحاقی بیان کو ترجمہ کہا جا سکے، میں سمجھتا ہوں کہ ترجمہ بریاں ہی سے بعض اہلِ قلم کو مغالطہ ہوا ہے۔

پروفیسر محمد حبیب مرحوم کے پیشِ نظر بھی غالباً ترجمہ بریاں ہی تھا، انھوں نے لکھا ہے:

"امیر خورد لکھتے ہیں کہ انتقال کے وقت آپ کی عمر نواسی ۸۹ سال کی تھی لیکن یہ صرف اندازہ معلوم ہوتا ہے۔"

(کتاب حضرت نظام الدین اولیاء، حیات و تعلیمات ص ۱۳۷)

امیر خورد کرمانیؒ نے آپ کی عمر عزیز کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، وہ نقل کیا جا چکا ہے، دراصل یہ شاہ محمد بولاق مرحوم کی اختراع ہے جسے مولوی غلام احمد خاں بریاں مرحوم نے ترجمۂ سیر الاولیاء میں الحاق فرما دیا ہے، جس سے متعدد اہلِ قلم کو غلط فہمی ہوئی ہے۔

جن صاحبوں نے حضرت محبوب الٰہیؒ کا سنہ ولادت ۶۳۴ھ / 1235 لکھا ہے، انھوں نے بھی صحیح نہیں لکھا ہے، ۶۳۴ھ / 1235 میں آخری بدھ ۲۷ صفر کو ہے، اور اس کے اعتبار سے عمر ۹۱ سال ہوتی ہے جو خلافِ تحقیق اور غلط ہے۔

۷۔ بیعت و خلافت سے متعلق صحیح بیانات

یہ ذکر آ چکا ہے کہ راحت القلوب میں مرقومہ تاریخی اندراجات اور حضرت محبوب الٰہیؒ کے مفروضہ سنینِ ولادت ۶۳۶ھ / 1238 اور ۶۳۴ھ / 1235 کی تصدیق ان مصدقہ بیانات سے بھی نہیں ہوتی جو بیعت و خلافت سے متعلق ہیں اور حضرت محبوب الٰہیؒ ہی کے فرمودہ یا نوشتہ ہیں، امیر خورد کرمانیؒ نے لکھا ہے:

سلطان المشائخ بقلم مبارک خود	حضرت محبوب الٰہیؒ نے اپنے مبارک
نبشتہ است کہ شیخ شیوخ العالم	قلم سے لکھا ہے کہ حضرت بابا صاحبؒ
فرید الحق والدین قدس اللہ سرہ العزیز	نے جمعہ کے دن نماز سے فارغ

کاتب حروف را بخواند در روز آدینہ	ہونے کے بعد ۲۵ جمادی الاول
بعد فراغ نماز بیست و پنجم ماہ جمادی الاول	۶۶۹ھ کو مجھے بلایا اور اپنے مبارک
سنہ تسع و ستین و ست مایۃ لعاب دہن	دہن کا لعاب میرے منہ میں ڈالا اور
مبارک در دہن کاتب کرد و وصیت	قرآن پاک کو حفظ کرنے کی
بحفظ کلام اللہ المجید رزقہ اللہ تعالیٰ	وصیت فرمائی۔

فرمود ۔ ۔ ۔ ۔ (سیر الاولیا ص ۱۳۲ ج ۲)

امیر خورد کرمانیؒ نے اسی دوران قیام کا یہ واقعہ بھی نقل کیا ہے:-

در غرۂ مبارک شعبان سنہ تسع و ستین و	شعبان ۶۶۹ھ کی پہلی تاریخ کو حضرت
ست مایۃ از حضرت شیخ شیوخ العالم	باباصاحبؒ سے دعا کے لیے درخواست
قدس اللہ سرہ العزیز التماس نمودہ آمد	کی جو آپ نے منظور فرمائی، اور
شیخ شیوخ العالم باجابت و مدد فاتحہ	فاتحہ خیر سے مدد فرمائی، یعنی
مقرون فرمود (سیر الاولیا ص ۱۳۳ ج ۲)	دعا فرمائی۔

اسی دوران قیام کا یہ تیسرا واقعہ بھی ہے جو امیر خورد کرمانیؒ نے نقل کیا ہے:-

سہ کرت از دہلی بخدمت شیخ شیوخ	میں تین بار دہلی سے حضرت باباصاحبؒ
العالم رفتم، بعدہ یک روز خواجہ	کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ تیسری بار
طلبید سیزدہم ماہ رمضان سنہ تسع و	حاضر ہونے کے بعد ایک دن حضرت
ستین و ست مایۃ بود، فرمود کہ	باباصاحبؒ نے مجھے بلایا، رمضان
نظام! یاد داری آنکہ گفتہ بودم؟	المبارک ۶۶۹ھ کی تیرھویں تاریخ تھی،
گفتم آرے۔ فرمود کہ کاغذ بیارید،	دریافت فرمایا: نظام تمھیں یاد ہے جو میں نے
اجازت نامہ نوشتہ شود، کاغذ	کہا تھا؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں یاد ہے،
آوردند و اجازت نامہ نوشتہ	آپ نے فرمایا کاغذ لاؤ تاکہ اجازت نامہ

ہم آہنگ ملفوظات

(سیر الاولیا ص ۱۱۶ ح) (خلافت نامہ لکھا جائے کا حکم دیا۔ اور اجازت نامہ لکھا گیا۔

حضرت محبوب الٰہیؒ پہلی بار حاضر خدمت ہوئے تھے تو حضرت باباصاحبؒ نے یہ دعا کہ یادائم الفضل علی البریۃ الخ آپ کو عنایت فرمائی تھی اور یہ بھی فرمایا تھا:۔

ایں دعا را یاد گیر و مواظبت نمائی	اس دعا کو یاد کر لو اور ہمیشہ
تا ترا خلیفہ خود گردانم۔	پڑھتے رہو تا کہ میں تمھیں اپنا خلیفہ
(سیر الاولیا ص ۱۱۶ ح)	بنا دوں۔

یہ سوال کہ یاد داری کہ گفتہ بودم ۔ اسی دعا سے متعلق تھا۔ الغرض ان تینوں بیانوں سے یہ واضح ہے کہ حضرت محبوب الٰہیؒ ۶۶۹ھ/1270 میں حضرت باباصاحبؒ کی خدمت میں حاضر تھے اور ان ہی ایام میں حضرت باباصاحبؒ نے آپ کو اپنا خلیفہ بنایا اور سند خلافت عنایت فرمائی تھی، خواجہ امیر حسن علا سجزیؒ نے حضرت محبوب الٰہیؒ کا یہ بیان بھی نقل کیا ہے:۔

مرا در ماہ شوال بدہلی فرستادہ بود،	مجھے شوال کے مہینے میں دہلی بھیج دیا
نقل ایشاں در شب پنجم ماہ محرم	تھا اور حضرت باباصاحبؒ کا انتقال
بودہ است، (فوائد الفواد ص ۵۲)	پانچ محرم کی رات کو ہوا ہے۔

بروئے تحقیق حضرت باباصاحبؒ کا سنہ وفات ۶۷۰ھ/1271 ہے، حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ کا فرمودہ قطعہ تاریخ یہ ہے ؎

فریدالدین کہ او گنج شکر بود	چو در ذات خدا شد محو مطلق
بہ مظہر گفت ہاتف سال نقلش	فرید الدین ولی واصل حق[1]

بہر حال مذکورہ بیانات سے یہ واضح ہے کہ ماہ جمادی الاول ۶۶۹ھ/1270 سے شوال ۶۶۹ھ/1271 تک حضرت محبوب الٰہیؒ کا قیام اجودھن (پاکپتن) میں تھا۔ اور آپ حضرت باباصاحبؒ کی

[1] تذکرہ سلسلۃ الاولیا، تالیف مولوی محمد صالح کنجاہیؒ

خدمت میں پہنچے، یہ تیسری بار کی حاضری تھی، حضرت محبوب الٰہیؒ نے یہ بھی فرمایا ہے :-

سہ کرت بخدمت شیخ الاسلام فرید الحق	میں تین بار حضرت باباصاحبؒ کی
والشرع والدین قدس اللہ سرہ العزیز	خدمت میں حاضر ہوا ہوں (اس طرح
رفتہ بودم، ہر سال یک بار، بعد ازاں	کہ) سال میں ایک بار، اس کے بعد
کہ نقل فرمود ہفت بار دیگر رفتہ شدہ	کہ جب آپ کا انتقال ہو گیا تو
است (فوائد الفواد ص ۲۴۴ سیر الاولیاء	سات مرتبہ اور جانا ہوا ہے -

ص ۱۰۷ ج)

اس بیان سے واضح ہے کہ حضرت محبوب الٰہیؒ حضرت باباصاحبؒ کی خدمت فیض درجت میں سال میں ایک بار حاضر ہوتے تھے، اس طرح کہ آتے ہوئے پورا سال گزرنے نہ پاتا تھا یا گزرنے والا ہی ہوتا تھا کہ آپ دہلی سے اجودھن (پاکپتن) تشریف لے جاتے اور حاضر خدمت ہوتے تھے، آمد و رفت میں کتنا وقت لگتا تھا، صحیح نہیں بتایا جا سکتا - غالب گمان یہ ہے کہ بیس ۲۰ دن کا سفر ہوتا تھا، اس اعتبار سے تینوں بار کی آمد و رفت میں چار ماہ کی مدت صرف ہوئی ہوگی، اور تینوں بار کے دہلی اور اجودھن (پاکپتن) کے قیام میں چار سال کی مدت قرین قیاس ہے، گویا کہ سفر و حضر کی مدت چار ساڑھے چار سال ہوگی، اگر اس سفر و حضر کی مدت کو ۶۶۹ھ میں وضع کر دیا جائے تو پہلا سفر $\frac{۶۶۵ھ}{1267}$ میں قرار پاتا ہے، گویا کہ $\frac{۶۶۵ھ}{1267}$ میں حضرت محبوب الٰہیؒ کو شرف بیعت حاصل ہوا تھا، کسی نے آپ سے یہ بھی دریافت کیا تھا

شما چند سالہ بودید کہ بدولت ارادت	آپ کی عمر کتنی تھی، جب آپ حضرت
شیخ شیوخ العالم فرید الحق والدین	باباصاحبؒ سے بیعت ہوئے تھے،
طیب اللہ مرقدہ مشرف شدید ،	آپ نے فرمایا کہ بیس سال کی تھی،
فرمود بیست سالہ (سیر الاولیاء ص ۱۰۶ ج)	

$\frac{۶۶۵ھ}{1267}$ جو آپ کی پہلی حاضری اور بیعت ہونے کا سنہ متعین ہوتا ہے، اس میں سے

اگر بیس سالہ عمر وضع کر دی جائے تو سنہ ولادت ۶۴۵ھ / 1247 قرار پاتا ہے، یہ وہی سنہ ہے جو سنہ وفات ۷۲۵ھ / 1325 میں سے اسّی سالہ مدت وضع کرنے سے حاصل ہوتا ہے، گویا کہ ہر دو اعتبار سے حضرت محبوب الٰہیؒ کا سنہ ولادت ۶۴۵ھ / 1247 قرار پاتا ہے، اور داخلی شواہد سے بھی اس کی پوری پوری تائید ہوتی ہے، اور اس طرح آپ کا سنہ بیعت و ارادت ۶۶۵ھ / 1267 متعین ہوتا ہے، ۶۵۵ھ / 1257 نہیں ہوتا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ سات سو سال سے زیادہ مدت گزر چکی ہے، اور حضرت محبوب الٰہیؒ کی متعدد سوانح حیات لکھی جا چکی ہیں، اور سوانح نگاروں نے قیاس و تجسس سے سنین کی تعیین کی ہے، لیکن کسی نے بھی حقائق اور داخلی شواہد سے کام نہیں لیا ہے، اور بمصداق وکثیراً ما یقلد الساھون الساھین (فتح القدیر محقق کمال الدین ابن ہمام ف ۸۶۱ھ) بھولے بھٹکے بھولے بھٹکوں ہی کے قدم بقدم چلتے رہے ہیں، بعض لوگوں نے اگر کچھ کیا تو یہ کیا کہ اپنی اختراعات کو صاحبِ سیر الاولیا امیر خورد کرمانیؒ کے سر تھوپ دیا جو نہایت درجہ نازیبا ہے، اس سے سنین میں اور بھی خلفشار پیدا ہو گیا ہے، اور واقعات کے تطابق میں مزید دشواری لاحق ہو گئی ہے، اور معاندین کو اعتراض کا موقع ہاتھ آ گیا ہے، مگر یہ پیرانِ عظام رحمہم اللہ کی کرامت یا ان کی توجہ کا ثمرہ ہے کہ اتنی مدت تک حقائق کما حقہ محفوظ رہے، اور مجھ ناچیز کو اللہ پاک نے ان کے انکشاف کی سعادت نصیب فرمائی۔ الحمد للہ علیٰ ذالک ؎

این سعادت بزورِ بازو نیست　　　تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

بقول غالب ؎

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

الغرض اس تحقیق کے دوران حضرت محبوب الٰہیؒ کے سوانح حیات سے متعلق اہم واقعات کے جو سنین مجھے دستیاب ہو سکے ہیں، مفادِ عامہ کے لیے انھیں ترتیب وار پیش کیے دیتا ہوں۔

آغازِ ملفوظات

یقین ہے کہ کار آمد ثابت ہوں گے۔

۸۔ حضرت محبوب الٰہیؒ کی سوانح حیات سے متعلق اہم سنین کا نقشہ

(۱) ولادت ۶۳۵ھ	(۶) غیاث پور میں قیام کی ابتداء ۶۸۰ھ تا ۶۸۶ھ کے درمیان
(۲) دہلی تشریف لانا ۶۶۱ھ	(۷) سلطان بلبن کی وفات، کیقباد کی تخت نشینی ۶۸۶ھ
(۳) بیعت ہونا ۶۶۵ھ	(۸) محضر سماع بعہد سلطان تغلق ۷۲۳-۲۴ھ
(۴) خلافت کی سند ملنا ۶۶۹ھ	(۹) وفات بعمر ۸۰ سال ۷۲۵ھ
(۵) مشارق الانوار کی سند ملنا ۶۶۹ھ	

۹۔ راحت القلوب کا عہد تدوین اس تفصیلی تحقیق سے واضح ہے کہ راحت القلوب کا عہد تدوین ۶۶۵ھ (1267) تا ۶۶۹ھ (1271) ہے، وجوہ کچھ بھی ہوں، تحریف ہو یا الحاق، کاتب و ناقل کا سہو ہو یا کسی کی غلط فہمی، بہر حال راحت القلوب کی مجالس کے آغاز میں جو تاریخی اندراجات ہیں وہ غلط ہیں، ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، اور نہ ان کی بنا پر راحت القلوب کو جعلی اور وضعی قرار دیا جا سکتا ہے، اگر یہ غلط روش اختیار کی جائے گی اور اس غلط کو صحیح سمجھا جائے گا تو بہت سی معتبر کتابوں کو جعلی اور وضعی قرار دینا ہوگا۔ اور گراں بہا علمی سرمایہ کو دریا برد کرنا پڑے گا، جو خلاف عقل ہوگا۔

اس عہد تدوین کے صحیح اور معتبر ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اس سے بہت سے شبہات اور بہت سے مغالطے رفع ہو جاتے ہیں، اور کسی معترض کو یہ کہنے کی گنجائش نہیں رہتی کہ فلاں بزرگ بقید حیات تھے اور ان کا ذکر بطور متوفی کے ملتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ بیان غلط نہیں ہے بلکہ تاریخی اندراج غلط اور صحت طلب ہے، اس عہد تدوین کے تعین سے تاریخی اندراج کی صحت ہو جاتی ہے جس کی برکت سے انشاء اللہ اب کوئی مغالطہ لاحق نہ ہوگا۔

۱۱۔ تحقیقی کارنامہ | تحقیقی کارنامہ کیسا ہی صحت مند ہو، حرفِ آخر نہیں ہوا کرتا، تحقیق کا میدان بہت وسیع ہے، اولوالعزم جب میدانِ عمل میں اترتے ہیں تو کچھ نہ کچھ کر ہی دکھاتے ہیں، مجھے بھی یہ دعویٰ نہیں کہ میری یہ تحقیق حرفِ آخر ہے، مجھ سے جو بن پڑا بفضلہ تعالیٰ اپنی بساط کے مطابق میں نے کر دکھایا ہے ؎

عمریست قلم دریں شب تار لیلے معنیٔ خفتہ کرد بیدار

وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم، دراصل یہ کرامت ہے چشمِ بینا کے لیے ان بزرگوں کی اور جو پندرہویں صدی کی تاریکی میں چراغِ راہ ہے اور زبانِ حال سے کہہ رہی ہے ؏

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

۱۲۔ نقلِ روایت | یہ انسانی فطرت ہے کہ جو روایتیں اور حکایتیں مجالسِ وعظ و نصائح میں سنی جاتی ہیں یا کتابوں میں پڑھتے ہیں انھیں برمحل بیان بھی کر دیا کرتے ہیں، صوفیہ کرام بھی بزرگانِ سلف سے مروی روایات کو بیان فرمایا کرتے تھے بلکہ ملفوظاتِ مشائخ کے مطالعہ کی تاکید بھی فرماتے تھے[1] قرآن پاک سے بھی اس کا استحسان واضح ہے۔

جو علمِ مجلسی سے آگاہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ بیان کرنے والا خواہ ایک ہی شخص ہو، لیکن جب کسی ایک روایت کو مختلف مجالس میں بیان کرتا ہے تو حالات کے اقتضا سے اسلوب و جزئیات میں فرق پڑ جاتا ہے، اس امتیاز کو نقل میں بے احتیاطی سے وہی تعبیر کرے گا جو بیان کی نفسیات سے نابلد ہوگا، فوائد الفواد صفحات ۲، ۱۷ و ۱۴۴-۱۴۵ و ۲۰۲-۲۰۱ و ۵۹ میں اور خیر المجالس صفحات ۱۳۱ و ۱۳۷ میں ایسی ہی روایتیں ہیں جن سے اس اسلوبی امتیاز کی تصدیق ہوتی ہے، جن کے بیان کرنے والے بھی ایک ہی بزرگ ہیں اور لکھنے والے بھی ایک ہی ایک صاحبِ کمال ہیں، مگر اسلوب کا یہ امتیاز پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہے، البتہ بعض جملے ایسے ہوتے ہیں جو بعینہٖ برقرار رہتے ہیں بلکہ ضرب المثل بن جاتے ہیں۔

---

[1] فوائد الفواد ص ۲۴۔

راحت القلوب کی روایات کو بھی بیان کیا جاتا رہا ہے اور کیا جاتا ہے، فوائد الفواد میں متعدد روایتیں ایسی ہیں جو راحت القلوب سے ماخوذ ہیں، اور اسلوبی امتیاز کے وصف سے مالا مال ہیں، ہونی بھی چاہیے تھیں، کیونکہ وہ روایتیں حضرت محبوب الہیؒ نے باباصاحبؒ کی مبارک زبان سے سنی اور لکھی تھیں، جن کے بعض بعض جملے آپ کو ازبر تھے، تاہم اسلوب کا بعینہ برقرار رہنا خلاف فطرت ہے، بعض جملے جو برجستہ اور رواں ہوتے ہیں، وہ زبان زد رہتے ہیں، اور جوں کے توں منتقل ہوتے رہتے ہیں، اور وہی مشترک اور برقرار رہتے ہیں اور وہ ان دونوں کتابوں میں بھی ہیں، اشعار کا اعادہ بھی ہو سکتا ہے، اور ہوتا ہے، جو انسانی فطرت کے عین مطابق ہے، بہرحال ایسی بعض روایتوں کی نشاندہی مناسب ہوگی جو راحت القلوب سے ماخوذ اور فوائد الفواد میں منقول ہیں، اور وہ یہ ہیں:-

	راحت القلوب		فوائد الفواد	
(۱) خرقۂ معراج	راحت القلوب ص ۳	فوائد الفواد ص	۱۹۶	فارسی مطبعہ نولکشور
(۲) تبرک اوراد	" ۲۲	"	۱۰۰	"
(۳) ہفت ستارہ	" ۲۴	"	۱۲۳	"
(۴) فضیلت ماہ صیام	" ۲۶	"	۲۰۹	"
(۵) تحفۂ درود شریف	" ۳۰-۳۱	"	۱۰۷	"
(۶) عطیۂ ناصری	" ۳۱	"	۹۹-۱۴۵	"
(۷) مشارق الانوار	" ۳۲	"	۱۰۳	"
(۸) تذکرۂ شیخ حمویہؒ	" ۳۳	"	۱۲۹	"

اس قسم کی بعض اور روایتیں بھی ہیں، ان سے واضح ہے کہ راحت القلوب معتبر و مستند بھی ہے، اور مابعد کی کتب ملفوظات کا ماخذ بھی ہے۔

۱۳۔ سیاحت | سیاحت عہد وسطی کے درویشوں کا محبوب مشغلہ رہا ہے، وہ پُرآشوب زمانہ میں بھی برابر حرکت میں رہے ہیں، حرکت میں برکت بھی ہے، اور سفر وسیلۂ ظفر بھی ہے۔

حضرت باباصاحبؒ نے بھی اس عہد میں سیاحت فرمائی، بزرگوں کی صحبت سے فیض یاب ہوئے اور اپنے فیوض و برکات سے مخلوق کو نوازا، یہ بہت بڑا کام تھا، جسے سرانجام فرمایا، اسرارالاولیا، اور راحت القلوب میں آپ کے ممالک غیر کے سفر و سیاحت کا ذکر ملتا ہے،

راحت القلوب سے جن مقامات کی سیر و سیاحت کا پتہ چلتا ہے، وہ یہ ہیں:

بخارا، غزنی، سیوستان، بدخشان، بغداد اور سمت مغرب۔

سمت مغرب سے مراد ملک شام اور فلسطین خصوصاً بیت المقدس ہے، جہاں آپ نے جاروب کشی کی خدمت بھی انجام دی تھی۔

یقین ہے کہ بعض مقامات کا ذکر ملفوظات کے ان مجموعات میں بھی ہوگا جو دستبرد زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکے، اور آج نایاب و ناپید ہیں، فوائد الفواد میں صرف ایسے سفر کا ذکر ملتا ہے جس کا تعلق اندرون ملک سے ہے، بیرونی ممالک کی سیاحت کا ذکر اس میں نہیں ہے، مگر یہ وجہ انکار نہیں ہو سکتی، خواجہ امیر حسن علاء سنجریؒ کے اسلوب کا وصف ایجاز ہے، جس کی بدولت کتنی ہی اطلاعات نا تمام رہ گئی ہیں۔

فوائد الفواد میں وہ سب کچھ ہے جو حاضرین مجلس کے دکھ درد کی دوا ہے، مگر یہ سمجھنا کہ جو کچھ فوائد الفواد میں نہیں ہے، اس کا وجود ہی نہیں ہے، معقولیت سے بعید ہے، اس میں روغن[۱] فروش کی بیوی کا اور میر شکار[۲] کے واقعہ کا ذکر نہیں ہے جو نہایت درجہ حیرت انگیز اور بصیرت افروز ہے، اس میں لق و دق صحرائے اجودھن میں بیٹھنے[۳] اور گھن دار درخت کے نیچے حضرت باباصاحبؒ کے قیام فرمانے کا اور حضرت باباصاحبؒ کے چلۂ معکوس[۴] کا ذکر بھی نہیں ہے، (جو دیگر کتب میں ہے)، تو کیا ان سب ہی سے انکار کیا جاسکتا ہے؟ فوائد الفواد بلاشبہ رشد و ہدایت کا صحیفہ ہے، اور سالکان راہ سلوک کے لیے خضر راہ ہے، مگر انسانی کارنامہ ہے، جو سہو و خطا سے مبرا نہیں ہوتا، لہٰذا یہ تسلیم کرنا ہی ہوگا کہ راحت القلوب

[۱] خیر المجالس ص ۲۴۰ [۲] خیر المجالس ص ۱۴۷-۱۴۸ [۳] خیر المجالس ص ۸۹ [۴] سیر الاولیا ص ۴۰

کا بیان صداقت پر مبنی ہے، جس کا تعلق حضرت محبوب الٰہیؒ کے قلم سے ہے، اور اس باب میں
راحت القلوب کو ہر اعتبار سے فوقیت ہے، اور اس بنا پر حضرت بابا صاحبؒ کی
غیر ملکی سیاحت کا ذکر لائق تسلیم اور قابلِ قبول ہے۔

۴۔ خرق عادت و کرامت | کائنات عالم کا اگر گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو
ہر شے عجائبات قدرت سے مالامال ملے گی جب یہ ہے تو خرق عادت اور کرامت سے
وحشت کیوں؟ البتہ اتنی بات ہے کہ جو عجائبات دیکھنے میں آتے رہتے ہیں، طبیعت ان سے
مانوس ہو جاتی ہے تو ان کا عجوبہ پن نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے، اور جن سے گاہ بہ گاہ
واسطہ پڑتا ہے انھیں دیکھ کر انسان محو حیرت ہو جاتا ہے، ایسی باتیں بھی ہوتی ہیں، جو فہم و
ادراک میں سماتی نہیں، جیسے نابالغ بلوغ کی کیفیت کے احساس سے نابلد ہوتا ہے، مگر فی نفسہ
بلوغ کی کیفیت کیفیت ہے، جو عمر کی مخصوص منزل سے متعلق ہے، اس سے انکار کی گنجائش
نہیں، حضرت محبوب الٰہیؒ نے کیسی پیاری بات کہی ہے۔

"جو بات عقل سے بعید ہے وہ کچھ اور ہے، اور جو عقل میں نہ سمائے وہ کچھ اور
ہے، اور وہی کرامت ہے۔ (فوائد الفواد ص ۷)

ادراک کی معذوری ادراک ہی کا نقص ہے، ورنہ کرامت و خرق عادت فی نفسہ حقیقت
حقہ ہیں، جو بالطبع انسان کو مرغوب رہیں، صوفیہ کرام نے اس وصف سے بھی کام لیا ہے،
جس سے کارہائے نمایاں ظہور میں آئے ہیں اور جو آج نایاب ہے، راحت القلوب میں
بھی محیر العقول واقعات ہیں جو عہد وسطیٰ کے ادب عالیہ کا طرۂ امتیاز ہے، اگر راحت القلوب
میں یہ وصف نہ ہوتا تو وہ عصری اثرات سے محروم ہوتی جو اس کی خوبی نہیں نقص تصور ہوتا،
کرامت و خرق عادت ایک حقیقت ہے، اور کسی حقیقت سے روگردانی بعید از عقل ہے۔[1]

[1] خواجہ غلام فرید چشتیؒ کا ارشاد ہے:۔
اصل چیز ایمان و عقل ہے۔ ایمان و عقل ہے تو اولیا کرام کی کرامت پر یقین کریں اور دیکھ
سکیں کہ ساری کائنات میں کس طرح قدرت کی نشانیاں ہیں ۔
وفی کل شیئ آیۃ ؛ تدل علیٰ انہ واحد (مقابیس المجالس ترجمہ ص [illegible])

ایمان و عقل ہے تو قدرت کے عجائبات قدم قدم پر جلوہ گر ہیں۔

۱۵۔ حوالہ جات حضرت بابا صاحبؒ کے بیان کا یہ بھی وصف ہے کہ آپ دوران تقریر میں ماخذات کا ذکر فرمایا کرتے تھے، اور یہ بڑی خوبی کی بات ہے، راحت القلوب میں کم و بیش چونتیس ۳۴ حوالاجات ہیں، ان میں بعض وہ کتابیں ہیں جو اس عہد میں متداول تھیں اور آج بھی مستند اور معتبر ہیں، مثلاً:

(۱) قوت القلوب (ابوطالب مکیؒ) (۲) کفایہ (امام شعبیؒ) (۳) کشاف (زمخشری معتزلی کی تفسیر) (۴) مفصل (زمخشری کی کتاب النحو) (۵) تفسیر زاہدی (مولانا برہان الدین صاحب ہدایہ)۔

بعض ایسی کتب و رسائل ہیں جو اکابر صوفیہ سے متعلق ہیں، مثلاً:

(۱) اوراد شیخ عثمان ہرونیؒ (۲) اوراد شیخ معین الدین حسن سجزیؒ (۳) اوراد خواجہ قطب الدین بختیار اوشیؒ (۴) شرح خواجہ معین الدین حسن سجزیؒ (۵) اوراد شیخ شہاب الدین سہروردیؒ (۶) شنیدہ از زبان شیخ الاسلام قطب الدین بختیارؒ وغیرہ۔

بعض اور کتابیں بھی ہیں جن کا ذکر قدماء کی تصانیف میں ملتا ہے مگر وہ کتابیں جو آج دستیاب نہیں ہوتیں ان کے متعلق یہ بدگمانی کہ وہ جعلی یا فرضی ہیں کوتاہ عقلی کی علامت ہے۔ بہرحال حوالہ جات سے بیان کی اہمیت واضح ہوتی ہے جس سے راحت القلوب کا مستند و معتبر ہونا پوری طرح ثابت ہے۔

۱۶۔ ادعیۂ ماثورہ ادعیہ ماثورہ سے رغبت اور ان کی طلب انسانی فطرت کا خاصہ ہے، تدابیر میں کامیابی کے لیے بھی انسانی فطرت ادھر ہی جھکتی ہے، قرآن پاک ادعیہ کا خزینہ ہے، کتب احادیث میں ادعیہ کے مستقل ابواب ہیں، بعض بزرگوں نے اس موضوع پر مستقل کتابیں یادگار چھوڑی ہیں، ادعیہ سے بے اعتنائی خلاف فطرت ہے،

اسلام کی یہ تعلیم ہے کہ قدم قدم پر خدا کی یاد تازہ رہے، مسلمان لمحہ بھر بھی یادِ الٰہی سے غافل نہ ہو، اس لیے اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے غرض ہر ہر نقل و حرکت کے لیے ادعیہ کا ذخیرہ موجود ہے، اسے وظائف النبی صلعم سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے، انسان جب مشکلات کی دلدل میں

۱؎ حصن حصین ابوالخیر شمس الدین محمد الجزریؒ، جواہر القرآن امام غزالیؒ

پھنستا ہے اور جب تدابیر بھی جواب دے بیٹھتی ہیں تو اس بے چارگی کے عالم میں ادعیہ ہی کے وسیلہ سے سہارا ملتا ہے، بلکہ کاربرآری کی راہیں کھل جاتی ہیں، مستشرقین یورپ جنھوں نے اسلامیات کا اور مسلمانوں کے عروج وزوال کا گہرا مطالعہ کیا ہے، انھیں بے تکلف یہ کہنا پڑا ہے کہ جب کبھی مسلمانوں پر برا وقت پڑا ہے تو تصوف ہی نے انھیں سہارا دیا ہے، اور پستی سے بلندی پر لا بٹھایا ہے، ادعیہ بھی تصوف ہی کا ایک شعبۂ عمل ہے، اس سے ادعیہ کی اہمیت ظاہر ہے۔

فوائد الفواد میں منتشر طور پر ادعیہ کا اتنا ذخیرہ ہے کہ اگر یکجا کر دیا جائے تو اچھی خاصی کتاب الادعیہ تیار ہو جائے، راحت القلوب میں اتنا تو نہیں مگر جتنا کچھ ہے گراں قدر ہے، اور خوبی کی بات یہ ہے کہ زیادہ تر یکجا ہے، تلاش کرنے کی زحمت سے دوچار ہونا نہیں پڑتا۔

راحت القلوب کا وہ حصہ جو ادعیۂ ماثورہ پر مشتمل ہے منھ سے بڑا بول رہا ہے کہ معاشرہ کی وہ کیا کیفیت تھی جس کے تدارک کے لیے ان ادعیہ کی ضرورت تھی، ادعیہ کے رواج سے نکوکاری کو فروغ ہوتا ہے، معاشرے میں سدھار آتا ہے، صحت مند سوسائٹی وجود میں آتی ہے، جو انسانیت کے عروج کے لیے بہت ضروری ہے، ادعیہ کو اپنانے کے لیے اخلاص عمل درکار ہے اور کچھ بھی نہیں، بقول شخصے کہ یہ سستے قسم کا لٹریچر سہی لیکن نہایت درجہ مفید اور کارآمد ہے۔

۱۷۔ اسلوب بیان راحت القلوب کی زبان اتنی سادہ سلیس اور بامحاورہ ہے کہ بے تکلف اسے سہل ممتنع سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، سلوک کے پیچیدہ اور اہم مسائل کو سلجھا کر اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ مفہوم و مطلب دل میں اترتا چلا جاتا ہے، ہر خطے اور ہر طبقے کا فارسی داں بآسانی سمجھ لیتا ہے، زبان کی یہ خوبی نادر و نایاب ہے، مگر راحت القلوب اس وصف سے مالامال ہے، اس کے اسلوب میں ایسی پذیرائی اور دلآویزی ہے کہ دامن دل کو پکڑے ہی رہتی ہے۔

اس میں کارآمد ہدایتیں اور نصیحتیں کچھ اس خوبی سے جلوہ پیرا ہیں کہ دل قبول

کیے بغیر رہتا ہی نہیں ہے، بلکہ پڑھنے والا یہ سمجھنے لگتا ہے کہ میں ان ہدایتوں پر عامل ہو گیا ہوں اور مجھے ہدایت نصیب ہو گئی ہے، جو کچھ سیکھنا تھا، سیکھ لیا ہے، عمل پیرا ہونا بھی کچھ مشکل نہیں، ایسا لگتا ہے کہ نیک بندوں میں سے ہو گیا ہوں۔

ایسے بھی مقام آتے ہیں کہ طبیعت پر کیف طاری ہو جاتا ہے۔ آنکھیں پُرنم ہو جاتی ہیں، اور دل رونے لگتا ہے، عجب کیف و سرور کا عالم ہوتا ہے جو احاطہ تحریر میں نہیں سما سکتا، رو دھو لیتا ہے تو اپنے آپ کو ہلکا پھلکا اور صاف ستھرا پاتا ہے اور اپنے کو عجب نورانی فضا میں محسوس کرتا ہے۔

ترغیب و تحریص اور تخویف کچھ ایسے موثر انداز میں ہے کہ دل کو موہے بغیر رہتی نہیں ہے۔ کشش و جاذبیت کا یہ عالم ہے کہ کتاب کو ہاتھ میں لینے کے بعد چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔ طبیعت ڈھلی میں مزید ہی کھچی رہتی ہے، اہل دل اس کے کیف سے آج بھی مستفیض ہو سکتے ہیں، یہ اسی وصف کا پرتو ہے جس کی طرف حضرت محبوب الٰہیؒ نے اشارہ فرمایا تھا:

'بارہا در ذوق بیاں مردم چناں فرد می شد کہ تمنا بردہ شدے کہ اگر چنیں زماں مردم بمیر دیگو باشد۔' (فوائد الفواد ص ۵۰)

اسے حضرت محبوب الٰہیؒ کے اخلاص عمل سے تعبیر کیجیے یا حضرت باباصاحبؒ کی تاثیر کلام سے، بات ایک ہی ہے، کاش کہ راحت القلوب کا کوئی کامل نسخہ دستیاب ہوتا تو حقیقت حال زیادہ آشکار ہوتی۔

۸۔ نفسِ مضمون: راحت القلوب کیا ہے، اسلامی تعلیمات اور روحانی قدروں کا نچوڑ ہے۔ اس کا لفظ لفظ ہدایت کے نور سے متجلّی ہے، چشم بصیرت ہے تو اس میں بہت کچھ ہے ؎

دل کی نگاہ فکر کی بینائی چاہیے جلوے ہیں عام ظرف تماشائی چاہیے

(اسرار کرت پوری)

اس میں بکثرت جواہر پارے ہیں، جن پر عمل پیرا ہونے سے زندگی سدھر جاتی ہے، اور عاقبت بخیر ہو جاتی ہے۔ ایسی تعلیمات کے کچھ نمونے یہ ہیں:

(۱) حضرت باباصاحبؒ کا ارشاد ہے کہ شیخ الاسلام حضرت خواجہ قطب الدین

بختیار اوشیؒ نے اپنے استاذِ محترم کا یہ قول نقل فرمایا ہے:

(۱) "انسان جب تک محبت کی صیقل سے آئینۂ دل کو صاف نہ کرے گا، اس وقت تک اللہ کے ذکر سے انسیت نہ ہوگی، البتہ جب درمیان میں کوئی شئے حائل نہ رہے گی تو وصالِ حق کی لذت سے بھی لطف اندوز ہوگا، ورنہ غاریں کی نعمت نصیب نہ ہوگی۔"

(۲) "درویشوں کے متعلق بہرحال حسنِ ظن رکھنا چاہیے، تاکہ اس حسنِ ظن کی برکت سے حق کی حمایت حاصل رہے۔"

(۳) "درویشی پردہ پوشی ہے، خرقہ اسی کے لیے ہے جو ہر کسی کی پردہ پوشی میں ساعی ہے اور عیب جوئی سے محترز رہتا ہے جب یہ وصف پیدا ہوتا ہے تو اس وصف سے متصف شخص درویشوں میں شامل ہو جاتا ہے اور اس کا مدعا پورا ہونے لگتا ہے۔"

(۴) "جو کچھ خدا کے پاک کی رضا کے مطابق صرف کیا جاتا ہے، خواہ وہ کتنا ہی زیادہ ہو، اسراف نہیں ہے البتہ جو کچھ اس کے خلاف صرف ہوگا وہ اسراف ہے، اس سے محترز رہنا چاہیے، لا اسراف فی الخیر۔

(۵) "جوہرِ سعادت تو سبھی میں ہے، فضلِ الٰہی بھی ہر ایک کے شاملِ حال ہے، تاہم جد و جہد لازم ہے، اس لیے کہ جو بھی مرتبے کو پہنچا ہے وہ کوشش اور مجاہدے کے وسیلے ہی سے پہنچا ہے۔"

(۶) "انسان اور اللہ پاک کے درمیان دنیا سے بڑھ کر کوئی پردہ نہیں ہے، یہی حجابِ اکبر ہے۔"

(۷) "دنیاوی کاموں میں مشغول رہنے سے دل مردہ ہو جاتا ہے، وہ شرائین خشک ہو جاتی ہیں جن پر احساساتِ لطیفہ کا دار و مدار ہے، ذاکر و شاغل رہنا چاہیے، تاکہ دل ذکر و شغل کے نور سے منور اور زندہ رہے۔"

(۸) "جو درویش دنیاوی مشاغل میں منہمک رہتا ہے اور عز و جاہ کا طالب ہے، وہ درویش نہیں مردودِ طریقت ہے۔"

(۹) "جو خرقہ پہنے، درویشی کا روپ رچائے پھر امیروں اور دنیا داروں سے میل ملاپ رکھے، مرغن کھانے کھائے وہ درویش نہیں، راہ گم کردہ ہے۔"

(۱۰) "ذکر میں اتنا منہمک رہنا چاہیے کہ رونگٹا رونگٹا ذاکر بن جائے۔۔۔۔ جو شخص جو کچھ کرتا مرے گا وہی کرتا بعد قیامت اٹھے گا، زندہ ہوگا۔

(۱۱) "دل کا اللہ کی یاد میں لگا رہنا، راہ سلوک میں دل کا زندہ رہنا ہے، جو اصل حیات ہے، یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں، یہ خوبی نصیب ہوتی ہے اکلِ حلال سے، اور دنیا داروں سے کنارہ کشی کرنے سے۔"

(۱۲) صحابۂ کرامؓ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو علم دانائی کا ہی حاصل کرتے تھے اس سے اوروں کو بھی فیضیاب فرماتے تھے۔ "نیکی کی تبلیغ کی راہ یہی ہے۔"

(۱۳) "شیخ طریقت کو اتنی قدرت کمال حاصل ہو کہ جب کوئی بیعت وارادت کی غرض سے آئے تو اپنی ذاتی صلاحیت اور نورِ معرفت کی تاثیر سے طالب کے کدورت آلود دل کو آئینہ بنا دے، اگر یہ وصف نہیں ہے تو پیر و مرشد دونوں گم کردہ راہ ہیں۔"

(۱۴) "اگر کسی کو شیخ کامل نہ ملے تو اسے اہل سلوک کی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہنا چاہیے اور بقدر امکان عمل بھی، شیخ کامل نہ ملنے کی تلافی ہو جائے گی۔"

(۱۵) شیخ کو چاہیے کہ مرید کو ہدایت کرے کہ وہ سرمایہ داروں اور امیروں سے ربط ضبط نہ بڑھائے، بلکہ الگ تھلگ رہے، دنیاوی دولت کا طالب نہ ہو، نہ زیادہ بولے اور نہ بلا ضرورت قدم باہر نکالے۔"

(۱۶) "نماز مومن کی معراج ہے۔ الصلوٰۃ معراج المومنین۔"

(۱۷) "نیک بندوں اور نکوکاروں کی صحبت اختیار کرنی چاہیے، حدیث شریف میں ہے: صحبۃ الصالحین نور و رحمۃ للعٰلمین (نیکوں کی صحبت نور ہے اور رحمت ہے تمام عالم کے لیے)

(۱۸) جو خدائے پاک کے کام میں لگا رہتا ہے، احکام خداوندی کی تعمیل میں منہمک رہتا ہے، رب العزت اس کے کاموں میں آسانی فرما دیتے ہیں، اور وہ بے تردد

سرانجام ہو جاتے ہیں۔"

(19) "کسی کے پیچھے میں بندھ جاؤ، کسی کے مرید ہو جاؤ، کچھ نہیں تو مخلوق کی خدمت کے ہو رہو، کسی مقام عزت پر فائز ہو جاؤ گے۔

(20) "درود و وظائف کے لیے جو وقت مقرر کر لیا ہے اس کا پابند رہنا چاہیے۔ اگر بشریت کے تقاضے سے وقت پر سرانجام نہ ہو سکے تو پھر کسی اور وقت آ کے انجام دے لو، اگر دن کو قضا ہو گیا ہے تو رات کو پورا کر لو ترک نہ کرو۔"

(21) "ہر شے کی حد و انتہا ہوتی ہے اور غایت بھی، عبادت کی غایت عشق ہے اور فراست علم کے بغیر رنج بیہودہ ہے، اور علم عشق کے بغیر دردِ سر ہے۔"

(22) علم کیا ہے ابر رحمت ہے، رحمت ہی رحمت اس سے برستی ہے۔"

(23) "حدیث شریف میں ہے: ایک فقیہ عالم ایسے ہزاروں عابدوں سے افضل ہے جو دن میں روزہ رکھتے ہیں، اور رات میں کھڑے ہو کر عبادت کرتے ہیں۔"

(24) "جب کوئی حصول علم میں غفلت روا نہیں رکھتا اور علم حاصل کر لیتا ہے تو اس کو حق جل شانہ حق کو باطل سے، نیکی کو بدی سے امتیاز کرنے کی اور حلال کو حرام سے امتیاز کرنے کی توفیق عنایت فرما دیتے ہیں۔"

(25) "زبان سے اللہ پاک کا ذکر کرتے رہنا ایمان کی نشانی ہے، نفاق سے رستگاری ہے، بلیات سے پناہ و حفاظت ہے اور اس کی بدولت دوزخ سے خلاصی نصیب ہوتی ہے۔"

(26) "کوئی ذکر قرآن پاک کی تلاوت کے برابر نہیں، یہ سب سے افضل و بہتر ہے، اس کا اجر و ثواب تمام عبادتوں سے اعلیٰ و افضل ہے۔"

(27) "دعا سے بڑھ کر اللہ پاک کے نزدیک اور کوئی شے نہیں ہے، اللہ پاک کو سب سے پیارا وہ ہے جو دعا میں مشغول رہتا ہے لیس شیئ اکرم عند اللہ من الدعاء (الحدیث)

یہ ہیں معدودے چند جواہر پارے، جن کی تعلیم حضرت بابا صاحبؒ نے فرمائی ہے اور جو راحت القلوب کے اوراق کی زینت ہیں۔

اہم ترین روایتیں کتب ملفوظات کا مطالعہ شاہد ہے کہ کتب ملفوظات کے اسلوب اور نقطۂ نظر میں ہم آہنگی ہے، البتہ جن مجالس میں ایسے بھی سامعین شریک ہوتے ہیں جنھیں مخلوق کی خدمت اور رہنمائی کی اور شیخ کی جانشینی کی ذمہ داری سنبھالنی ہوتی ہے، تو ان مجالس میں کچھ اہم ترین روایتیں بھی بیان کردی جاتی ہیں جو مفاد عامہ کے سوا خصوصی خود مذاد خصوصی رہنمائی کے وصف کی جامع ہوتی ہیں، ان ہی میں کچھ ایسے نکات بھی ہوتے ہیں کہ عقلی لنگا ہیں ان کی کنہ کو نہیں پہنچتیں، "راحت القلوب" میں بھی بعض ایسی ہی روایتیں ہیں جن کی تفہیم عام اذہان کی گرفت میں نہیں آتی، یہاں ان ہی کی قدر ےعقدہ کشائی مقصود ہے تاکہ عوام تردد بیجا میں مبتلا ہو کر گمراہ نہ ہوجائیں، اللہ پاک حق کی حمایت کی توفیق عنایت فرمائیں۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

روایت نمبر ۱ حضرت بابا صاحبؒ نے فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو شب معراج میں بارگاہِ رب العزت سے خرقہ عنایت ہوا تھا، آپ معراج سے تشریف لائے تو صحابہ کبار رضی اللہ عنہم کو بلایا اور فرمایا مجھے بارگاہ ایزدی سے خرقہ ملا ہے اور حکم ربی یہ ہے کہ میں یہ خرقہ تم میں سے کسی ایک کو تفویض کردوں، اب ایک بات میں تم سے دریافت کرتا ہوں، تم میں سے جو بھی صحیح جواب دے گا یہ خرقہ اسے دے دوں گا، پہلے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے دریافت کیا کہ اگر یہ خرقہ میں تمھیں دوں تو تم کیا کروگے، حضرت ابوبکر صدیقؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں سچائی اختیار کروں گا، خدائے پاک کی عبادت کروں گا اور جو دنیاوی مال ومنال ہے وہ سب راہِ خدا میں صرف کردوں گا، پھر امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ سے دریافت کیا کہ اگر یہ خرقہ میں تمھیں دوں تو تم کیا کروگے، حضرت عمر فاروقؓ نے عرض کیا کہ میں عدل سے کام لوں گا، اور بندگانِ خدا سے انصاف برتوں گا اور مظلوموں کی حمایت کروں گا، پھر امیر المومنین حضرت عثمان غنیؓ سے دریافت کیا کہ اگر یہ خرقہ میں تمھیں دوں تو تم کیا کروگے؟ تو حضرت عثمان غنیؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) میں باہمی میل ملاپ سے کام کروں گا، حق کی پیروی کروں گا، شرم اختیار کروں گا اور سخاوت کروں گا، پھر آپؐ نے امیر المومنین سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے دریافت کیا کہ اگر میں یہ خرقہ تمھیں دوں تو تم کیا کروگے؟ سیدنا علی کرم اللہ وجہہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں پردہ پوشی اختیار کروں گا اور بندگانِ خدا کے عیبوں کو

چھپاؤں گا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے علی لو! یہ خرقہ میں تمھیں دیتا ہوں۔ مجھے اللہ تعالیٰ کا یہی حکم تھا کہ تمھارے احباب میں سے جو یہ جواب دے اسی کو یہ خرقہ دے دینا (راحت القلوب ص۳۳)

حضرت بابا صاحبؒ یہ بیان کرکے زار و قطار رونے لگے اور بیہوش ہوگئے، جب ہوش میں آئے تو فرمایا کہ درویشی پردہ پوشی است یعنی پردہ پوشی ہی کا نام درویشی ہے، پردہ پوشی کی عادت اخلاقیات کا اہم رکن ہے، اس کے نقدان سے انسان مہلک مصائب میں مبتلا ہو جاتا ہے، جس قدر بھی کوئی اس پر عمل پیرا ہوگا اتنا ہی وہ امن و عافیت سے رہیگا، اسے درویشی کا اصل اصول سمجھنا چاہیے، اس کے فضائل و فوائد احاطہ تحریر و تقریر میں سما نہیں سکتے۔ صوفیہ کرام کے خرقہ کو خرقۂ معراجیہ سے نسبت ہے۔

اس روایت میں دو نکتے ہیں، جن سے کچھ غلط خلجان میں مبتلا ہوتے ہیں، ایک تو یہ کہ خرقۂ معراجیہ کو ناقہمی سے مادی خرقہ تصور کرتے ہیں اور یہ غلط ہے، خرقۂ معراجیہ مادی خرقہ نہیں لطیفۂ غیبی ہے جو اسرار کے شعاعی حروف اور اس کی عکس گاہ کے تصور سے نیم حل ہو جاتا ہے۔ خلق قرآن کا قائل گروہ بھی اس نکتہ کو سمجھ نہ سکا تھا، خرقۂ معراجیہ کے باب میں عالم و عارف خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۱۹ھ/۱۹۰۱ء) کا ارشاد ہے:

"خرقۂ معراجیہ ایک باطنی چیز ہے اور راز خفی ہے، اور اشیائے محسوسہ میں سے نہیں" (مقابیس المجالس ص ۲۵۶ مترجمہ)

دوسرا خلجان وہ ہے جس کی طرف خواجہ گیسو دراز بندہ نوازؒ نے اشارہ فرمایا ہے:

"حدیث خرقہ — اس حدیث اور قصے کو کتب حدیث میں جو صحیح و معتبر ہیں، میں نے کہیں نہیں دیکھا"[1] (جوامع الکلم ملفوظ ۸ رشعبان ۸۰۲ھ)

نہ دیکھنا تو عدم وجود کی وجہ قرار نہیں پاتی، اگر فی الواقع ان کتب حدیث میں نہ بھی موجود

---

[1] صورۃ معکوس کے متعلق شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے جو اظہار خیال فرمایا ہے۔ وہ گویا حضرت بندہ نواز گیسو درازؒ کے بیان ہی کی آواز بازگشت ہے۔ شاہ صاحبؒ نے فرمایا ہے لَمْ نَجِدْهُ من سنة و لا اقوال الفقهاء (القول الجمیل فصل ۵) ہم نے سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اور اقوال فقہاء میں اسے نہیں پایا گویا کہ یہ بھی خواجہ گیسو درازؒ کی مثل اپنی ہی نارسائی کا اعتراف ہے۔ صاحب اقتباس الانوار نے جو تعریض فرمائی ہے۔ وہ معقول نہیں ہے۔

صحیح و معتبر ہیں تو بھی وجہ انکار لازم نہیں آتی۔ کیونکہ احصا کا تصور نا روا ہے، پھر اس کے بیان کرنے والے وہ بزرگ ہیں جو شیخوں سے بڑھ کے متقی اور صاحب علم و عرفان اور بصیرتِ باطنی سے مالا مال تھے، جن کے قول پر پوری طرح اعتماد کیا جاسکتا ہے اور کیا جاتا ہے، اور جو اصول حدیث سے بھی پوری آگاہی رکھتے تھے، اور اصول حدیث کا درس بھی دیتے تھے [1]

یہ روایت مارت مدایہ سے مروج ہے، اسرار الاولیاء میں بھی، اور سیر الاولیاء میں بھی جیسے ادب صوفیہ میں بے مثل اور نہایت درجہ مستند مانا جاتا ہے، اہم ترین یہ ہے کہ موضوعات میں سے نہیں ہے اور ان کتابوں میں نہیں ہے جو موضوعات پر ہیں بہرحال خرقہ معراجیہ لطیفہ غیبی ہے جو امور باطنیہ سے متعلق ہے، اور خرقہ فقر اسی کی نسبت سے مالا مال اور گوناگوں اوصاف کا جامع ہے، ان نکات کے ذہن نشین ہونے کے بعد اس روایت کو سمجھ لینے میں کوئی دشواری حائل نہیں رہتی۔

روایت نمبر ۲ حضرت محبوب الٰہیؒ نے لکھا ہے کہ محمد شاہ نامی ایک شخص آئے جو حضرت باباصاحبؒ کے دوستوں میں سے تھے، وہ بہت ہی پریشان حال تھے، کیونکہ ان کا بھائی قریب المرگ اور حالتِ نزع میں تھا، وہ آتے ہی زمیں بوس ہوئے، حضرت باباصاحبؒ نے فرمایا بیٹھو! وہ بیٹھ گئے، حضرت باباصاحبؒ روشن ضمیر تھے سمجھ گئے کہ یہ پریشان حال کیوں ہیں، تاہم دریافت فرمایا کہ پریشان کیوں ہو؟ انھوں نے عرض کیا کہ آپ کو روشن ہے کہ بھائی کی حالت سے پریشانی ہے، حضرت باباصاحبؒ نے بلا تامل فرمایا: تمہارا بھائی تو اچھا ہو گیا ہے اور بیٹھا کھانا کھا رہا ہے، ایسا لگتا ہے کہ بیمار ہوا ہی نہ تھا،
(راحت القلوب ص ...)

اس بیان میں حضرت باباصاحبؒ کی فرمودہ یہ تین چیزیں ہیں: "بنشیں، چیست متغیری، برادر تو نیکو شدہ است" باقی پورا بیان حضرت محبوب الٰہیؒ کا نوشتہ ہے، یہی ذکر فوائد الفواد (ص ۲۳۲) میں ہے۔ جو حضرت محبوب الٰہیؒ سے منقول اور خواجہ امیر حسن علاء سجزیؒ کا نوشتہ ہے اور اگرچہ اسلوب بیان میں فرق ہونا فطری شے ہے، تاہم

[1] سیر الاولیاء ص ...، [2] سیر الاولیاء ص ۳۵۲ -

دیکھنا یہ ہے کہ جامعیت و بلاغت کے اعتبار سے ترجیح کسے ہے؟ چنانچہ جب حضرت بابا صاحبؒ نے یہ دریافت فرمایا کہ "چرا متغیری؟ پریشان کیوں ہو تو انھوں نے عرض کیا: از حالِ برادر خورد کہ روشن است، لیکن خواجہ امیر حسن علا سنجریؒ نے اس خیال کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"فرمود چہ حال است؟ گفت برادرے دارم رنجور و درہم چنانکہ رمقے بیش نماندہ است ایں ساعت کہ من بخدمت آمدم چہ عجب کہ تمام شدہ باشد بہ سبب آں درہم و زیر و زبر ہستم (۲۳۳)

محل غور یہ ہے کہ حسن ادب اور جامعیت و بلاغت اس اختصار میں ہے کہ از حالِ برادر خورد کہ روشن است یا اس تفصیل میں ہے جو خواجہ امیر حسن علا سنجریؒ کے قلم کا شاہکار ہے، اس کے علاوہ حضرت محبوب الٰہیؒ کے بیان میں اور بھی خوبیاں ہیں جن کی تفصیل کا یہ محل نہیں[1]۔ البتہ ایک جملے کی طرف توجہ مبذول کرانا مناسب ہے جو حضرت محبوب الٰہیؒ نے حضرت بابا صاحبؒ کی زبانی نقل فرمایا ہے، "برو برادر تو نیکو شدہ است" (جاؤ تمھارا بھائی اچھا ہو گیا ہے) امیر حسن علا سنجریؒ نے لکھا ہے: "برو برادر تو صحت خواہد یافت" (جاؤ تمھارا بھائی اچھا ہو جائے گا) غور طلب یہ ہے کہ تسکین و طمانیت کے سروسامان کا زیادہ جامع جملہ کون سا ہے اور کون سا اقتضائے حال کے زیادہ مطابق ہے، بلا تکلف تسلیم کرنا ہوگا کہ راحت القلوب کے بیان کو ہر اعتبار سے فوائد الفواد کے بیان پر ترجیح ہے، جو تسکین و طمانیت کے سروسامان کا جامع بھی ہے اور اقتضائے حال کے مطابق بھی ہے۔ گویا کہ اسلوب بیان کے لحاظ سے راحت القلوب کے بیان کو ترجیح ہے۔

روایت نمبر ۳ حضرت بابا صاحبؒ نے فرمایا کہ میں بغداد کی طرف مسافر تھا، میں شیخ اجل سجزی (سنجری) سے ملا، وہ بزرگ اور بارعب پیر تھے، میں ان کے جماعت خانہ میں داخل ہوا میں نے سلام کیا، انھوں نے میرے سلام کا جواب دیا، میری طرف دیکھا اور فرمایا: "آؤ شکر عالم آؤ، خوب آئے، بیٹھو" میں بیٹھ گیا، اس تعمیل حکم سے وہ خوش ہوئے اور مجھ پر بہت کرم فرمایا میں کئی دن ان کی خدمت میں رہا، میں نے نہیں دیکھا کہ کوئی ان کی خانقاہ سے محروم

[1] اس نکتہ کو سمجھنے کے لیے کہ یہ شکر عالم ہیں، خیر المجالس ص ۲۳۹ میں مرقوم روغن فروش کی بیوی کا واقعہ ذہن نشین رکھنا چاہیے، اس وصف کا تعلق اوصاف ولایت سے ہے۔

گیا ہو، اگر کچھ نہ ہوتا تو وہ آنے والے کو چھوارے کی گٹھلی ہی دے دیتے اور یہ دعا دیتے کہ خدائے پاک تمھارے رزق میں برکت عنایت فرمائے، میں نے وہاں کے رہنے والوں سے سنا ہے کہ انھوں نے جس کسی کو یہ دعا دی وہ زندگی بھر کسی کا محتاج نہ ہوا۔

(راحت القلوب ص ۵)

شیخ اجل رحمۃ اللہ علیہ کا نام نامی کتب ملفوظات خواجگان چشتؒ میں اکثر ملتا ہے، لیکن متداول تذکرے ان بزرگ کے احوال میں خاموش ہیں، کتابت کا یہ بھی کرشمہ ہے کہ شیخ اجل کو کہیں سنجری لکھا ہے، کہیں سرزی لکھا ہے اور کہیں شیرازی لکھ دیا ہے، فوائد الفواد میں شیرازی ہے اور ص ۲۳ میں سرزی ہے، سیر الاولیاء ص ۲۲۵ - ۳۴۸ میں سرزی ہے اور ص ۱۷۴ میں شیرازی ہے، اسرار الاولیاء ص ۳۲ میں سوزی ہے اور ص ۳۳ - ۴۵ میں ستوری ہے، راحت القلوب ص ۵ - ۷ میں سنجری ہے، بہرحال تاوقتیکہ کسی تذکرے سے تصدیق نہ ہو جائے اور یہ تحقیق نہ ہو جائے کہ وہ باشندے کہاں کے تھے، یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فی الواقع شیخ اجلؒ سنجری تھے یا شیرازی تھے یا سرزی تھے، کیونکہ ملفوظات میں یہ لفظ کئی مختلف نسبتوں سے مرقوم ملتا ہے، البتہ راحت القلوب میں ایک ہی نسبت سے یاد کیا گیا ہے، پھر بھی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جا سکتی، اس کے علاوہ یہ کہنا بھی بالغ العلمی کے منافی ہے کہ سنجریؒ بروزن خنجری غلط ہے اور سجزی (س ج زی) صحیح ہے، صحیح دونوں ہی ہیں

؎ زمانۂ قدیم میں ایران کے جنوبی کوہستانی علاقہ کو سنگستان اور ملک نیمروز کہتے تھے، اور وہاں کے باشندوں کو سنگری کہتے تھے، سجزی (س ج زی) سنگری ہی کا معرب ہے، شیخ ابو الفضل نے لکھا ہے:

"خواجہ معین الدینؒ از سیستان است و اہل آں دیار را سنگری می خوانند و ادبا سنجری می نویسند کہ معرب سنگری است"۔ (اکبر نامہ ج ۲ ص ۱۵۴)

غالباً اہل ایران کے ذوق سلیم نے سنگستان کو گوارا نہیں کیا، انھوں نے اسے سیستان سے بدل دیا، چنانچہ ملک الشعراء فردوسی طوسی نے لکھا ہے:

منم کردہ ام رستم داستاں ۔۔۔ وگرنہ یلے بود در سیستاں

(بقیہ آئندہ صفحہ پر)

لیکن سہل الادا ہونے کی بنا پر سنجری کو سجزی پر فوقیت ہے، اس لیے سنجری (س ن ج ری)
لکھا، پڑھا اور بولا جاتا ہے، لہٰذا جو کچھ حضرت بابا صاحبؒ نے بیان فرمایا اور جو کچھ حضرت
محبوب الٰہیؒ نے نقل فرمایا، وہ حرف حرف صحیح ہے، اور اس روایت کو تسلیم کرنے میں کوئی
معقول وجہ مانع نہیں ہے۔

بقیہ: رستم کے باپ زال نے کوہستانی علاقہ میں پرورش پائی تھی، جسے سنگستان سے سیستان کہا جانے لگا تھا۔
عربوں کا لہجہ گ ادا کرنے سے قاصر تھا، ان کے حروف ابجد میں گاف نہیں ہے، لہٰذا عرب
جغرافیہ نویسوں نے سنگستان کو سجستان لکھا ہے، جسے اکثر ہندوستانی اہلِ قلم نے اپنایا ہے، اسی سے
اسم منسوب سجزی (س ج زی) ہے، مگر اسے رواج عام نصیب نہیں ہوا، جس کی وجہ ظاہر ہے
کہ اس کے تلفظ میں عیب تنافر ہے، ج اور ز قریب المخرج ہونے کی وجہ سے بآسانی زبان سے
ادا نہیں ہوتے، اہلِ علم تو بتکلف ادا کر لیتے ہیں، مگر عوام اس کا صحیح تلفظ ادا کرنے سے
قاصر رہتے ہیں، غالباً اسی لیے تذکرہ نویسوں نے سنجری (س ن ج ری) لکھا ہے، سجزی (س
ج زی) نہیں لکھا، البتہ خواجہ امیر حسن علاء سنجریؒ نے ضرورتِ شعری سے ایک شعر میں سجزی نظم کیا
اور لکھا ہے ؎

صفے کہ جمع کردیم محو است چشتی پایند — حسن علاء سجزی یکے از امیدواران

اس کے علاوہ میرے علم میں کوئی دوسری مثال نہیں ہے، مگر شعرائے فارس نے اکثر سنجر
اور سنجری ہی نظم کیا ہے، مولانا شیریں سنجری عرفائے کاملین خوش گو شاعر گزرے ہیں جن کا کلام
آج تک محافلِ سماع میں سماعت ہوتا ہے، ان کا مشہور قطعہ ہے ؎

چو چترِ سنجری رخِ بختم سیاہ باد — در دل بود اگر ہوس ملکِ سنجرم
زاں دم کہ یافتم خبر ملکِ نیم شب — من ملکِ نیمروز بیک جو نمی خرم

مشہور عرب جغرافیہ نویس بلاذری نے اپنے بیان کے ساتھ سجستان کا جو نقشہ شامل کیا ہے
اس میں ایک مقام کا نام سنج لکھا ہے (فتوح البلدان جزو ۲ حصہ ۲ ص ۵۵) غالباً یہ وہی مقام ہے جسے
تذکرہ نویسوں نے قصبہ سنجر لکھا ہے، سنجری (س ن ج ری) اقلیم سے زبان زدِ خاص و عام ہے اور بالکل
صحیح ہے اسے غلط بتانا ہی غلط ہے، اکثر و بیشتر معتبر تذکرہ نویسوں نے سنجری ہی لکھا ہے سجزی کسی نے نہیں لکھا۔

روایت نمبر ۳ | حضرت بابا صاحبؒ نے فرمایا کہ میں کئی دن شیخ سیف الدین باخرزیؒ کی خدمت میں رہا، ان سے رخصت ہونے کے بعد رات کو ایک مسجد میں قیام کیا، صبح کو میرے علم میں آیا کہ یہاں ایک صومعہ عبادت خانہ ہے، اور اس میں ایک بزرگ رہتے ہیں، میں اس صومعہ میں داخل ہوا تو میں نے وہاں ایک بزرگ کو دیکھا جو بہت ہی باعظمت و ہیبت تھے، مجھے اس وقت تک ایسے باعظمت و ہیبت بزرگ سے شرف ملاقات نصیب نہیں ہوا تھا، وہ عالم تفکر میں کھڑے تھے اور آنکھیں ہوا کے رخ کھلی ہوئی تھیں یعنی آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے، تین چار دن رات کے بعد وہ عالم صحو میں آئے، ہوشیار ہوئے، میں نے سلام کیا، انھوں نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا، میرے سبب سے تمھیں تکلیف ہوئی، اچھا بیٹھو، میں بیٹھ گیا، انھوں نے فرمایا کہ میں شمس العارفین کے بیسویں دیوتوں یا نواسوں میں سے ہوں اور تیس برس سے معتکف ہوں مگر اے فرید، اس تیس سالہ مدت میں حیرت و دہشت کے سوا مجھے کچھ نصیب نہیں ہوا۔

(راحت القلوب ص ۵)

یہ حکایت طویل ہے اور حیرت انگیز ہے، لیکن بہت ہی سبق آموز ہے، شمس العارفین نام یا لقب کے کتنے ہی بزرگ گزرے ہیں، "خدائے عزوجل را چند شمس العارفین است" (فوائد الفواد ص) محمد عطا شمس العارفین ترک بیابانیؒ کا مزار پرانوار (ترکمان دروازہ) دہلی میں ہے، شاہ جمال شمس العارفین کا مزار پرانوار علی گڑھ میں ہے، شیخ نظام الدین ابوالمؤیدؒ کے پیر طریقت کا نام شیخ عبدالواحد غزنوی تھا جو شمس العارفین کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے (خزینۃ الاصفیا ج ۱ ص ۸۰۳)، غزنی ہی میں ایک بزرگ مولانا حسام الدین نبہ دان بہہ) تھے، جو حضرت شمس العارفین کے آزاد کردہ غلام تھے، نبہ ان کے نام کا لاحقہ ہے، ان کا ذکر حضرت محبوب الٰہیؒ کے مبارک زبان پر آیا ہے، آپ نے فرمایا:

"مردے بود در غزنیں او را مولانا حسام الدین نبہ گفتندے، نبہ شمس العارفین بود، او مرید خواجہ اجل سنجری بود" (فوائد الفواد ص ۱۵۳ مطبع نولکشور)

نبہ دراصل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام کا نام ہے[1]، گو کہ اس کے معنی ہیں مشہور، مگر اردو داں طبقہ اس لفظ سے فی الجملہ واقف نہیں ہے چنانچہ ایک دانشور نے

[1] غیاث اللغات

اسے نبیرہ سمجھا، مگر یہ نہیں سمجھا کہ اگر یہ نبیرہ ہے تو مولانا حسام الدین کا الحاقہ کیوں ہے؟ بہرحال یہ مولانا حسام الدین نبیرؒ کبھی خواجہ اجل سنجزیؒ کے مرید تھے مگر یہ ہرگز شمس العارفین کے پوتے یا نواسے نہیں تھے، بلکہ حضرت شمس العارفینؒ کے آزاد کردہ غلام تھے، حضرت بابا صاحبؒ کی ملاقات نبیرگانِ شمس العارفین میں سے جن بزرگ سے ہوئی تھی وہ ہرگز مولانا حسام الدین نبیرہ نہ تھے جو غزنیں میں تھے بلکہ وہ کوئی اور بزرگ تھے جو بخارا کی حدود میں کسی صومعہ میں معتکف تھے۔

روایت نمبر ۵ | حضرت بابا صاحبؒ نے بسبیل تذکرہ فرمایا کہ شیر خاں اُچ اور ملتان کا حاکم تھا، وہ مجھ سے کچھ ایسا عقیدہ نہ رکھتا تھا جو لائق ذکر ہو، بارہا یہ شعر اس کے متعلق پڑھا یا کہا گیا:

۵ افسوس کہ از حالِ منت نیست خبر آنگہ خبرت شود کہ افسوس خوری

(افسوس تجھے میرا حال معلوم نہیں، البتہ جب تجھے میرے حال سے آگاہی ہوگی تو تجھے ملال ہوگا)

کچھ دنوں بعد ہی کفار نے اس شہر پر حملہ کیا، اور لوٹ مار کر کے سب کچھ لے گئے۔

(راحت القلوب ص ۱۷)

شیر خاں والی اُچ و ملتان تاتاری یورش کے دوران ۶۶۳ھ میں مارا گیا، اور تاتاری سب کچھ لوٹ کر لے گئے تھے، یہ ذکر اسرار الاولیاء ص ۶۹ اور فوائد الفواد ص ۲۲۰ - ۲۲۱ میں بھی ہے، بیان میں وہی فرق ہے جو مختلف مجالس میں بیان کرنے یا مختلف اشخاص کے بیان کرنے میں ہوا کرتا ہے، یہ واقعہ حضرت بابا صاحبؒ کی حیات کا ہے، ایسا ہی ایک واقعہ بابا صاحبؒ کی وفات کے بعد بھی پیش آیا تھا، جس کا ذکر امیر خورد کرمانیؒ نے کیا ہے، اور جس میں حضرت بابا صاحبؒ کے لاڈلے بیٹے شیخ نظام الدینؒ شہید ہوئے تھے۔ امیر خورد کرمانیؒ کا بیان یہ ہے:

"چوں بعد نقل شیخ شیوخ العالم کفار در دیارِ اجودھن رسیدند، خواجہ نظام الدین از جہت مردی و غایت دلاوری بحرب کفار پیوست، بعد قتال بسیار شہادت یافتند" سیر الاولیاء ص ۱۹۰ (چ)

یہ واقعہ دراصل اس شعر سے متعلق ہے جو مولانا بدر الدین اسحاقؒ نے اسرار الاولیاء

(ص ۹۵) میں حضرت بابا صاحبؒ کی زبانی نقل فرمایا ہے، اور وہ یہ ہے ؎

درویش بہ شہرے نبودے اگر مقام گشتے سراسر ہمہ عالم خراب حالی

فوائدالفواد کے بیان سے یہ مترشح ہے کہ شیرخاں کے ذکر کے ساتھ حضرت محبوب الہیؒ نے اس واقعہ کا ذکر بھی فرمایا تھا جو حضرت بابا صاحبؒ کی وفات کے بعد پیش آیا تھا اور جس میں آپ کے صاحبزادے شیخ نظام الدین شہید ہوئے تھے، اس ذکر سے مدعا کیا تھا یہی کہ کسی کامل درویش کے اٹھ جانے سے مخلوق کو آفات و بلیات سے دوچار ہونا پڑتا ہے، اس میں کوئی کلام نہیں، اور اگرچہ خواجہ حسن علاء سجزیؒ نے بعد ازاں کی پیوندکاری سے حادثۂ اجودھن کو واقعۂ شیرخاں سے علیحدہ کر دیا ہے، مگر ان کی ایجاز نگاری کی بدولت اس طرح ترتیب پایا اور ضم ہوا ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ حادثہ اجودھن ہی وہ حادثہ ہے جس میں شیرخاں مارا گیا تھا، مگر ایسا نہیں ہے، اس ابہام کے رفع ہونے سے واقعہ کی اصل کیفیت واضح ہو جاتی ہے، اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر ابہام ہے تو فوائدالفواد کے بیان میں ہے، راحت القلوب کا بیان اقتضائے حال کے مطابق اور واضح ہے، جس سے راحت القلوب کا اعتماد بحال رہتا ہے، اور تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ دیرینہ روزی کے اثرات سے متاثر ہونے کے باوجود راحت القلوب کے بیانات معتبر ہیں اور راحت القلوب ہی فوائدالفواد کا ماخذ ہے۔

روایت نمبر ۱۶ حضرت بابا صاحبؒ نے فرمایا کہ ایک دفعہ بدخشاں کی طرف مسافر تھا، اس شہر میں بہت سے اولیاء اللہ تھے، چنانچہ حضرت ذوالنون مصریؒ کے نبیسہ[1] (پوتے یا نواسے) شیخ عبدالواحد بھی شہر کے باہر ایک غار میں رہتے تھے، جب میں نے یہ سنا تو میں اس غار کے پاس پہنچا اور میں نے دیکھا کہ وہ بزرگ نہایت زار و نزار اور لاغر و کمزور ہیں، ایک پیر ان کا غار کے اندر ہے اور دوسرا کٹ پڑا ہے، ایک ہی پیر پر وہ عالم تحیر میں کھڑے ہیں، میں ان کے پاس گیا، سلام کیا، انھوں نے میری طرف رخ کیا اور فرمایا: بانشیں، بانشیں، یہی

---

[1] نبیسہ اور نبیرا کا اطلاق پوتے اور نواسے کی اولاد پر بھی ہوتا ہے۔ درگاہ حضرت محبوب الہیؒ کے وابستگان میں ایک خاندان حضرت بابا صاحبؒ کے نواسے خواجہ محمد امامؒ کی اولاد ہے جو نبیرگان مشہور ہے۔ اور زبان زد خلائق ہے۔ پروفیسر محمد حبیب نے نبیسہ کا ترجمہ Grandson کیا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ مزید براں زمانے کے فصل کی بنا پر اعتراض کرنا نہایت نامناسب ہے جو ہرگز انھیں زیبا نہ تھا،

چاہیے، یہی چاہیے (آپ کھڑے تھے) آپ فرماتے ہیں کہ میں بھی تین رات دن کھڑا ہی رہا، مگر
وہ میری طرف متوجہ نہ ہوئے، تین دن کے بعد عالمِ صحو میں آئے، ہوشیار ہوئے اور فرمایا کہ اے
فرید! میرے پاس نہ آؤ، اگر آؤ گے تو جل کے خاک ہو جاؤ گے اور دور بھی نہ رہو ورنہ مہجور
ہو جاؤ گے (دور ہی رہو گے تو وصلِ الٰہی نصیب نہ ہوگا) لیکن میری کہانی سنو، ستر سال سے
میں اس غار میں کھڑا ہوں، میں نے ایک عورت کو دیکھا کہ کہیں جا رہی ہے، میرا دل مائل ہوا،
میں نے قدم باہر نکالا، ہاتفِ غیب سے آواز آئی کہ وعدہ تو یہ تھا کہ میرے سوا کسی طرف مائل
نہ ہوگے، چھری میرے پاس تھی یہ ندا سنتے ہی میں نے اس پیر کو کاٹ کر باہر پھینک دیا کیونکہ
وہ خواہشِ نفسانی سے باہر نکلا تھا۔ اب کوئی تیس برس جو ستر سالہ عمر ہی میں شامل ہے، عالمِ تحیر
میں ہوں، اور ڈرتا ہوں کہ کل قیامت کے دن کیا منہ دکھاؤں گا... (راحت القلوب ص ۱۰۹)

حکایت طویل ہے، مدعا اتنے ہی بیان سے واضح ہے کہ یہ واقعہ محیرالعقول ہے، مگر جہاں گشتی
کے سفر میں اکثر سیاحوں کو ایسے واقعات سے واسطہ پڑتا رہا ہے، تردد بیجا سے کیا حاصل ہے
ایسے واقعات بھی اس عہد کے تارک الدنیا بزرگوں سے مختص ہیں کہ بعض نے جذبۂ ندامت سے
مغلوب ہو کر اپنے کو جسمانی تکالیف میں مبتلا کر لیا ہے، مخدوم نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے بھی
ایسے واقعات بیان فرمائے ہیں، حالانکہ انھیں نہ اس نوعیت کے سفر سے واسطہ پڑا اور نہ
انھوں نے بیرونی ممالک کے سفر کیے، مگر پھر بھی انھوں نے ایسے واقعات نقل فرمائے ہیں،
مولانا حمید قلندرؒ نے لکھا ہے کہ آپ نے بیان فرمایا:

(۱) ایک بزرگ نے جذبۂ ندامت سے متاثر ہو کر اپنے پیر کاٹ ڈالے تھے (خیرالمجالس ص ۲۴۵)
(۲) ایک بزرگ نے لذتِ ذائقہ کی سزا دہی میں اپنی زبان چبالی تھی (" ص ۲۴۸)
(۳) ایک بزرگ نے بازار میں ایک عورت کو دیکھا اور دیکھنے کے جرم میں اپنی ایک آنکھ نکال پھینکی تھی (" ص ۲۵۲)

محیرالعقول واقعات راحت القلوب ہی سے مخصوص نہیں، ان کتبِ ملفوظات میں بھی ہیں جو
نہایت درجہ مستند سمجھی جاتی ہیں جن میں ایک خیرالمجالس ہے، نیز یہ تصور کہ ہمارے مشائخ متقدمین نے
جوگیوں اور سنیاسیوں کے مٹھوں میں حاضری دی ہے، اور ان کی تعلیمات سے مستفید ہوئے ہیں،[1] اور یہ

[1] منادی دہلی بابا فرید نمبر ص ۱۵۹ میں لکھا ہے کہ صوفیائے کرام نے جوگیوں کے مٹھوں میں حاضری دی ہے اور ان کی تعلیمات سے مستفید ہوئے ہیں۔

واقعات اسی استفادہ کا ثمرہ ہے یہ تصور سراسر غلط ہے (دھشا تخا بریون عن حق التھمۃ) بلکہ یہ تصور ہی احساس کمتری اور سیکولرزم کی نارو فوقیت سے متاثر ہونے کا نتیجہ ہے جو قطعاً خلاف واقعہ ہے، در اصل ان اعمال کا منبع طبیعت کی لینت، گدازی اور خشیت ربی ہے، یہ روایت بھی خرق عادت ہونے کے باوجود بھی وہی مقام رکھتی ہے جو خیر المجالس کی روایات کا مقام ہے۔ اگر خیر المجالس نہایت درجہ مستند ہے تو راحت القلوب اس سے زیادہ مستند ہے، جو اس سے ایک صدی پہلے کی یادگار ہے۔

روایت نمبر ۷ حضرت بابا صاحبؒ نے فرمایا کہ قطب الاسلام خواجہ قطب الدین بختیار اوشیؒ نے یہ ارشاد فرمایا کہ ایک دن میں اور شیخ جلال الدین تبریزیؒ اور شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی قدس سرہ ملتان میں تھے، اس زمانہ میں قباچہ[1] ملتان کا حاکم تھا، وہ آیا اور اس نے کہا کہ مغل (تاتاری) شہر کے نزدیک پہنچ گئے ہیں، آپ کا کیا حکم ہے، حضرت خواجہ قطب الدین قدس سرہ کے پاس ایک تیر تھا، آپ نے وہ اسے دیا اور فرمایا کہ جاؤ! اسے ان کی طرف چلا دو" اس نے ایسا ہی کیا، چنانچہ ایک بھی نہ رہا، سب ہی بھاگ گئے۔" (راحت القلوب ص ۱۰۹)

یہ روایت خواجہ امیر حسن علاء سجزیؒ نے بھی نقل کی ہے، میں ان دونوں کتابوں سے اس روایت کے آخری جملے نقل کرتا ہوں، تاکہ حقیقت حال واضح ہو جائے:

"بحکم اشارت خواجہ ہمچناں کرد	قباچہ ہمچناں کرد، چوں روز شد
یک نفر مغل نماندہ بود، ہمہ روبگریز	یک تن از کافر نماندہ، ہمہ رفتند
نہادند۔ (راحت القلوب ص ۱۰۹-۱۱۰)	(فوائد الفواد ص ۱۰۸)

محل طلب یہ ہے کہ ابہام مغل میں ہے یا کافر میں ہے، روبگریز نہادن روزمرہ بھی ہے اور محاورہ بھی ہے، کیا اسے ہمہ رفتہ بودند پر ترجیح نہیں ہے۔ العاقل تکفیہ الاشارہ یہ واحد مثال ہی اسلوب کی جزالت اور بیان کی جامعیت کی نیز روایت کے حسن ترتیب کی بیّن دلیل ہے۔

---

[1] ناصر الدین قباچہ سلطان قطب الدین ایبک کا داماد تھا جو قطب الدین ایبک کی وفات ۶۰۷ھ/۱۲۱۰ء کے بعد ملتان اُچ اور سندھ کا خود مختار حاکم بن گیا تھا، ۶۲۴ھ/۱۲۲۷ء میں شمس الدین التمش نے شکست دی، وہ کشتی میں بیٹھ کر بھاگا کشتی ڈوب گئی، قباچہ بھی مر گیا، اس کا عہد حکومت ۶۰۷ھ تا ۶۲۴ھ ہے، پندرہ سال حکمراں رہا۔

روایت نمبر ۸ | حضرت بابا صاحبؒ نے فرمایا کہ جب برادرم شیخ بہاء الدین زکریا قدس اللہ سرہٗ کا وقت آخر قریب آیا تو آپ کے بڑے صاحبزادے شیخ صدرالدینؒ دروازے پر کھڑے ہوئے تھے، ایک شخص آیا اور ایک ملفوف خط انھیں دیا اور کہا: اسے کھولنا نہیں، بند کا ہی اپنے والد بزرگوار کی خدمت میں پیش کر دینا، مجھے یہی حکم ہے کہ یہ خط میں آپ کو دوں اور آپ اسے شیخ بہاء الدین زکریاؒ کو پہنچا دیں، تاکہ وہی اسے پڑھیں، شیخ صدرالدینؒ نے سرنامہ پڑھا تو زار و قطار رونے لگے، اور کہا: یہ طلب دوست کیا ہے، ملک الموت ہے جو اس روپ میں آیا ہے، اس نے کہا: ہاں! یہی بات ہے، شیخ صدرالدینؒ نے کہا: تم خود ہی کیوں نہیں چلے جاتے، اس نے کہا: مجھے حکم یہی ہے کہ میں تمھیں دوں اور تم خدمت شیخ میں پیش کرو، جب شیخ صدرالدینؒ خط لے کر حاضر خدمت ہوئے تو شیخ بہاء الدینؒ مشغول تھے، جب فارغ ہوئے تو شیخ صدرالدینؒ نے بڑے ادب سے خط پیش کیا، شیخ بہاء الدینؒ نے خط لیا، کھولا اور پڑھا، صاحبزادے سے کہا: تم چلے جاؤ، پھر سجدہ کیا اور جان بحق تسلیم کی، اندر سے آواز آئی کہ شیخ بہاء الدین دوست سے جا ملے[1] ... (راحت القلوب ص ۲۰-۲۱)

خواجہ امیر حسن علاء سنجریؒ نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے، اگرچہ مختلف اشخاص کے بیان میں تھوڑا فرق ہوتا ہے لیکن موازنہ میں دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ ایک ہی مضمون یا ایک ہی خیال کو کس نے زیادہ خوبی سے ادا کیا ہے، اس روایت کے آخری جملے دونوں کتابوں سے نقل کیے جاتے ہیں، جو خود منھ سے بولیں گے اور بتائیں گے کہ کس کا کیا مقام ہے:

این مکتوب بدست شیخ داد، چوں شیخ این مکتوب
را بشمار زکریاؒ و بشرف مطالعہ مشرف گشت
فی الحال سر بسجدہ نہاد و جان
بداد، داد ودود از درون حجرہ برآمد کہ شیخ بہاء الدینؒ
بدوست پیوست۔ (راحت القلوب ص ۲۲-۲۳)

آں نامہ را بدست شیخ بہاء الدین
داد رحمۃ اللہ علیہ، شیخ چوں آں نامہ را
بخواند بیہوش و نعرہ برخاست و شب را
واقعہ شیخ شد
(فوائد الفواد ص ۲۲۱)

[1] شیخ بہاء الدین زکریاؒ کا سنہ وفات بروئے تحقیق ۶۶۶ھ ہجری ہے، بعضوں نے ۶۶۱ھ لکھا ہے غلط لکھا ہے۔

دونوں بیان پیش نظر ہیں، جو ملفوظات پڑھے بول رہے ہیں کہ واقعہ کی صحیح عکاسی کس میں ہے، پوری کیفیت کا ترجمان کون سا بیان ہے، اور گفتنی و ناتمام کون سا ہے "شعر را خاست" کیا ہے؟ اگر مبہم نہیں ہے تو اس کا مفہوم کیا یہ نہیں سمجھا جا سکتا کہ چیخ پکار کی آوازیں بلند ہوئیں جو خلافِ واقعہ ہے، اس سے کب یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ اندر سے آواز آئی کہ شیخ بہاء الدینؒ اللہ سے جا ملے، یہ کیا پیارا اسلوب ہے، مرزا غالب کو شاید ایسوں ہی سے واسطہ پڑا تھا جو انھوں نے کہا تھا سے

حسن فروغ شمع سخن دور ہے اسدؔ — پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

مختصر یہ ہے کہ راحت القلوب کی روایت کو زبان و بیان اور حسنِ ترتیب کے اعتبار سے پوری پوری فوقیت ہے، جو اس کے معتبر ہونے کی بین دلیل ہے۔

روایت نمبر ۹ | حضرت بابا صاحبؒ نے فرمایا کہ شیخ سیف الدین باخرزی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے پیر شیخ نجم الدین کبریٰؒ کو خواب میں دیکھا کہ یہ فرماتے ہیں کہ تمھارا بہت اشتیاق ہے، تم آجاؤ، شیخ سیف الدینؒ اس ہفتے متواتر وعظ کہتے رہے، اور ان مواعظ میں جدائی اور فراق کا ذکر فرماتے رہے، سب وعظ سننے والے حیران تھے کہ یہ فراق و جدائی کے مضامین متواتر کیوں بیان کر رہے ہیں آخر ایک دن جب آپ نے وعظ ختم کیا تو حاضرین کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ اے مسلمانو! یہ بات جان لو کہ میرے پیر نے مجھے بلایا ہے اور خواب میں کہا ہے کہ اب چلے آؤ، لہٰذا اب میں جاتا ہوں، فراق و جدائی کے مضامین بیان کرنے کا مدعا یہی تھا، منبر سے اتر آئے اور گھر چلے گئے، جس رات آپ کا انتقال ہونے والا تھا سب دوست بیٹھے تھے، مشعل روشن کر رکھی تھی اور شیخ سیف الدین پر فراق کی کیفیت طاری تھی، کوئی تین گھنٹے رات گزری تھی کہ ایک بزرگ آئے جو اون کا لباس پہنے اور ہاتھ میں ایک سیب لیے ہوئے تھے آئے، زمین بوس ہوئے اور وہ سیب شیخ سیف الدینؒ کو دیا، جیسے ہی آپ نے اس کو سونگھا جان بحق تسلیم کی۔ (راحت القلوب ص ۲)

یہ روایت خواجہ امیر حسن علاء سجزیؒ نے بھی نقل کی ہے، اختلافِ بیان تو فطری شے ہے، لیکن سیر حاصل ہونا یا نہ ہونا امر دیگر ہے، اس روایت کے بھی آخری جملے بالمقابل نقل کیے جاتے ہیں، تاکہ موازنہ کی ترازو میں تول کر فیصلہ کیا جا سکے

تذکیر تمام آورد، روئے سوئے جمع	چوں تتمیہ تمام کرد، بعد ازاں روئے

آورد و گفت کہ اے مسلمانان بدانید کہ پیر من مرا در خواب می خواند من می روم خیر باد این بود کہ گفتم فرود آمد و در خانہ رفت، ہماں شب کہ نقل خواہند کرد جملہ اصحاب نشستہ بودند بشغل می بودند و شیخ سیف الدینؒ در فراق، پاسے از شب گذشتہ کہ بزرگے صوف پوشیدہ، سیب در دست گرفتہ بیامد، روئے بر زمین برآورد، و آں سیب بدست وے داد، بوی کردن ہماں بود، و جاں بحق تسلیم کردن ہماں۔ (راحت القلوب ص ۲۳)

سوئے جمع کرد و گفت، اے مسلمانان بدانید و آگاہ باشید کہ پیر من مرا در خواب گفتہ است کہ بیا، من می روم، خیر باد این بگفت واز منبر فرود آمد، ہمدراں نزدیکی نقل فرمود،

(فوائد الفواد ص ۲۲۲)

غور طلب بلکہ تصفیہ طلب یہ ہے کہ تکمیل کے سروسامان سے کون سا بیان آراستہ ہے، اور کس سے طلب اور تشنگی رفع ہوتی ہے، نگارش کے ایجاز سے کس میں سقم پیدا ہو گیا ہے اور کس میں نہیں، کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ اطناب کے وصف نے مفہوم کو خبط کر دیا ہے اور مقصود و معنی بدل گئے ہیں، یا ایسے نقل ہیں بے احتیاطی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، اور کیا اس سے وضع و تحریف کی نشان دہی ہوتی ہے؟ نہیں! یہ سب وساوس ہیں، اور علمی و ادبی قدروں سے کم آگاہی کی علامت ہے، راحت القلوب کی عبارت نہایت سنجیدہ و برجستہ، روزمرہ و محاورہ کے مطابق، اور راستقام اطناب و ایجاز سے پاک، سادہ و دلآویز ہے، آخری عبارت کہ بوی کردن ہماں بود و جاں بحق تسلیم کردن ہماں پورے عبارت کی جان ہے، جو کسی اہل زبان صاحب کمال ہی کے قلم سے نکل سکتا ہے، اس کے سامنے اس جملے کی کیا حیثیت ہے کہ ہمدراں نزدیکی نقل فرمود، حق یہ ہے کہ راحت القلوب میں جابجا حضرت باباصاحبؒ کے بے مثل اسلوب کا پرتو اور حضرت محبوب الٰہیؒ کے کمالِ طبیعت کی آب و تاب جلوہ فرما ہے جو آج بھی اہل دل کو مسحور کیے لیتی ہے، حالانکہ مدت مدید سے راحت القلوب

؎ شیخ سیف الدین باخرزی کا سنہ وفات بروئے تحقیق ۶۵۸ھ ہے، جو حضرت محبوب الٰہیؒ کے ارشاد کے مطابق ہے۔

کس مپرسی کے عالم میں ہے اور جواب اوراق منتشرہ کا مجموعہ ہے، جب اچھا وقت ہوگا تو کیا عالم ہوگا، راحت القلوب زبانِ حال سے کہہ رہا ہے؎ قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا۔

روایت نمبر ۱۰ حضرت بابا صاحبؒ نے فرمایا کہ رمضان کا مبارک مہینہ آ ہی گیا ہے، کوئی ہے کہ مں تراویح میں قرآن پاک ختم کیا کردن، حضرت محبوب الٰہیؒ لکھتے ہیں کہ سب ہی آمادہ ہوگئے، زمین بوس ہوئے اور عرض کیا کہ اس سے بڑی سعادت اور کیا ہوگی، پھر حضرت بابا صاحبؒ ہر شب تراویح میں دو قرآن پاک ختم فرماتے، ہر رکعت میں اکثر دس پارے پڑھتے، اور ابھی کوئی تین گھنٹے رات رہتی کہ تراویح سے فارغ ہوجاتے تھے (حضرت محبوب الٰہیؒ فرماتے ہیں کہ) اس مہینہ میں کبھی تراویح میں شریک رہا، (راحت القلوب ص ۲۷)

یہ روایت بہت کچھ لطف اور سبق آموز ہے، زبان و بیان کی جامع بھی ہے، اس لیے جو فارسی اسلوب سے کما حقہ واقفیت نہیں رکھتے وہ غلط سمجھتے اور الجھ کر رہ جاتے ہیں، مثلاً حضرت بابا صاحبؒ نے فرمایا: "اینک ماہِ مبارک رمضان است" جو صاحب اس کے معنی یہ سمجھے کہ "یہ رمضان ہی کا مہینہ ہے" وہ غلط سمجھے، اور غلط تاریخی و نادر راجات کا ارتکاب کر بیٹھے، مگر اینک نے اس کارستانی کے چہرے سے نقاب اٹھا دیا ہے:

اینک مرکب ہے، حرفِ اشارہ قریب ایں سے اور کافِ تصغیر سے، مدعا یہ ہے کہ جس طرف اشارہ ہے وہ قریب تر تو ہے، مگر ہلکا سا فصل بھی ہے، یہ ایسا ہی اسلوب ہے جیسا کہتے ہیں کہ اب تو رمضان آ ہی گیا کل نہیں تو پرسوں پہلا روزہ ہے، جس طرح "آ ہی گیا ہے" کا مدعا یہ نہیں کہ ماہِ رمضان میں یہ جملہ کہا گیا ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ آنے والا ہی ہے اور قریب تر ہے، اسی طرح حضرت بابا صاحبؒ کے اس ارشاد کا تعلق انتیس ۲۹ یا تیس شعبان سے ہے، لہٰذا مجلس کے آغاز میں ۵ رمضان کا اندراج غلط اور بالکل غلط ہے، اسے وہی صحیح جانے گا اور اس پر اعتماد کرے گا جو اسالیب بیان کی نزاکتوں سے بے بہرہ ہوگا، اگر یہ کہنا ہوتا کہ یہ رمضان ہے تو کہہ دیا جاتا "ایں ماہِ مبارک رمضان است" کافِ تصغیر کی ضرورت ہی کیا تھی۔

جنھوں نے تدریس کی تربیت پائی ہے اور مجموعی سوالات کی اہمیت سے آگاہ ہیں، وہ اس امر سے بھی آگاہ ہیں کہ بعض اوقات مجمل سوالات مفصل سے اچھے ہوتے ہیں جو سب ہی کو متاثر کرتے ہیں،

زباں داں بھی ایماء و اشارہ کو صراحت پر ترجیح دیتے ہیں، ان نکات کا تعلق علم بیان و معانی سے ہے
حضرت باباصاحبؒ کا یہ ارشاد کہ "باشد کہ در نماز تراویح ختم قرآن کنم" ان ہی اوصاف کا جامع ہے
جو انسانی نفسیات کے ماہر ہیں وہ جانتے ہیں کہ عمومی حالات میں تحریص و ترغیب زیادہ کارآمد ہوتی
ہے بمقابلہ تحکیم کے، لہذا حضرت باباصاحبؒ کا مذکورہ جملہ علمی و ادبی اوصاف کا ایسا دلپذیر مرقع ہے جو
تعریف و توصیف سے بالاتر ہے، اگر کوئی نہ سمجھے تو یہ اس کے فہم کا قصور ہے، عہد حاضر کے کم علم یک
پاس کے معنی بھی خال خال ہی جانتے ہیں، اس کے معنی ہیں تین گھنٹے کا وقفہ ڈیڑھ گھنٹہ قرار دینا
مضحکہ خیز ہے، اس روایت میں ایک جملہ یہ بھی ہے جو حضرت محبوب الہیٰؒ کا نوشتہ ہے کہ در ہر رکعت "دہ
سیپارہ اکثر خواندے" اس میں اکثر صفت ہے جو موصوف کی افزونی کو بتاتی ہیں، اور جو بطور استثنا
اپنے موصوف سے پہلے آتی ہے، موصوف کبھی اسم ہوتا ہے اور کبھی فعل، اردو فارسی میں یکساں مروج ہے،
مذکورہ جملے میں اکثر صفت خواندے کی ہے، اس کو دہ سیپارہ کی صفت قرار دینا، اور دہ سیپارہ
اکثر کے یہ معنی بیان کرنا کہ دس سیپارے سے کچھ زیادہ غلط ہے، اگر سیپارہ کی صفت ہوتی تو دہ سیپارہ
سے بیشتر ہوتی، لہذا اس جملے کے معنی یہ ہیں کہ حضرت باباصاحبؒ اکثر و بیشتر ہر رکعت میں دس پارے
پڑھتے تھے، یہ نہیں کہ دس سے زیادہ پڑھتے تھے، یہ غلط معنی بیان کرنا علم صرف و نحو سے بے بہرہ ہونے
کی دلیل ہے، اگر دس سے زیادہ بتانا مقصود ہوتا تو کہتے دہ سیپارہ اکثر خواندے و قدرے دیگر خواندے۔
اب رہی یہ بات کہ حضرت باباصاحبؒ ہر شب تراویح میں دو قرآن پاک ختم کر لیا کرتے
تھے، اور تین گھنٹے رات باقی رہتی تھی کہ آپ فارغ ہو جاتے تھے، یہ حیرت انگیز ضرور ہے مگر
اولیاء اللہ سے اس کا وقوع ناممکن نہیں ہے ع کار پاکاں را قیاس از خود مگیر۔ اس تعداد سے
کہیں زیادہ تلاوت کر لینا اولیاء اللہ سے ثابت ہے، فوائد الفواد، اور سیر الاولیاء کو نہایت درجہ
مستند اور ادب صوفیہ میں بے مثل بتایا جاتا ہے، اور اس میں کلام بھی نہیں، اور یہ بھی مانا جاتا ہے کہ
ان کتابوں میں جو حصہ کرامات وغیرہ سے متعلق ہے وہ غیر محتاط بیانوں سے پاک ہے، لہذا اگر فوائد الفواد
اور سیر الاولیاء میں کچھ ایسا ہی ملتا ہے تو پھر مذکورہ وقفے میں دو قرآن پاک پڑھ لینے میں شبہ کی
گنجائش نہیں رہتی، حضرت محبوب الہیٰؒ کا ارشاد ہے:

"پیر گفت من روزے ہفت صد بار ختم قرآن می کنم... و گفت ملفوظی لا مرحبا"

(فوائد الفواد ص ۷)

اور یہ بھی ہے :-

"یکے از مریدان خاص بود، سوال کرد کہ ایں مگر کرامت باشد، خواجہ فرمود ازیں کرامت باشد" (فوائد الفواد ص ۷)

یہ بھی فرمایا:

"شیخ بہاء الدین زکریا رحمۃ اللہ علیہ شبے روئے بسوئے حاضران کرد و گفت کسے باشد از شما کہ امشب دو رکعت نماز کند، و در یک رکعت ختم قرآن کند، از حاضران کسے ایں معنی متکفل نگشت، شیخ بہاء الدینؒ پیش رفت و در یک رکعت ختم قرآن کرد چہار سیپارہ دیگر بخواند و در رکعت دوم سورۂ اخلاص خواندہ نماز تمام کرد"

(فوائد الفواد ص ۷)

خواجہ امیر حسن علا سجزیؒ مزید لکھتے ہیں:

"ملاقم ایں معنی حکایت دیگر فرمود کہ شیخ بہاء الدین علیہ الرحمۃ گفتے کہ ہر چہ بمن رسید از نماز و اوراد مشائخ از ہا ہمہ کردم، مگر یک چیز نتوانستم کرد، آں پنہاں بود کہ بمن رسانیدند کہ فلاں بزرگ از آغاز صبح تا طلوع آفتاب ختم قرآن می کند، ہر چند کہ بخواستم نتوانستم" (فوائد الفواد ص ۷)

حضرت محبوب الٰہیؒ کے ارشادات سے یہ واضح ہے کہ ایسے بزرگ بھی گزرے ہیں جو روزانہ سات سات سو مرتبہ قرآن پاک ختم کر لیتے تھے، شیخ الاسلام شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے ایک رکعت میں ایک قرآن پاک ختم کیا اور چار سیپارے مزید پڑھ لیے، شیخ الاسلام شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے بقول ان کے معاصرین میں ایک بزرگ ایسے بھی تھے جو آغاز صبح سے طلوع آفتاب تک ختم قرآن فرما لیا کرتے تھے، شیخ الاسلام شیخ بہاء الدین زکریاؒ نے اس امر کو ناممکن قرار نہیں دیا بلکہ اتباع کی کوشش فرمائی، یہ اپنی جگہ ایک بات ہے کہ ان کی مشق و مہارت نے ساتھ نہیں دیا، مگر وہ اس پر یقین رکھتے تھے کہ یہ ممکن ہے، اور ظن غالب یہ ہے کہ انجام کار وہ اپنی سعی میں کامیاب بھی ہو گئے ہوں گے۔

لہ کسے باشد کا محل استعمال ذہن نشین رہنا چاہئے اور دیگر بخواند کا بھی ۔

امیر خورد کرمانیؒ بھی اس نقطۂ نظر سے متفق و متحد ہیں، چنانچہ ناصر الملۃ والدین حضرت خواجہ ابو یوسف چشتی قدس اللہ سرہٗ العزیز کے مبارک ذکر میں لکھتے ہیں:

"تمامی کلام اللہ خواجہ ابو یوسف را محفوظ شد، چنانچہ ہر روز پنج ختم کردن گرفت۔"

(سیر الاولیاء ص ۴۴)

امیر خورد کرمانیؒ کے اس بیان کی تصدیق فوائد السالکین سے بھی ہوتی ہے، قطب الاسلام حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشیؒ نے حضرت خواجہ ابو یوسف چشتیؒ کے مبارک ذکر میں فرمایا:

"در آخر عمر کار بجائے رسید کہ ہر روز پنج بار ختم قرآن کردے، بعد ازان ورد تلاوت دیگر شدے" (فوائد السالکین مجلس پنجم ص ۲۷)

اس سے یہ بھی واضح ہے کہ سیر الاولیاء کا ماخذ فوائد السالکین ہی ہے، البتہ فوائد السالکین کے بیان میں سیر الاولیاء کے بیان سے زیادہ جامعیت ہے، جب پانچ پانچ قرآن پاک ہر روز ختم کیے جا سکتے ہیں تو آٹھ سات گھنٹے میں دو قرآن پاک ختم کر لینے میں کیا کلام ہو سکتا ہے، اب کوئی جوش عقلیت سے کنارہ کش ہو کر گنتی گنتا اور حساب لگاتا ہے، لیکن ہرگز حقیقت تک رسائی نہ ہو گی، کیونکہ ان تعداد کا تعلق حضرت محبوب الٰہیؒ کے ارشاد "آرے کرامت باشد" کے مطابق کرامت سے ہے جو حساب لگانے اور گنتی گنتے رہنے سے گرفت میں نہیں آسکتے، حقیقت حال یہ ہے کہ جو قومیں آمادۂ زوال ہوتی ہیں یا ہو چکی ہوتی ہیں، ان اقوام کے بعض تعلیم یافتہ اشخاص کا ذہن لطیف حقائق کے ادراک کی صلاحیت سے عاری ہو چکا ہوتا ہے، اس لیے انھیں اپنے اکابر کے کارناموں سے انکار کرتے ہی بن پڑتی ہے، یہ قوا کی بدحالی کی علامت ہے، فالِ نیک نہیں ہے۔

الغرض ان تشریحات سے وہ عقدے حل ہو جاتے ہیں جن تک سطحی اذہان کی رسائی نہیں ہے، اور اس روایت کا اس طرح نقش عمل جمتا ہے کہ حضرت بابا صاحبؒ عشاء کی نماز کے بعد تراویح میں قرآن پاک اس طرح تلاوت فرماتے کہ چار رکعت میں دس دس پارے پڑھتے اور چھ رکعت میں بیس پارے پڑھ لیتے باقی دس رکعات میں سورۂ اخلاص پڑھتے اور تین گھنٹے رات رہے فارغ ہو جاتے تھے، اس صورت حال سے "در ہر رکعت وہ سیپارہ اکثر خواندے" اور سورۂ اخلاص کی مواظبت برقرار رہتی ہے، جس کا ذکر حضرت محبوب الٰہیؒ کی مبارک زبان پر آیا ہے

آپ نے فرمایا:

"پیش شیخ من در تراویح سورۂ اخلاص می خواندند" (سیر الاولیاء ص ۳۷۹)

ان تشریحات سے یہ بھی واضح ہے کہ یہ روایت اکابر صوفیۂ کرام کے احوال و اعمال کے عین مطابق ہے، اور کسی دانشور کو کلام کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ الحمدللہ وہ جملہ شبہات رفع ہوگئے جو فارسی زبان سے کم آگاہی اور اصول تصوف سے عدم واقفیت اور احوال و اعمال صوفیہ سے بے خبر ہونے کی بنا پر لاحق ہوئے یا ہوسکتے تھے یا ہوسکتے ہیں، واللہ یہدی من یشاء الی صراط مستقیم۔

روایت نمبر ۱۱ حضرت محبوب الٰہیؒ لکھتے ہیں کہ حضرت بابا صاحبؒ شیخ جمال الدین اوچیؒ کا ذکر فرما رہے تھے، کہ اتنے میں ایک بوڑھا جوگی کہیں دور سے آیا جس نے مجاہدے بھی بہت کیے تھے آیا اور حضرت بابا صاحبؒ کی خدمت میں زمین بوس ہوا، اور خاصی دیر زمین پر سر دھرے رہا، حضرت بابا صاحبؒ نے للکار کر کہا: سر اٹھاؤ اس نے سر اٹھایا اور ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوگیا، حضرت بابا صاحبؒ نے دریافت کیا: کیسے ہو، کہاں سے آئے ہو؟ اچھے ہو، خوش ہو؟ کئی بار دریافت کیا تو اس نے دبی دبی زبان سے کہا: خوف کے مارے مجھ سے بولا نہیں جاتا۔

حضرت بابا صاحبؒ نے مجھ سے (حضرت محبوب الٰہیؒ سے) کہا کہ یہ جوگی بڑے دعوے سے آیا تھا، جیسے ہی اس نے سر زمین پر رکھا تو میرے جی میں آیا کہ یہ یوں ہی زمین پر سر رکھے رہے، ایسا ہی ہوا، اس نے کئی بار سر اٹھانے کی کوشش کی، مگر اٹھا نہ سکا، اگر توبہ نہ کرتا تو قیامت تک یوں ہی رہتا۔

پھر حضرت بابا صاحبؒ نے جوگی سے دریافت کیا کہ تم نے کیا کمال حاصل کیا ہے؟ تو اس نے کہا: جوگیوں کے ہاں کمال یہ ہے کہ جوگی ہوا میں اڑنے لگے، آپ نے فرمایا: اچھا تو ہمیں بھی دکھاؤ! جوگی نے ہوا میں پرواز کی تو حضرت بابا صاحبؒ نے اپنی نعلین مبارک کو تیر کی طرح چلتا کیا، اللہ کے حکم سے وہ نعلین جوگی کے سر پر جا پہنچی، جوگی جدھر کا رخ کرتا نعلین اس کے سر پر پڑتی، فوراً اتر آیا، اور کہا کہ جس کی نعلین کا یہ مقام ہے، وہ خود کیسا ہوگا، پھر ایمان لایا اور واصلان حق سے ہوگیا۔ (راحت القلوب ص ۲۷-۲۸)

یہ روایت بہت سے اوصاف درویشی کی جامع ہے، شاذ و نادر ہی ایسی روایات ہیں

تاوقتیکہ اوصاف درویشی سے متعلق بعض مبادیات سے آگاہی نہ ہو، ذہن اس کی اہمیت کو سمجھنے سے قاصر رہتا ہے، اس باب میں صوفیہ کرام کے اسلوب اصلاح کو ذہن نشین رکھنا مقدم ہے، اور اگرچہ یہ موضوع تفصیل طلب ہے مگر تفصیل کا یہ محل نہیں ہے، مختصر طور پر عرض کرتا ہوں کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم وسیع المطالعہ، وسیع المشرب اور نفسیات انسانی سے کمال آگاہی رکھتے تھے، صوفیہ کرام کے طریق اصلاح کے باب میں ان کے مطالعہ کا ماحصل ہے۔

"صوفی ہر ایک کے رنگ طبیعت کو دیکھتا ہے اور جیسی جس کی طبیعت کی افتاد ہوتی ہے، اسی ڈھنگ سے اس کی تربیت کرتا ہے اور اس میں بعض اوقات وہ شریعت سے تجاوز کرنے یا ارکان و اصول کو ترک کرنے میں بھی مضائقہ نہیں کرتا، اس کی نظر انجام پر رہتی ہے ...... اصل صوفی بہت بڑا ماہر نفسیات ہوتا ہے ...... وہ علماء کی نسبت کہیں زیادہ زمانے کی نبض کو پہچانتا ہے اور دلوں کو ٹٹولتا ہے، اور اسی پر بس نہیں کرتا، بلکہ دلوں کی ...... تہ تک پہنچتا ہے، جہاں انسانی کے اصلی اسرار چھپے اور دبے رہتے ہیں جن سے ہم خود بھی اکثر واقف نہیں ہوتے ...... اس میں صوفی کی چیت ہے، اس کے بعد وہ نفس کی [illegible] انسانی بخوش اسلوبی اور لطف سے پکڑتا ہے اور ان کی اصلاح کرتا ہے کہ بعض اوقات مرید کو خبر بھی نہیں ہوتی۔" (اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیۂ کرام کا کام ص ۲۰)

یہ تو اسلوب اصلاح ہے، اوصاف درویشی سے متعلق بھی جو کچھ عرض کرنا مناسب ہے، وہ کیا جاتا ہے وہ یہ کہ مولانا بدرالدین اسحاق ؒ کی ابتدائی ملاقات کا واقعہ شاہد ہے کہ حضرت باباصاحب ؒ کی مبارک نظر آنے والوں کے قلوب پر رہتی تھی، آپ ان کی طلب سے آگاہ ہوتے اور اس خوبی سے تدارک فرماتے کہ وہ حضرت باباصاحب ؒ کے گرویدہ ہو جاتے تھے، اور ہدایت کی راہ اختیار کر لیتے تھے، امیر خورد کرمانی ؒ نے حضرت باباصاحب ؒ کے اس وصف کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :-

"از ضمیر آیندہ حکایت می کرد و دل از دست می برد"

آنے والے کی دل کی بات بیان فرماتے اور دل کو لبھاتے تھے۔

(سیرالاولیاء ص ۸۲)

حضرت باباصاحبؒ کے اوصاف میں ایک وصف یہ بھی ہے کہ آپ ادنیٰ سی توجہ سے یہ بھی معلوم کر لیتے تھے کہ سبیل کار کیا ہے؟ کس طرح یہ بیل منڈھے چڑھ سکتی ہے، میر شکا[1] اور روغن فروش کی بیوی[2] کے واقعات سے اس وصف کا سراغ ملتا ہے۔ مخدوم نصیرالدین چراغ دہلیؒ نے روغن فروش کی بیوی کا واقعہ بیان فرمانے کے بعد فرمایا:

زہے ولایت حضرت شیخ الاسلام فریدالدین در دلِ خود سیرے کرد کہ غرض او از کجا حاصل شود، ہم چناں فرمود" (خیر المجالس ص ۲۳۸)

حضرت باباصاحبؒ کی ولایت سبحان اللہ! سبحان اللہ! ذرا قلب کی طرف توجہ فرمائی مراقبہ کیا اور جان لیا کہ اس کا مقصد کہاں سے حاصل ہوگا، اور اسی کے مطابق اسے بتا دیا۔

اس روایت کے ضمن میں امیرالمومنین حضرت عمر فاروقؓ کے قبول اسلام کا واقعہ بھی ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ آپ شمشیر برہنہ لے کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کے ارادے سے نکلے تھے مگر توفیق الٰہی رہنما ہوئی، قبول اسلام کا جذبہ مستولی ہوا، آپ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، قدم اندر رکھا ہی تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے، دامن یا گریبان پکڑا، اور نبوت کی رعب دار آواز میں فرمایا: عمر! کیوں آیا ہے؟ کس ارادے سے آیا ہے؟ حضرت عمرؓ نبوت کی پُر رعب آواز سے کانپ گئے اور عاجزی و انکساری سے عرض کیا کہ مسلمان ہونے کے لیے حاضر ہوں۔ فاترالعقل کہے گا کہ یہ کہاں کا اخلاق ہے؟ مگر یہ ہے وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ کا کرشمہ جس سے اصلاحِ حال کی راہیں کھلتی ہیں، صوفیۂ کرام کا وہ اسلوبِ اصلاح جس کی طرف بابائے اردو نے ایماء فرمایا ہے، وہ بھی اسی کا ہلکا سا پرتو ہے۔

حضرت محبوب الٰہیؒ نے آپ بیتی خود بیان فرمائی ہے، جو خوارزم کے سبق کے دوران پیش آئی تھی، (فوائدالفواد ص ۲۶-۲۷) جس کے بعد حضرت باباصاحبؒ نے رازِ سربستہ کا انکشاف ان الفاظ میں فرمایا تھا:

"ایں ہمہ برائے کمالِ حال تو می کردم ... کہ پیر مشاطۂ مرید باشد" (فوائد ص ۲۷)[3]

۱؎ خیر المجالس ص ۱۴۷-۱۴۸۔ ۲؎ ایضاً ص ۲۳۷-۲۳۸ ۳؎ شارحین کے بیان کے مطابق اس عمل سے مقصود یہ تھا کہ قلب کی تہہ میں جو دنیاوی آلودگی پیوستہ ہے، وہ نکل جائے اور قلب صاف ستھرا ہو جائے، یہ بھی طریق اصلاح ہے۔

یہ جو کچھ کیا ہے، تمہاری فلاح و بہبود کے لیے کیا ہے۔ پیر مرید کا ایسا ہی بناؤ سنگار کرتا ہے، جیسے دلہن بنانے والی کسی کو دلہن بناتی ہے۔ اس حکایت میں جوگی کے ساتھ جو کچھ کیا گیا ہے، وہ بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔

الغرض مذکورہ مبادیات کی روشنی میں اس روایت کو اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ حضرت باباصاحبؒ اس وصف سے متصف تھے کہ آنے والے کی قلبی کیفیت آپ پر منعکس ہو جاتی تھی۔ (خیر الاولیا ص ۱۰۰)، جوگی جس دعوی سے آیا تھا، اس سے آپ کو آگاہی تھی۔ آپ ادنیٰ سی توجہ سے یہ بھی جان لیتے تھے کہ سبیل کار کیا ہونی چاہیے (خیر المجالس ۲۳۸)، لہٰذا آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کے واقعہ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے رہنمائی حاصل کی (الفاروق) اور صوفیۂ کرام کے طریقِ کار کو بلاخوف لومۃ لائم اپنایا۔ دل میں یہ خیال گزرا کہ جوگی زمین سے سر نہ اٹھا سکے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، جیسا کہ آپ نے چاہا تھا (خیر المجالس ص ۱۸۲)، اس عمل سے جوگی کے زعمِ باطل کو شکست ہوئی۔ اب جو یبوست قلبی رہ گئی تھی، اسے عملِ نعلین سے رفع فرمایا، جس طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر نبوت کے پُر رعب لہجے میں کلام فرمایا تھا، جس سے حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر تھرتھرا اٹھے تھے۔ نہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اخلاق و شریعت کے منافی تھا اور نہ حضرت باباصاحبؒ کا عملِ نعلین، بلکہ صوفیۂ کرام کے اسلوب [illegible] اور بالخصوص وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ کے عین مطابق تھا۔ اگر اس پر کسی کو کلام ہے تو وہ رموزِ شریعت و طریقت سے ناواقف اور جاہل ہے۔

بہرحال حضرت باباصاحبؒ کے اس کامیاب طریقِ کار کا ثمرہ یہ ہے کہ جوگی نے راہِ ہدایت اختیار کی اور واصلانِ حق میں سے ہو گیا۔ یہ وسوسہ بھی گمراہ کن ہے کہ جوگی کا ذکر تذکروں میں کیوں نہیں ہے، جن کا مطالعہ وسیع ہے ان کے علم میں ہے کہ کتبِ سیر و تاریخ میں اور کتبِ ملفوظات میں بے شمار واصلانِ حق کے نام ملتے ہیں، مگر تذکرے ان کے باب میں خاموش ہیں۔ تذکروں میں معدودے چند چیدہ چیدہ و منتخب

۱۔ علی مولیٰ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہیں جنھوں نے شیخ جلال الدین تبریزیؒ کی توجہ سے اسلام قبول کیا تھا اور واصلانِ حق کے زمرے میں شامل ہوئے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ کی دستار بندی کی تقریب میں شامل تھے اور ان ہی کو حضرت محبوب الٰہیؒ کے دستار [illegible] کے لیے دستار دی گئی تھی۔ کیا مستند مصنفین ان بزرگ کا تفصیلی حال بتا سکتے ہیں [illegible]

حضرات کا ذکر ہے، خصوصاً ان کا جنھیں عروجِ کمال نصیب ہوا، اور مخلوق کی عظیم خدمات ان سے سرانجام ہوئیں، وہ بھی سیر حاصل نہیں، بلکہ نہایت تشنہ اور مختصر، واصلانِ حق میں سے ہر ایک کے ذکر کی تذکروں میں تلاش و طلب خود، تذکرہ نویسی سے عدم واقفیت کی علامت ہے، جوگی بلاشبہ واصلانِ حق میں تھا، مگر ہر واصلِ حق کا ذکر کسی تذکرہ میں ملنا لازم نہیں، اس اعتبار سے اس روایت کا شمار شاہکاروں میں ہے، جس کی امثلہ کم دستیاب ہو سکتی ہے، اس روایت کے شمول سے راحت القلوب کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔

روایت نمبر ۱۲ | حضرت محبوب الٰہیؒ رقمطراز ہیں کہ ایک جوگی حضرت باباصاحبؒ کی خدمت میں آیا، میں نے اس سے دریافت کیا کہ تمھارا طریقِ کار کیا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اس سے تمھارا مقصود مدعا کیا ہے، جو اصل کار ہے؟ جوگی نے کہا: مجھے اتنا ہی معلوم ہے کہ انسان دو کیفیتوں یا دو عالموں سے مرکب ہے، ایک عالمِ علوی (اوصافِ اعلیٰ) اور دوسرا عالمِ سفلی (اوصافِ ادنیٰ) سر سے ناف تک عالمِ علوی ہے اور ناف سے پیروں تک عالمِ سفلی ہے (یہ نقطۂ نظر ہے) اسی سے اصلاحِ حال کی تدبیر کرتے ہیں، جوگی نے اتنا ہی بتایا تھا کہ حضرت باباصاحبؒ نے فرمایا: ہاں! ایسا ہی ہے جیسا اس نے بیان کیا ہے، لیکن اتنا اور بھی ہے کہ علوی سے متعلق صدق و صفا، اخلاقِ پسندیدہ اور حسنِ معاملہ ہے، اور عالمِ سفلی سے متعلق پاکی و پارسائی اور پرہیزگاری کی نگہداشت ہے، حضرت باباصاحبؒ نے آبدیدہ ہو کر یہ بھی فرمایا کہ مجھے جوگی کی یہ بات بہت اچھی لگی۔ (راحت القلوب ص ۳۹)

(۱) روایت میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے، البتہ یہ روایت خواجہ حسن علا سجزیؒ نے بھی نقل کی ہے، جو محض قوتِ حافظہ سے کام لیتے تھے، غالباً انھیں سہو ہوا ہے اور انھوں نے حضرت باباصاحبؒ کے ارشاد کو کچھ اس طرح ترتیب دیا ہے کہ وہ جوگی کا بیان لگنے لگا ہے، سہو و خطا تو انسان کی فطرت میں ہے: الانسان مرکب من الخطاء والنسیان، خواجہ امیر حسن علا سجزیؒ نے اس طرح نقل فرمایا ہے:

"در نفسِ آدمی دو عالم است یکے عالمِ علوی، دوم عالمِ سفلی، از سر تا ناف عالمِ علوی است و از ناف تا قدم عالمِ سفلی است، سبیل کار آنست کہ در عالمِ علوی ہمہ صدق و صفا و اخلاقِ خوب و حسنِ معاملہ باشد، و در عالمِ سفلی نگاہ داشت پاکی و پارسائی، خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر بریں لفظ مبارک راند کہ مرا ایں سخن او خوش آمد۔" (فوائد الفواد ص ۸۵)

یہ حقیقت ہے کہ حضرت محبوب الٰہیؒ حضرت باباصاحبؒ کے ارشاد کو ہرگز جوگی کی طرف منسوب نہیں فرما سکتے تھے، اور نہ اپنے سے۔ بیان خود منھ سے بول رہا ہے کہ وہ کسی برگزیدہ اور جہاں دیدہ بزرگ ہی کا ہو سکتا ہے، کسی نوخیز و نوعمر کا نہیں ہو سکتا، بتانا مقصود یہ تھا کہ اس راہ سے مسلمان درویش بھی آگاہ ہیں کہ بلکہ ان کے نکات و جزئیات سے واقف ہیں، انھیں تم نا آشنا نہ سمجھو، کسی طالب کے سوال کا منشا یہ نہیں ہے کہ اس کے رہبر و رہنما اس سے آگاہ نہیں کہ تمھارے ہاں اصل کار کیا ہے اور تم کس راہ پر گامزن ہو، غالباً جوگی کو اشتباہ لاحق ہوا تھا جس کی تصحیح کے لیے حضرت باباصاحبؒ نے یہ رہنما اختیار کی تھی، بیان کی ایسی نزاکتیں عام نہیں ہیں، اس لیے ہر کسی ذہن کی رسائی ان تک نہیں ہوتی، یہ کلیہ ہے، بعض چیزیں فی نفسہٖ اچھی اور پسندیدہ ہوتی ہیں لیکن جب وہ اپنے سے بہتر کے مقابلے میں آتی ہیں تو ان کی آب و تاب وہ نہیں رہتی جو انفرادی حالت میں محسوس کی جاتی ہے، اونٹ جب پہاڑ تلے آتا ہے تو اس کی بلند قامتی کی چہرہ سے نقاب اٹھ جاتا ہے، فوائد الفواد فی نفسہٖ بہت خوب ہے مگر جب راحت القلوب کے مقابلے میں آئے گی جو حضرت باباصاحبؒ کے ارشادات پر مشتمل اور حضرت محبوب الٰہیؒ کے افادات عالی کا ثمرہ ہے تو اس کی آب و تاب ماند پڑ جائے گی جو انفرادی حالت میں ہو سکتی ہے، البتہ احساس کے لیے وجدان صحیح اور ذوق سلیم کا وصف اور تمیز ادب و زبان سے کامل آگاہی درکار ہے۔

اسے کرامت سے تعبیر کیا جائے یا نہیں، مگر راحت القلوب کا یہ حیرت انگیز وصف ہے کہ دیرینہ روزی کے اثرات سے سخت متاثر اور اوراق منتشرہ کا مجموعہ ہونے کے باوجود اسے ندرتِ بیان اور تدوین روایات کے اعتبار سے ما... کتب ملفوظات پر بہمہ وجوہ فوقیت ہے، جو مجازنہ سے واضح ہے۔

راحت القلوب کی اس مجلس کے شرکا میں سے شیخ بدرالدین غزنویؒ بھی ہیں، یہ قطب الاسلام حضرت خواجہ قطب الدین بختیار اوشیؒ کے خلیفہ اور حضرت باباصاحبؒ کے ہم خرقہ اور ہم عصر تھے، شیخ بدرالدین غزنویؒ نماز درازی عمر کی بھی پڑھا کرتے تھے، انھوں نے نہایت طویل عمر پائی تھی، حضرت محبوب الٰہیؒ سے ملاقات بھی ثابت ہے، امیر خورد کرمانیؒ نے لکھا ہے:

"حضرت سلطان المشائخ می فرمود کہ شیخ بدرالدین بسیار معمر شدہ بود... و می فرمود کہ وقتے شیخ بدرالدین غزنوی مرا گفت بیا من ترا اجازت نامہ سماع نویسم، من گفتم مرا ایں مقدار قابلیت نیست، الخ" (سیر الاولیا، ص ۵۰۵ پ ح)

امیر خورد کرمانیؒ نے شیخ بدرالدین غزنویؒ سے حضرت محبوب الٰہیؒ کی ملاقات کے کئی واقعات اور بھی نقل کیے ہیں؛ (سیرالاولیاء ص ۲۰۷۔۱۹۶ پر) اور اگرچہ ان کا خواجۂ بزرگ خواجہ معین الدین سجزیؒ کے عصرِ حیات میں ہونا یقینی ہے، تاہم ان کا شمار طبقۂ اولیٰ میں نہیں، بلکہ ان کا شمار حضرت باباصاحبؒ کے معاصرین میں ہے اور اگرچہ حضرت باباصاحبؒ کو خواجۂ بزرگؒ سے شرف ملاقات حاصل تھا، لیکن طبقۂ اولیٰ میں آپ کا بھی شمار نہیں کیا جا سکتا، اس لیے شیخ بدرالدین غزنوی کو طبقۂ اولیٰ میں سمجھنا صحیح نہیں ہے، اور ان کی شرکت حضرت باباصاحبؒ کی مجالس میں صحیح اور بالکل صحیح ہے، اس میں ذرا بھی شبہ کی گنجائش نہیں ہے، بہرحال راحت القلوب مستند ہے، اس کی قدامت ثابت ہے، اور اس کی روایات مصدقہ ہیں۔

روایت نمبر ۱۳ حضرت محبوب الٰہیؒ فرماتے ہیں کہ چھ یا سات درویش حضرت باباصاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، وہ نوجوان و نوعمر اور صاحب نعمت تھے، شاید ان کا تعلق خانوادۂ خواجگان چشت سے تھا، انھوں نے حضرت باباصاحبؒ سے عرض کیا کہ ہم میں سے ہر ایک کی کچھ سرگزشت ہے، آپ کسی دوست کو حکم فرمائیں تاکہ وہ ہماری سرگزشت سن لے، حضرت باباصاحبؒ نے مجھ سے فرمایا کہ تم جاؤ اور ان کی سرگزشت سنو اور مولانا بدرالدین اسحاقؒ سے بھی فرمایا، مختصر یہ کہ وہ ایک دوسرے سے نہایت نرمی اور مہربانی سے گفتگو کرنے لگے اس طرح کہ اس دن آپ نے فرمایا تھا اور میں نے یہ عرض کیا تھا، انھوں نے باہم اس طرح گفتگو کی کہ۔۔۔ ہم دونوں لطف تقریر سے ایسے متاثر ہوئے کہ رہ نے لگے، اور دل ہی دل میں کہنے لگے کہ یہ فرشتے ہیں جنھیں اللہ نے ہماری تعلیم کے لیے بھیجا ہے کہ اس طرح ماجرا بیان کرنا چاہیے؛ یہ واقعہ حضرت باباصاحبؒ نے سنا تو آبدیدہ ہوئے اور فرمایا کہ سرگزشت اسی طرح بیان کرنی چاہیے کہ رگ گردن ابھرنے نہ پائے، یعنی غصہ کا اثر کسی لفظ سے یا کسی حرکت سے ظاہر نہ ہو۔ (راحت القلوب ص ۲۹۔۳۰)

یہ روایت صاف و سادہ ہے، بیان میں کوئی ایسی گنجلک نہیں جو تفہیم میں حائل ہو۔ یہ روایت خواجہ امیر حسن علا سجزیؒ نے بھی نقل کی ہے، مگر نقل قول کی تازگی سے محروم سی لگتی ہے، دونوں کے دو دو جملے نقل کیے دیتا ہوں:

فوائد الفواد	راحت القلوب
خداوند آدمی را فرمان دہد تا ماجرائے مارا بشنود۔	(۱) خداوند یارے را فرمان دہد تا ماجرا بشنود۔
اینہا فرشتگان حق اند برائے تعلیم ما آمدہ اند۔	(۲) اینہا فرشتگانِ حق اند برائے تعلیم ما فرستادہ اند۔
(فوائد الفواد ص ۸۶)	(راحت القلوب ص ۳۰)

دیگر امور سے قطع نظر صرف اتنا عرض کر دینا مناسب ہے کہ اگر آدمی را اور آمدہ اند فصیح ہیں تو ظاہر ہے کہ یارے را اور فرستادہ اند فصیح تر ہیں اور ادبی نقطۂ نظر سے جامع راحت القلوب کو قدرتِ بیان اور انتخابِ الفاظ کجا مع فوائد الفواد پر فوقیت ہے اور ادبی نقطۂ نظر سے راحت القلوب کو ترجیح ہے، مارا میں را کو کیا محلِ فصاحت نہیں سمجھا جا سکتا، آمدہ اند میں کو وصف ہے جو فرستادہ اند میں ہے۔

روایت نمبر ۱۳ | حضرت محبوب الٰہی رقمطراز ہیں کہ ایک دن شمس دبیر نسخہ مطول لائے اور پڑھنے کے لیے اجازت چاہی، حضرت بابا صاحبؒ نے فرمایا بیٹھو پڑھو، جس طرح شمس دبیر پڑھتے تھے، حضرت بابا صاحبؒ اسی طرح بار بار معنی بیان فرماتے اور بعض بعض جگہ اشعار میں اصلاح کرتے اور تعریف کرتے جس سے شمس دبیر کا دل خوش ہوتا اور حوصلہ بڑھتا، اسی کے ساتھ حضرت بابا صاحبؒ نے یہ بھی دریافت فرمایا: تمھیں مطلوب کیا ہے کیا چاہتے ہو؟ شمس دبیر نے عرض کیا والدہ ضعیفہ ہیں، میں ہی ان کی خدمت کرتا ہوں، تنگ دست ہوں (لونڈی خریدنے اور رکھنے کی طاقت نہیں) حضرت بابا صاحبؒ نے فرمایا: جاؤ اشکرانہ لاؤ، شمس دبیر گئے، کچھ یگانی جیتل (اس عہد کا معمولی سکہ) لائے جن پر تیر کا نشان تھا، جو پچاس ۵۰ کے لگ بھگ تھے، حضرت بابا صاحبؒ نے تقسیم کرنے کا حکم فرمایا، ہر ایک کو اس کے لائق ملے۔ مجھے آپ نے اپنے دست مبارک سے چار جیتل عنایت فرمائے، پھر حضرت بابا صاحبؒ نے دعائے خیر فرمائی، جس کی برکت سے تنگ دستی جاتی رہی، اور ان ہی ایام میں شمس دبیر سلطان غیاث الدین (بلبن) کے عملے میں منشی مقرر ہو گئے، اور

ان کا کام بن گیا۔ (راحت القلوب ص ۱۳)

یہ صاف اور سادی سی روایت ہے، البتہ اس میں نسخۂ مطول تشریح طلب ہے، جس سے کم علم اشخاص کو غلط فہمی ہوسکتی ہے، نسخہ کہتے ہیں لکھے ہوئے کاغذ کو، اور کاغذ کے اس پرزے یا ٹکڑے کو جس پر اطباء اودیہ لکھ کر دیتے ہیں، لغوی معنی ہیں نوشتہ یا لکھا ہوا، مجازاً کتاب کو بھی نسخہ کہتے ہیں۔

مطول، باب تفعیل سے مفعول ہے، اس کے معنی ہیں طویل کیا ہوا۔ نسخۂ مطول مرکب توصیفی ہے، جس کے معنی ہیں لکھا ہوا بڑا سا کاغذ، اور اس روایت میں غالباً وہ بڑا سا کاغذ ہی مراد ہے جس پر شمس دبیر شعر لکھ کر لائے تھے، حکایت مطول اور شعرے مطول بھی مثل نسخۂ مطول مرکب توصیفی ہے، مرکب اضافی سمجھنا نافہمی اور کم علمی کی علامت ہے۔

مولانا حمید قلندرؒ نے حکایت مطول لکھا ہے[1]، اور خواجہ امیر حسن علاء سنجریؒ نے شعرے مطول[2] ... لکھا ہے، اور قدرے تشریح کے ساتھ لکھا ہے "شعرے آوردہ بود ہم در مدح شیخ شعر مطول" پھر یہ وضاحت نہیں کہ شعرے مطول کا ذخیرہ نوشتہ تھا یا نہیں، مگر نسخۂ مطول میں یہ وضاحت موجود ہے۔

مطول [illegible] علامہ تفتازانی (شافعی و خراسانی المتوفی ۷۹۱ھ) کی کتاب النحو کا نام بھی ہے، مگر نسخۂ مطول سے یہ مفہوم مراد لینا کہ شمس دبیر علامہ تفتازانی کی تصنیف کتاب النحو اٹھا لائے تھے معقولیت سے بعید ہے، مطول تو مطول، مطول کے مصنف بھی اس وقت تک عالم وجود میں نہیں آئے تھے۔ ان کا سنہ وفات ۷۹۲ھ ہے، اور یہ واقعہ ہے ۶۵۵ھ تا ۶۶۹ھ کے درمیان کا، اس زمانہ کے اہل علم اس کتاب کے نام سے بھی واقف نہیں تھے، اس وقت نسخۂ مطول کا مفہوم وہی تھا جو مرکب توصیفی کا ہونا چاہیے، یہ تاویل کہ مطول نحو کی ایک کتاب کا نام ہے اور اس کے مجلس میں پڑھنے کی اجازت طلب کرنے کا کوئی موقع نہیں تھا، اسی وقت مناسب ہوسکتی ہے جب کتاب کا وجود متعین ہو — جب کتاب کا وجود ہی نہیں تو یہ تاویل مبنی بر جہل ہوگی۔

بہر حال اس بحث سے وہ خلفشار رفع ہو جاتا ہے جو کسی کم علم کو لاحق ہوسکتا ہے، اور یہ

---

[1] خیر المجالس ص ۹ - [2] فوائد الفواد ص ۱۲۷-۱۲۸

واضح ہوجاتا ہے کہ شمس دبیر جو مجموعۂ اشعار لائے تھے وہ کثیر تھا خواہ وہ بصورت بیاض تھا ، اور خواہ کسی طویل کاغذ پر نوشتہ تھا ، نیز یہ جملہ کہ "میفرمود اصلاح دربعضی سخنان می نمود" سے اس لایعنی تصور کی نفی ہوجاتی ہے کہ وہ نحو کی کتاب تھی ، کیونکہ عرف عام میں سخن شعر کو اور سخن گو شاعر کو کہتے ہیں۔

یہ ذکر ۶۶۵ھ تا ۶۶۹ھ کا ہے ، تو یہ عہد بلبن ہے ، اسی عہد میں شمس دبیر بلبن کے کسی محکمہ میں منشی کے عہدے پر فائز ہوگئے تھے ، اس عہد میں منشی کو ، کاتب کو ، نویسندہ کو اور انشاپرداز مضمون نگار کو دبیر ہی کہتے تھے ، مگر اسے اتالیق کا مرادف تصور نہیں کیا جاسکتا ، کیونکہ بروئے لغت اتالیق کہتے ہیں استاد کو ، ادب سکھانے والے کو اور تربیت دینے والے کو ، اس لیے ہر دبیر کا اتالیق ہونا یا ہر اتالیق کا دبیر ہونا لازم نہیں۔

حضرت محبوب الٰہیؒ نے یہ نکتہ بھی بیان فرمایا ہے :

مشائخ شعر کم شنوند خاصۃً در مدح	مشائخ شعر نہیں سنتے ، یا کم سنتے ہیں
خویش ، کمالیت شیخ بیں کہ بشنید و	اور خاص طور سے اپنی تعریف میں (تو
استحسان فرمود۔	سنتے ہی نہیں) حضرت باباصاحبؒ کی
(فوائد الفواد ص ، ۱۲)	کمالیت دیکھو کہ آپ نے شعر سنے اور تعریف بھی کی۔

بتانا مقصود یہ ہے کہ کامل الحال بزرگوں میں خودستائی اور خودنمائی کا جذبہ فنا ہوچکا ہوتا ہے ، اگر وہ طالبوں کی رہنمائی کے لیے آپ بیتی بیان کرتے ہیں ، یا اپنی کرامات کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے مدعا ان کا رہنمائی ہوتا ہے ، خوش ستائی اور خودنمائی نہیں ہوتا ، کسی نے خوب کہا ہے ؎

تنقیص سے خفا نہ ستایش پسند تھے ۔ یہ دونوں پستیاں ہیں وہ اتنے بلند تھے

آخر میں یہ عرض کرنا بھی مناسب ہے کہ نقل روایت میں ناقل و کاتب کا سہو بھی ہے ، جو قدیم نسخوں کے مقابلے سے رفع ہوسکتا ہے ، بہر نوع یہ روایت مستند ہے ، اور یہی فوائد الفواد کا ماخذ ہے اور ہونا بھی چاہیے ، کیونکہ راحت القلوب حضرت باباصاحبؒ کے ملفوظات کا مستند مجموعہ ہے ، اور اس کے جامع حضرت محبوب الٰہیؒ ہیں تو راحت القلوب کی روایات کو

حضرت محبوب الٰہیؒ کا بکثرت بیان فرمانا قرین قیاس ہے، بلکہ اس کی بین دلیل ہے کہ راحت القلوب کے جامع حضرت محبوب الٰہیؒ ہیں، اور اس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

روایت نمبر ۵۱ | بزرگان دین میں سے ایک بزرگ پانی پر مصلیٰ بچھائے نماز پڑھ رہے تھے اور یہ بھی کہتے تھے کہ اے اللہ حضرت خضرؑ گناہ کبیرہ کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ انھیں توفیق توبہ عنایت فرمائیے، اتنے میں حضرت خضرؑ بھی تشریف لے آئے اور دریافت کیا کہ میرے بھائی! میں کس گناہ وجرم کا مرتکب ہو رہا ہوں، مجھے بتاؤ تاکہ میں اس سے توبہ کرلوں، انھوں نے فرمایا کہ آپ نے جنگل میں ایک درخت لگایا ہے۔ آپ اس کے سایہ میں بیٹھتے اور آرام کرتے ہیں اور یہ بھی فرماتے ہیں کہ میں نے فی سبیل اللہ لگایا ہے (گویا کہ آپ اپنے آپ کو خدا قرار دیتے ہیں) حضرت خضرؑ نے فوراً ہی توبہ کی۔

پھر ان بزرگ نے ترک دنیا سے متعلق گفتگو فرمائی، اور ترک دنیا کی حقیقت بیان کی، اور کہا: کیا آپ ایسے ہی ہیں؟ پھر آپ کیسے رہتے ہیں؟ پھر فرمایا: میں ایسا ہوں کہ اگر تمام دنیا مجھے دی جائے اور یہ بھی کہا جائے کہ اس کا حساب بھی تم سے نہ لیا جائے گا، اور یہ بھی کہیں کہ اگر قبول نہ کروںگا تو تمھیں دوزخ میں ڈال دیں گے تو میں دوزخ میں پڑنا قبول کرلوںگا، دنیا کو قبول نہ کروں گا، حضرت خضرؑ نے دریافت کیا یہ کیوں؟ انھوں نے بتایا کہ یہ اس لیے کہ دنیا خدا کی مغضوبہ ہے، خداوند عالم اس سے ناراض ہیں، میں بھی اس سے خوش نہیں، لہذا مجھے دوزخ قبول مگر دنیا قبول نہیں۔ (راحت القلوب ص ۳۴-۳۵)

یہ روایت فوائد الفواد (ص ۸۲-۸۳ نولکشوری) میں بھی ہے، اور اسرار الاولیاء (ص ۴۴) میں بھی ہے، اور حق یہ ہے کہ اسرار الاولیا کا بیان فوائد الفواد اور راحت القلوب سے زیادہ سلجھا ہوا ہے، راحت القلوب میں ہے:

"مصلّیٰ بر روئے آب انداختہ بود ونماز می گزارد و می گفت"

فوائد الفواد میں ہے:

"مصلیٰ برروئے آب انداختہ بود و نماز می کرد و می گفت"

جملے دونوں یکساں ہیں، البتہ ایک فعل بدلا ہوا ہے، اور اس میں کچھ مضائقہ نہیں، گویا کہ فوائد الفواد حضرت محبوب الٰہیؒ ہی کی آواز بازگشت ہے، اسرار الاولیاء میں ہے:

مصلیٰ برروئے آب انداختہ نماز می گزارد، چوں از نماز فارغ شد سر بسجدہ نہاد و در مناجات می گفت ......

نماز می گزارد و می گفت اور نماز می کرد و می گفت کے مقابلے میں یہ کہنا کہ چوں از نماز فارغ شد، سر بہ سجدہ نہاد و در مناجات می گفت کہیں افضل ہے، کہ نماز سے فارغ ہونے کے بعد ہی دعا کی جاتی ہے، اور یہی صورت حال زیادہ مناسب ہے، تاہم اس سے یہ واضح ہے کہ فوائد الفواد کا ماخذ راحت القلوب ہی ہے، جس کی قدامت شمائل الاتقیاء و دلائل الاتقیاء (۷۳۸ھ) سے ثابت ہے، اور یہ جہل ہے کہ راحت القلوب میں فوائد الفواد سے روایات منقول ہیں، کیونکہ فوائد الفواد تو اس عہد (۶۵۶ھ تا ۶۶۹ھ) میں وجود ہی میں نہیں آئی تھی، فوائد الفواد کی تالیف کا سنہ آغاز ۷۰۷ھ ہے۔

بہرحال یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہے کہ راحت القلوب حضرت بابا صاحبؒ شیخ شیوخ العالم شیخ کبیر فریدالدین مسعود گنج شکر اجودھنی قدس اللہ سرہ العزیز ہی کے مبارک ملفوظات کا مجموعہ ہے اور اس کے جامع حضرت محبوب الٰہیؒ سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء قدس اللہ سرہ العزیز ہیں، اور تواتر سے اس کی قدامت اور اس کا مستند ہونا ثابت ہے، البتہ اس کی اشد ضرورت ہے کہ صحت و مقابلہ سے مزین کر کے اسے از سر نو منظر عام پر لایا جائے، تاکہ معاشرہ میں سدھار آئے اور نیکی و نکوکاری کا جذبہ فروغ پائے، یہی وقت کا تقاضا ہے، اگر ایسا کیا گیا تو یہ انسانیت کی بہت بڑی خدمت ہو گی، اور رب بے نیاز اجر دے گا، انشاءاللہ تعالیٰ

(۲۰) راحت القلوب کے قدیم قلمی نسخے

راحت القلوب کے قدیم قلمی نسخوں سے متعلق ہندوستان کی مشہور لائبریریوں کی
جو معلومات مجھے فراہم ہوئی ہیں، لائبریریوں کے ان ذمہ دار اصحاب کے شکریہ کے ساتھ
پیش کرتا ہوں جنھوں نے از راہ علم نوازی زحمت گوارا کی اور اس ذرہ بے مقدار کو نوازا۔
مدعا اس سے یہ ہے کہ صحت و مقابلہ سے راحت القلوب کا کوئی نسخہ مرتب ہو سکے، اگر
توفیق الٰہی ساز گار رہی تو میں خود اس خدمت کو انجام دوں گا اور اگر خدائے پاک نے
کسی اور کو یہ توفیق دی تو یہ میرے لیے مزید باعث مسرت ہوگا، میں جو تعاون کر سکتا ہوں
اس میں دریغ نہ کروں گا انشاء اللہ تعالیٰ۔

(۱) سالار جنگ میوزیم حیدرآباد (آندھرا پردیش) میں سنہ ۱۲۸۰ھ کا مکتوبہ ایک نسخہ ہے۔

(۲) مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پانچ نسخے ہیں، ایک سنہ ۱۰۹۰ھ کا مکتوبہ ہے،
دوسرا سنہ ۱۱۹۲ھ کا مکتوبہ ہے، اور تین نسخے ناقص ہیں۔

(۳) ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کلکتہ میں ایک نسخہ ہے جو سنہ ۱۱۸۱ھ کا مکتوبہ ہے، ایک لاگ
جو میرے پاس ہے، وہ کرم خوردہ اور از کار رفتہ ہے، ممکن ہے کوئی اور بھی ہو، میں نے کئی
جوابی خط بھیجے مگر جواب سے محروم رہا۔

(۴) آندھرا پردیش گورنمنٹ اورینٹل مینوسکرپٹس لائبریری اینڈ ریسرچ انسٹیٹیوٹ
حیدرآباد میں تین نسخے ہیں، ایک سنہ ۱۱۸۳ھ کا مکتوبہ ہے، دوسرا سنہ ۱۲۸۰ھ کا اور تیسرا ۵ جلوس عالمگیری
سنہ ۱۱۰۴ھ کا مکتوبہ ہے جو معلومہ نسخوں میں قدیم ترین ہے،

(۵) خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں تین نسخے ہیں، ایک سنہ ۱۲۷۲ھ کا مکتوبہ ہے،
دوسرا بارہویں صدی ہجری کا اور تیسرا تیرہویں صدی ہجری کا۔ سنہ ۱۱۰۰ھ

(۶) عربی فارسی ریسرچ انسٹیٹیوٹ ٹونک (راجستھان) میں ایک نسخہ ہے جس میں سنہ کتابت درج نہیں ہے۔

(۷) رضا لائبریری رام پور میں تین نسخے ہیں، جن میں سنہ کتابت درج نہیں ہے۔

(۸) دار المصنفین (شبلی اکیڈمی) اعظم گڑھ میں ایک نسخہ ہے جس میں سنہ کتابت درج نہیں ہے۔

"مکاتیب حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں دین اسلام کی اشاعت کرنا۔ اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کا اہم ترین ذریعہ ہے اسی لیے اسلام کی سربلندی کے لیے اللہ کے محبوب صلعم نے ہمیشہ اپنی کوششوں کو جاری اور قائم رکھا اور ہر دور میں ضروریاتِ زمانہ کے لحاظ سے طریقۂ کار ساز گار بنتا رہا ہے

چنانچہ اس دور میں دین کی اشاعت و تبلیغ کا طریقہ جو امام التبلیغ حضرتؒ مولانا محمد الیاس نور اللہ مرقدہٗ نے قرآن و حدیث کی روشنی میں بیان فرمایا۔ اور اس کو رواج میں لانے کی کوشش کی۔ وہ عام فہم ہی لیکن اس کو سمجھنے کے لیے مستقل جدوجہد کی ضرورت ہے۔

یہ کتاب حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ان مکتوبات کا مجموعہ ہے جس میں اس کام کے اصول و آداب کو واضح کیا گیا ہے اور اس کام میں کوتاہیوں اور غلطیوں سے بچنے کی تدابیر بتائی گئی ہیں۔ دینی دعوت کے کام میں مشغول ہونے والے حضرات کے لیے اس کا مطالعہ ضروری ہے۔ یہ خطوط دینی معلومات اور معارف روحانی کا سرچشمہ ہیں۔
قیمت -/۵

اسلام تلوار سے نہیں پھیلا (غیر مسلموں کی شہادتیں)

دین اسلام کے بارے میں نہایت غلط طور پر مثلاً اسلام زبردستی اور تلوار کے زور سے پھیلا ہے اس الزام کا معقول و مناسب جواب غیر مسلم حضرات نے دیا ہے۔ یہ کتاب انہی بیانات کا مجموعہ ہے۔ دینی معلومات کا بہترین ذخیرہ ہے۔ قیمت ۲/۵۰

سوانح
حضرت محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء قدس اللہ سرہ العزیز کے اصلی اور سچے حالات زندگی نہایت تحقیق و تلاش سے اس کتاب میں جمع کیے گئے ہیں اور اس خوبی سے مرتب کیے ہیں کہ حضرت کی زندگی کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اور پڑھنے والا دل و جان سے حضرت کی پیروی کرنے کے لیے آمادہ ہوجاتا ہے۔ اس کتاب میں روحانی ترقیات کے راستے اور حضرت کے فرمودہ پُر تاثیر عملیات بھی جمع کر دیے ہیں۔ اس کتاب کے مصنف دلی کے مشہور اہل قلم علامہ اخلاق حسین دہلوی ہیں جن کی ادبی و تحقیقی کتابیں جامعہ اردو علی گڑھ، جامعہ ملیہ دہلی، پنجاب و بہار اور کشمیر یونیورسٹی کے نصاب میں داخل ہیں۔ بہت سی خوبیوں کی بنا پر حضرت محبوب الٰہیؒ کی اس شان کی سوانح حیات لکھی ہے کہ سیر الاولیاء کے بعد آج تک ایسی سوانح حیات لکھی نہیں گئی۔ جو کچھ لکھا ہے مستند کتابوں کے حوالے سے لکھا ہے اور حوالہ جات حاشیہ میں لکھ دیے ہیں۔ بیان نہایت شگفتہ و سلیس اور بامحاورہ ہے جو دل میں اترتا چلا جاتا ہے۔ زبان دلی کی نتھری نتھرائی صاف ستھری اور ٹکسالی ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے حضرت محبوب الٰہیؒ کی اس کرامت کا مشاہدہ بھی ہوا ہے کہ اگر کسی بیمار نے اسے پڑھا ہے یا سنا ہے تو وہ تندرست ہوگیا ہے۔ پہلا اڈیشن ہاتوں ہاتھ ختم ہوگیا اب دوسرا اڈیشن آفسیٹ پر شائع کیا جارہا ہے۔